بنک انٹرسٹ اور ہندوستان کی شرعی حیثیت

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے دوسرے سمینار مؤرخہ ۸ تا ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء منعقدہ جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں پیش کئے جانے والے علمی و تحقیقی مقالات، مباحثات اور مناقشات کا مجموعہ]

ترتیب

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

ایفا پبلیکیشنز - نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	بینک انٹرسٹ اور ہندوستان کی شرعی حیثیت
ترتیب	:	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
صفحات	:	۴۱۰
قیمت	:	
سن طباعت	:	فروری ۲۰۱۴ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

ای میل : ifapublication@gmail.com

فون : 011 - 26981327

مجلس ادارت

۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی

۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۳- مولانا بدر الحسن قاسمی

۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵- مولانا عتیق احمد بستوی

۶- مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

پہلا باب: تمہیدی امور

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
عرض داعی	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
خطبہ افتتاحیہ	ڈاکٹر جمال الدین عطیہ
خطبہ صدارت	مولانا محمد رفیع عثمانی

دوسرا باب: بینک انٹرسٹ وسودی لین دین

اکیڈمی کا فیصلہ

بینک انٹرسٹ وسودی لین دین کے بارے میں	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
سوالات	
ضمیمہ سوالات	
ربوا درحقیقت کیا ہے	بروی جماری مہتر
بنک انٹرسٹ، سودی قرض اور رہن وستان کی شرعی حیثیت	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
موجودہ سودی بینکنگ نظام اور معاشی مسائل کا حل	مفتی حبیب الرحمن خیرآبادی
دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت	مولانا اعجاز احمد اعظمی
مسئلہ سود	مولانا شمس پیرزادہؒ

مسئلہ ربوا	مولانا زبیر احمد قاسمی
سود کا مسئلہ	مولانا خلیل الرحمن عمری
بنک انٹرسٹ	مولانا محمد رضوان القاسمیؒ
سود کی شرعی حیثیت	مفتی عزیز الرحمن بجنوریؒ
ربوا کی حقیقت	مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری
سود کا مسئلہ	مفتی جمیل احمد نذیری
ربوا کی تعریف اور اس کے احکام ومسائل	مولانا ابوالحسن علی
مسئلہ ربوا	مولانا آدم پالنپوری
سود کا مسئلہ	مولانا جنید عالم ندوی قاسمی
سود کا مسئلہ	ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی
مسائل ربوا	مولانا محمد ایوب ندوی
مسائل ربوا	حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ
ربوا کی شرعی حقیقت	مولانا محمد عبید اللہ اسعدی
سودی کاروبار کا عموم	مفتی حبیب اللہ قاسمی
سودی معاملات شریعت کی نظر میں	مفتی نسیم احمد قاسمیؒ
سود کی حقیقت شرعی	مولانا عبید اللہ کوٹی
سود کا مسئلہ	مولانا محفوظ الرحمن قاسمی
ربوا کی شرعی حقیقت	مولانا محمد زید مظاہری ندوی
ہندوستان میں سود کا مسئلہ	مولانا مطیع الرحمن رضوی
ربوا کی حقیقت	مولانا عبد الرحیم قاسمی

مناقشہ

فہرست شرکاء سمینار

☆☆☆

پہلا باب

تمہیدی امور

پیش لفظ

دولت بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کے سلسلہ میں انسان دو باتیں چاہتا ہے: ایک اس کی حفاظت، دوسرے اس کو اس طرح مشغول کرنا کہ وہ نفع آور ہو سکے۔ بینک یہ دونوں کام کرتا ہے، لیکن وہ اپنے پیسے براہ راست تجارت میں نہیں لگاتا، بلکہ ایک متعین نفع پر لگاتا ہے اور رقم جمع کرنے والوں کو بھی متعین نفع دیتا ہے، نیز جو لوگ رقم جمع کرتے ہیں، ان پر امکانی نقصان کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھتا۔ یہ وہ بات ہے جو اسلام کے اصول سرمایہ کاری کے بالکل مخالف ہے، اسلام میں وہی سرمایہ کاری جائز ہے جس میں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کے خطرہ کو بھی قبول کیا جائے، البتہ ہندوستان میں بعض حضرات اس مسئلہ کو ایک خاص پس منظر میں دیکھتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ حربیوں سے جو مال حاصل ہو، اس پر سود کا اطلاق ہی نہیں ہوتا، اب یہ بات قابل غور ہے کہ کیا ہندوستان موجودہ جمہوری نظام کے ساتھ دار الحرب ہے؟

اس مجموعہ میں ان اہم سوالات کا جواب ہے، مقالات میں مختلف رائیں مذکور ہیں، لیکن سمینار نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ہی اکیڈمی کا اصل نقطہ نظر ہے، راقم الحروف عزیز گرامی مفتی محمد سراج الدین قاسمی (رفیق شعبہ علمی) کا شکر گذار ہے کہ انہوں نے اس مجموعہ کی پروف ریڈنگ کی اور اس کو ایڈیٹ کیا۔ یہ مجموعہ پہلی دفعہ بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی زندگی میں ہی شائع ہوا تھا، دوبارہ نئی ترتیب کے

ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آرہی ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی اس علمی خدمت کو قبول فرمائے اور ہم سب کو صواب وسداد پر قائم رکھے، وباللہ التوفیق وہو المستعان۔

۸ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ — (خالد سیف اللہ رحمانی)

۱۳ر نومبر ۲۰۱۳ء — جنرل سکریٹری

ابتدائیہ

کتابت وطباعت کی مشکلات پر بمشکل قابو پانے کے بعد ہم دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ نئی دہلی، مورخہ ۸؍تا۱۱؍دسمبر ۱۹۸۹ء کی روداد اصحاب علم کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہوسکے۔ پہلے فقہی سیمینار کی روداد ''بحث ونظر'' نی نی کے خصوصی شمارہ کی حیثیت سے پیش کی گئی تھی، لیکن اس بار گراں کو ''بحث ونظر'' نی برداشت نہیں کرسکا۔ اس لئے طے پایا کہ اب براہِ راست اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے مجلہ فقہ اسلامی کے نام سے اسے شائع کیا جائے۔

دو نئے اہم موضوعات پر زبردست علمی اور تحقیقی مقالات کا یہ مجموعہ ہمارے فقہی ذخیرہ میں ایک اضافہ ہے، جس سے علماء، فضلا، دانشور، طلبہ اور ریسرچ اسکالرز استفادہ کرسکیں گے۔

تیسرا فقہی سیمینار ۸؍تا۱۱؍جون ۱۹۹۰ء کو بنگلور میں منعقد ہورہا ہے۔ ان شاء اللہ اس کی روداد بھی مجلہ فقہ اسلامی کے نام سے شائع کی جائے گی۔

ان اہم علمی کاموں میں جو ذہنی محنت اور وقت خرچ ہوتا ہے اس سے اہل نظر واقف ہیں، ساتھ ہی ساتھ زبردست مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ مالی تعاون کیا جائے۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ مجلہ خریدا جائے، تاکہ ہم اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لائق ہوسکیں۔

اللہ سے دعا کریں کہ یہ عمل مقبول وپائدار اور مفید ہو۔

قاضی مجاہد الاسلام القاسمی

سکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

۳؍جون ۱۹۹۰ء

خطبۂ استقبالیہ

ڈاکٹر محمد منظور عالم

محترم حضرات علماء!

مجھے آپ کو دوسری بار خوش آمدید کہتے ہوئے اتنی مسرت ہو رہی ہے کہ الفاظ کے پیکر اسے ادا نہیں کر سکتے۔ خوشی کے جذبات سے سرشار ہوں، اور ہم لوگ اسی مبارک موقع و مناسبت سے دوسری بار یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اسی ہال میں پگڑی و پیوندکاری وضبط تولید کے مسائل پر غور وفکر کے لئے جمع ہو چکے ہیں، اس موقع پر جس وسعت نظری وتوسع اور تحمل وتدبر سے آپ حضرات نے قابل بحث نکات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی وہ ہر پہلو سے قابلِ تحسین وقابلِ ستائش ہے۔

اور اس بار بھی ہندوستان میں سودی لین دین اور سودی قرضے اور نوٹ کی شرعی حیثیت کے مسائل پر علمی توجہ دینے کے لئے یہ مبارک اجتماع منعقد ہوا ہے۔

یہ بڑی سعادت وفضل کی بات ہے کہ آپ دینی احکام کی تطبیق اور ملکی حالات و ضروریات کے تناظر میں غور وفکر کے لئے مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) کی دعوت پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس سے بڑی خوش بختی کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ جیسے جلیل القدر علماء وصاحب نظر اصحاب افتاء اور فقہاء میں اس خالص فقہی وعلمی مجلس کے انعقاد وشرکت ومثبت رخ پر اسے لے جانے کی آمادگی پیدا فرمائی۔

خداوند آپ کی نیک تمناؤں کو شرمندۂ تعبیر اور مثبت کوششوں کو کامرانی سے ہم کنار

کرے۔

اس ملک کے مسلمانوں کو آپ کی علمی رہنمائی اور قیادت کی ضرورت ہے۔ گذشتہ دنوں ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ انسانیت کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ دوسری طرف مختلف نوع کی عصبیتوں، جارحانہ طبقاتی، علاقائی، ولسانی کشمکشوں، مذہبی وثقافتی منافرتوں نے، مسائل کی سنگینی اور اس کی شدت نے جو حالات پیدا کردیئے ہیں ان سے مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہوگیا ہے، اس پر گہری تشویش ہے، اور افسوس بھی، ان حالات میں آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ ملت کے سماجی، اقتصادی، ثقافتی، فلاح و بہبود، بقاء وتحفظ کے متعلق بھی غور وفکر کریں، کہ یہ وقت کا تقاضا ہے۔

ملک کا بگڑتا ہوا اقتصادی ڈھانچہ، قرضوں کا بوجھ، غربت وافلاس، معاشی بدحالی کے ہولناک اثرات، مسلمانوں پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہو رہے ہیں، لیکن منظم سازشی منصوبوں کے ذریعہ ان کے تجارتی مراکز ختم کرنے، اور ان کی صنعت وحرفت کو نقصان پہنچانے کا سلسلہ زیادہ خطرناک اور اقتصادی دیوالیہ کی واضح نشانی ہے۔

جان و مال کا نقصان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو جدید معاشی نظام کے زاویئے سے دیکھنے کی ضروت ہے۔

محترم فقہاء!

دوسرا اہم یا قابلِ توجہ مسئلہ ملت اور خود ملی کام کرنے والوں کے درمیان باہمی اتحاد کا فقدان ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو باہمی انتشار وافتراق سے بچانے اور ان میں اتحاد واتفاق کی روح پھونکنے میں آپ تاریخ میں بڑا کردار ادا کرتے رہے ہیں، اور ایک بار پھر ایک نئے انداز سے جدوجہد کی ضرورت آپڑی ہے۔ اتحاد اور باہم اشتراک وتعاون طاقت وقوت میں تاثیر کے لئے بنیادی شرط ہے۔ اتحاد کی راہیں ہموار کرنا اور متنوع جہتوں میں فکری وعملی سطح پر دوریوں کے خاتمہ کے لئے ایثار وقربانی وعمل کے ساتھ تبادلۂ خیال کے ذریعہ آگے بڑھنے کی

اشد ضرورت ہے۔

محترم علماء!

ملک کے اقتصادی وسماجی ڈھانچہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی جدو جہد کی راہ میں بڑی روکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں، تاجروں، صنعت کاروں کے لئے ہر سطح پر مجبوریاں ہیں، خواہ وہ برضا ورغبت ہو یا بجبر واکراہ، سرمایہ کاری میں مختلف قسم کے ٹیکسوں سے بچاؤ کے لئے بے شمار نامناسب طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں، جس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، اور مسلم تاجر وصنعت کاروں میں صنعتی ومعاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا احساس فزوں تر ہوتا جارہا ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی (IFA) کا اقتصادی مسائل پر فقہی نقطہ نظر سے غور وفکر کرنا ایک مسرت افزا اقدام ہے، جس سے ہندوستانی مسلمانوں اور اہل فکر ونظر میں انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی ہے، اور آپ حضرات علماء سے ملت بہت پرامید ہے۔

آئی۔او۔ایس اپنے وسیع ومختلف النوع مقاصد کے مطابق علمی وتحقیقاتی کاموں سے زیادہ دلچسپی وتعلق رکھتا ہے اور ابتدا ہی سے وہ سماجی علوم، تاریخ، معاشیات، سماجیات نیز سماجی وتعلیمی مسائل وغیرہ پر سنجیدہ وٹھوس اقدامات کرتا رہا ہے۔ اس اعتبار سے وہ تمام مسائل جن کو اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) (IFA) آئندہ غور وفکر کا موضوع قرار دے گی۔ الحمدللہ آئی، او، ایس ان پر گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرتی رہی ہے۔ اور اسے ماہرین کا تعاون بھی حاصل ہے، ادارہ ایسے تمام منصوبوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ ان میں تعاون دینا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہے۔ آئی او ایس کی یہ تمنا ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ میں اور اس کی قیادت کرنے والے علماء میں زیادہ سے زیادہ اتحاد واتفاق رونما ہو، اس سے مشترکہ جدو جہد اور منصوبہ بندی نیز دینی رہنمائی میں آسانی ہی نہیں تاثیری روح بھی پیدا ہوگی۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے تمام مکاتب فکر کے صاحب نظر فقہاء وعلماء اس نوتشکیل شدہ ادارہ (IFA) کے تحت قدم سے قدم ملا کر تاریخ ساز کردار ادا کریں گے۔ اللہ کرے یہ علمی

کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔

☆ سابق سکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

☆ سابق قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، پھلواری شریف پٹنہ

عرض داعی

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ ☆

حضرات! ہندوستان کی علمی، تحقیقی اور فقہی تاریخ میں ۱۹۸۹ء کے اپریل کی پہلی، دوسری اور تیسری تاریخیں یاد رکھی جائیں گی جب کہ اسی نظر افروز اور فرحت بخش مقام پر کثیر تعداد میں ہمارے بزرگ اور اکابر دین وملت، ممتاز علماء، بالغ نظر فقہاء واہل افتاء، حوصلہ منداور باصلاحیت نوجوان فضلاء، اور دین دوست وعلماء نواز دانشور ومفکرین ایک خاص جذبہ وولولہ اور ذوق وشوق کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے سے کھینچ کر جمع ہوئے تھے۔ ان کے جمع ہونے میں خلوص تھااور جماعتی، مسلکی اورہم عصری کی بنیادوں پر اٹھنے والی کوئی دیوار حائل نہیں تھی، جو اس دور میں بہرحال نیک فال اورقابل ذکر چیز ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقت گذرنے کے لئے ہےاوروہ دبے پاؤں گذرہی جاتا ہےمگراپنے ساتھ خوش گوار یادوں کاایک تسلسل چھوڑ جاتاہے،ہم سب کے لئے یہ بات حددرجہ مسرت کی ہے کہ اس گذرے ہوئے وقت نے ہمارے لئے یادوں کا جوسلسلہ چھوڑا ہے وہ نہایت خوشگوار ہے، اس وقت کی علمی چھل پہل اور تحقیقی سرگرمیاں یقینا ہماری طرح آپ کی نظروں میں بھی ہوں گی۔اس یادِمجلس رفتہ کے ساتھ اقبال کایہ معنی خیزشعر بھی یاد آیاہے ؂

یادِعہدرفتہ میری خاک کواکسیر ہے
میراماضی، میرے استقبال کی تفسیر ہے

پہلا فقہی سیمینار (جس کی یاد ابھی تازہ کی گئی) کے بعد آج ہم جب آپ کو دوسرے فقہی سمینار میں اسی مقام پر اسی جذبہ وحوصلہ کے ساتھ اپنے درمیان پا رہے ہیں تو حقیقی معنوں میں خوشی ''دو بالا'' نی ہو رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس چمکتی، دمکتی، دل لبھاتی دنیا میں تسکین کے بہت سارے سہارے اور جاذبیت وکشش کی ہزار ہا چیزیں ہیں۔ مگر میرے خیال میں کسی صاحب علم وتحقیق کے لئے کسی علمی مسئلہ کی تلاش وجستجو میں جو لطف ومزہ اور کشش وجاذبیت ہے۔ وہ دنیا کی کسی چیز میں نہیں۔

ملک اور بیرون ملک کے مختلف گوشوں اور اداروں سے سفر کی دقتوں اور کلفتوں کو اٹھاتے ہوئے آنے والے رہ روان علم وتحقیق اور اصحاب فقہ وافتاء کی خدمت میں ہم ان الفاظ کے ساتھ ہدیہ سپاس وتشکر پیش کرتے ہیں، اور دل کی پوری گہرائی کے ساتھ اس تاریخی شہر کے اس علمی ماحول اور تحقیقی فضا میں ان کا استقبال کرتے ہوئے خوش آمدید کہتے ہیں ؎

اے آمدنت باعث خوش بختیٔ ما

محترم علماء وفضلاء!

اس حقیقت کو آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ جس دین متین سے ہماری اور آپ کی وابستگی ہے، وہ زمان ومکان کی حد بندیوں سے بالاتر، دائمی، ابدی اور آفاقی ہے، اسے دربار خداوندی سے ''**رضيت لكم الإسلام دينا**'' کا پروانہ عطا کیا جا چکا ہے، اور اس کے ساتھ یہ انتباہ بھی دیا گیا ہے کہ ''**ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه**'' اس دین فطرت کی بنیادی کتاب ''قرآن حکیم نی نی ہے۔ جسے خالق انسان وکائنات نے اپنے آخری نبی محمد ﷺ پر انسانی ہدایت کے لئے نازل فرمایا۔ آپ ﷺ کا ۲۳ سالہ شاندار دور نبوت اسی آخری دین کی دعوت اور اس کی تشریح وتوضیح، اور کتاب ہدایت (قرآن) کی تفسیر وتبیین میں گذرا۔ ہم اور آپ جسے ''حدیث نی نی کہتے ہیں وہ آپ ﷺ کے ہی اقوال، افعال اور احوال کا مجموعہ ہے۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے آپ سے براہ راست فیض حاصل کیا اور منشاء نبوت اور مزاج

شریعت کو خوب جانا اور سمجھا۔ ان کو دین کی حقیقت اور علم کی روح اور اس کا مغز حاصل تھا۔ اس لئے وہ اپنے دین وعلم دین کی خصوصیات میں قیامت تک ممتاز ہیں۔ ان کے اس امتیاز کے لئے سیدنا حضرت عبد اللہ بن مسعود کے الفاظ سے زیادہ گہرے اور سچے الفاظ نہیں مل سکتے۔ ان الفاظ میں علماء برادری کے لئے بھی اہم سبق اور پیغام ہے، فرماتے ہیں۔

"أولئک أصحاب محمد صلی اللہ علیه وسلم أبر الناس قلوبا و أعمقهم علما و أقلهم تکلفا"۔

(صحابہ (رضی اللہ عنہم) لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سچے۔ علم کے گہرے اور تکلف سے دور تھے)۔

قرآن کی آیات، احادیث کا ذخیرہ اور صحابہ کرام کے آثار۔ دین اسلام کو سمجھنے کے لئے بنیادی ماخذ اور مصادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر اخیار امت کا اجماع ہے۔ راسخین فی العلم کا قیاس ہے۔ ائمہ کبار اور علماء و اسلاف کا اپنے زمانے اور حالات کے اعتبار سے مسائل کا استخراج و استنباط ہے۔ جس کی مفصل اور وقیع تاریخ ایسی مثال ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے موجودہ مذاہب میں سے کسی مذہب میں نہیں مل سکتی، ایسی تاریخ اور ایسا ریکارڈ رکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی دور اور کسی زمانہ کے علماء دین اپنے دور اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کی حقیقی تکمیل، اور پیش آمدہ مسائل کے صحیح حل میں ہمت ہار جائیں۔ غفلت کی چادر اوڑھ کر سو جائیں اور جمود ان پر طاری ہو جائے؟ جب پچھلے دور میں ایسا نہیں ہوا (اور کسی ابدی دین کے ساتھ ایسا معاملہ پیش بھی نہیں آسکتا) اور ہر زمانہ کے علماء اپنے زمانے کے حالات اور مسائل سے واقف ہو کر رہبری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے تو اس زمانے کے علماء کو بھی اپنے زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہونا پڑے گا اور آج کی سائنسی ایجادات، طبی تحقیقات، معاشی ترقیات، مختلف سماجی وجغرافیائی حالات، حمل ونقل کے جدید ذرائع اور ترسیل وابلاغ کے آلات نے نت نئے فقہی وشرعی مسائل جو پیدا کئے ہیں ان کا حل پیش کرنا ہوگا۔ حساس علماء نے اپنے وقت کے

علماء کی توجہ اس طرف ہمیشہ مبذول کرائی ہے۔ نابغۂ روزگار عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر جب پاکستان سے ہندوستان تشریف لائے تو بار بار فرماتے کہ:

”اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں، اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ کرنا چاہئے نی نی (مطالعہ سلیمانی / ۱۳۸)۔

خوشی کی بات ہے کہ عالم اسلام کے علماء فقہاء اس طرف متوجہ ہیں، اور مختلف ممالک میں فقہی اکیڈمیاں قائم ہیں، جہاں مختلف انداز سے ان مسائل پر کام ہو رہا ہے۔ ماضی قریب کے ہندوستانی علماء میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اس سلسلہ میں جو کوششیں کی ہیں وہ نہ صرف لائق تحسین بلکہ قابلِ تقلید بھی ہیں اور ان کے کام کو آگے بڑھانا اور پھر اس طرح کے کام کو باہم مربوط کرنا اور مسلک ومشرب اور تنظیم وادارہ کے اختلاف سے بالاتر ہو کر فریق کے بجائے ”رفیق نی نی کے احساس کے ساتھ اجتماعی شکل میں ان مسائل پر غور کرنا بلاشبہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

آج سے چند سال پیشتر ”مرکز البحث العلمی نی نی کا قیام جو عمل میں آیا، اس میں در اصل یہی احساس اور جذبہ کارفرما تھا کہ ہندوستان جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ایک خاص نظام اور دستور کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں، جس کی وجہ سے سماجی، معاشرتی اور معاشی سطح پر یہاں جو بعض نئے مسائل مسلمانوں کے لئے پیدا ہو رہے ہیں، وہ بالکل الگ نوعیت کے ہیں اور ان مسائل سے دوسرے ممالک اور خطوں میں رہنے والے مسلمان دوچار نہیں ہیں۔ گویا ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص حالات نے ان کے لئے ہندوستان میں بعض مخصوص فقہی مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن پر غور وخوض کر کے مناسب حل یہاں کے علماء وفقہاء کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

ان جذبات اور احساسات کے پس منظر میں ”مرکز البحث العلمی نی نی کے تحت پہلے

ایک علمی، فقہی، تحقیقی اور دستاویزی نوعیت کا مجلہ ''بحث ونظر'' کے نام سے نکالنا شروع کیا گیا، جسے اہل علم وتحقیق نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔

اس رسالہ سے جب حوصلہ وہمت کو تقویت ملی اور اس نئے اور اہم کام کے لئے راہیں ہموار نظر آئیں تو ''پہلا فقہی سیمینار'' اسی مقام پر منعقد کیا گیا، جس میں مباحث کے لئے جو تین عنوانات مقرر کئے گئے تھے وہ یہ تھے:

۱– پگڑی کا مسئلہ، ۲– اعضاء کی پیوند کاری، ۳– ضبط تولید کا مسئلہ

بفضل خدا یہ پہلا سیمینار توقع سے زیادہ کامیاب ہوا، اور جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ بہت بڑی تعداد میں ممتاز علماء اور اصحاب فقہ وافتاء نے شرکت کی، خصوصیت کے ساتھ حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا افتتاحی خطبہ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا خطبۂ صدارت اور مشہور فاضل ڈاکٹر جابر فیاض العلوانی صدر المعہد العالمی للفکر الإسلامی واشنگٹن، امریکہ کا خصوصی خطاب اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب (جلال آباد)، مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی اور مولانا مفتی نظام الدین صاحب (دیوبند) کے تائیدی کلمات نے اس سیمینار کو بڑی تازگی اور قوت بخشی، اور ایک خاص قسم کی روح اور جان ڈال دی، اس سیمینار کی مفصل روداد جس میں موضوع سے متعلق مقالات اور مباحث شامل ہیں۔ ''بحث ونظر نی نی کے خصوصی شمارہ ''فقہی سیمینار نمبر نی نی (صفحات ۴۰۸) میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اس نمبر کو اہل علم وتحقیق نے شوق کے ہاتھوں لیا اور قدر کی نگاہوں سے پڑھا۔

آپ کے علم واطلاع کے لئے اس موقع پر یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ مرکز البحث العلمی کی ایک نشست ۱۷/ستمبر ۱۹۸۹ء کو پھلواری شریف پٹنہ میں منعقد ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ ان علمی وفقہی کاوشوں کو منظم کرنے کے لئے وسیع تر دائرہ میں ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا

جائے ، چنانچہ کام کی نوعیت اور موضوع کی مناسبت سے مرکز البحث العلمی کی ’’تشکیل جدید نی مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) کے نام سے عمل میں آئی ، اس سلسلہ میں اکابر علماء سے اس کی خواہش کی گئی کہ وہ اس کی سرپرستی اور رکنیت قبول فرمائیں۔ یہ ہم سب کے لئے خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ ہمارے بزرگ علماء میں امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے سرپرستی قبول فرمالی۔

دوسرا فقہی سمینار جس میں آپ شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں اس میں دو خاص موضوع ہیں۔

۱-نوٹ کی شرعی حیثیت۔ کرنسی پر افراط زر کے اثرات اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے فقہی سوالات۔

۲-سود کا مسئلہ خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں ، سرکاری سودی قرضوں کا حکم ، ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ سیمینار بھی پہلے سیمنار کی طرح ان شاء اللہ کامیاب ہوگا اور اس میں پڑھے گئے مقالات اور کئے گئے مباحث علمی اور سنجیدہ ہوں گے۔ جن سے ان مسائل کے حل اور فیصلے میں آسانی ہوگی ، خدا نے توفیق دی اور آپ حضرات کا مخلصانہ تعاون شامل رہا تو انشاء اللہ یہ روداد مجمع الفقہ الإسلامی کی طرف سے دستاویزی شکل میں شائع کی جائے گی۔

میں اس موقع پر اپنے اس احساس کو چھپا نہیں سکتا کہ ان دونوں سیمینار کے لئے طلب کئے گئے مقالات سے اندازہ ہوا کہ ہمارے علماء میں اب بھی علم وتحقیق کا مزاج اور تلاش و جستجو کا ذوق ہے ، ان کے اندر نئے مسائل پر نئے انداز سے سوچنے ، لکھنے اور قدیم وجدید فقہی کتابوں کے ذخیرے سے استفادہ کی بھرپور صلاحیت موجود ہے ، اس سیمینار نے انہیں نیا حوصلہ اور نیا اعتماد بخشا ہے ، مطالعہ کی قوت کو نکھارا اور استخراج و استنباط کی صلاحیت کو ابھارا ہے ، اسی طرح اس سیمینار سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ دینی علوم اور عصری علوم کے ماہرین ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے میں خوشی اور مسرت محسوس کر رہے ہیں ، اور یہ دونوں دور

کے جومصنوعی خول میں بند تھے اس خول کو اتار رہے ہیں اور آپسی خلیج کو پاٹ کر فاصلہ کو قربت میں بدل رہے ہیں، خصوصیت کے ساتھ ان دونوں طبقات کے نوجوانوں کی جو صلاحیتیں ادھر سامنے آرہی ہیں، انہیں دیکھ کر بلا ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہمارے اس دوسرے فقہی سیمینار میں عالم اسلام کے بلند پایہ فاضل اور بالغ نظر دانشور ڈاکٹر جمال الدین عطیہ قاہرہ سے تشریف لائے ہیں۔ دوسرے مہمان خصوصی جو اس وقت ہماری مجلس میں تشریف فرمائیں وہ ہیں حضرت مولانا رفیع احمد عثمانی، اہل علم جانتے ہیں کہ آپ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے خلف الرشید مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم کراچی کے مہتمم اور مفتی اور بہت سارے علمی کمالات اور اخلاقی محاسن کے حامل ہیں۔ اس موقع پر ہم ان دونوں مہمان گرامی کا بطور خاص شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کے وجود نے اس سیمینار میں خاص قسم کی رونق اور گرمی پیدا کی، **جزاھما اللہ احسن الجزاء۔**

''عرض داعی'' کی آخری سطروں میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کی چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب کا نام زبان قلم پر آرہا ہے، اگر چہ ابتدائی سطروں ہی میں ان کا نام آنا چاہئے تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقائے کار کی خصوصی دلچسپی اور میزبانی سے پہلے کی طرح اس دوسرے سیمینار کے انعقاد میں بھی سہولت ہوئی، ہم اس کے لئے ڈاکٹر صاحب، ان کے ادارہ اور ان کے رفقاء کے تہ دل سے شکر گذار ہیں۔

یہ داعی اپنی معروضات اس سیمینار کے پس منظر میں ایک سبق آموز واقعہ کو نقل کر کے ختم کرتا ہے، اس واقعہ کا تعلق امام ابو حنیفہؒ کے لائق شاگرد امام محمد سے ہے، ان کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ راتوں میں کتابوں کے مطالعہ کے عادی تھے، موسم گرما میں یہ حال ہوتا کہ کتاب کھلی ہوئی ہے بدن کا کرتا اترا ہوا ہے اور پانی سے بھرا طشت سامنے ہے، جب نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو طشت سے پانی لے کر آنکھوں پر چھینٹے دیتے تا کہ یہ غلبہ ختم ہو اور

رپوری بیداری اور تیقظ کے ساتھ اپنا مطالعہ جاری رکھیں، اور نئے نئے مسائل کا استخراج و استنباط کریں، رات کے اس مسلسل عمل نے ان کی صحت پر جب مضر اثرات ڈالے تو ایک رات ان کے چند رفقاء ان کی خدمت میں آئے اور کہا کہ آپ یوں مسلسل نہ جاگیں اور سویا بھی کریں ورگرنہ آپ کی صحت خراب ہوجائے گی۔ رفقاء کی بظاہر اس ہمدردانہ بات کو سننے کے بعد امام محمد نے جو جواب دیا، کاش اس جواب کی تہہ تک آج ہم سب پہنچ سکتے اور اس میں چھپے ہوئے پیغام پر غور کرسکتے۔ فرمایا:

"لوگ تو اس بھروسہ پر سو رہے ہیں کہ کوئی نیا مسئلہ ہمارے سامنے آئے گا تو محمد کے پاس جائیں گے، محمد بھی اگر سو جائے تو لوگ پھر کہاں جائیں گے نی نی؟

☆☆☆

☆ایڈیٹر "المسلم المعاصر نی نی قاہرہ، مصر۔

خطبۂ افتتاحیہ

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ☆

[دکتور جمال الدین عطیہ اصول فقہ کے ماہر شمار کئے جاتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، موصوف کا اصل خطبہ عربی زبان میں ہے، جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے]۔

میرے لئے شرف کی بات ہے کہ آج میں آپ لوگوں کے درمیان ئی ئی ئی المعہد العالمی للفکر الاسلامی ئی ئی اور اس کے صدر جناب ڈاکٹر طہ جابر علوانی کی نمائندگی کررہا ہوں۔ جن کی خواہش تھی کہ وہ خود تشریف لائیں۔ لیکن بعض ناگزیر حالات اور گوناگوں مصروفیات کی بنا پر وہ تشریف نہیں لاسکے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ میں ہندوستان کی زیارت سے مشرف ہوا۔ گرچہ اس سے قبل سری لنکا اور پاکستان کی زیارت کرچکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری یہ زیارت دائمی اور مفید تعلقات کا آغاز ثابت ہو۔

اور اسی طرح یہ پہلا موقع ہے کہ میرے لئے آپ کے اس مؤقر ادارہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی ئی ئی کے سمینار میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جس نے برصغیر میں اجتہاد، افتاء، علمی تحقیقات اور تجدید دین کا بیڑا اٹھایا ہے۔

میرے لئے مزید باعث شرف وعزت ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں نے مجھ سے خطبہ افتتاحیہ کی فرمائش کی۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے اپنے افکار وخیالات کا اظہار کروں۔ ضروری ہے کہ میں اولاً اس کے فکری، اصولی اور تاریخی ڈھانچے آپ کے سامنے پیش کردوں۔

معزز سامعین!

ہمارے سامنے اس سیمنار کے ایجنڈے میں دو اہم مسئلے زیر غور ہیں۔ پہلا نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق ہے۔ اور دوسرا مسئلہ سودی بینکنگ سسٹم سے متعلق ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا تعلق ان اہم اقتصادی مسائل سے ہے جس نے علماء اسلام کے ذہن ودماغ کو پچھلی صدی عیسوی سے اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔

یہ دونوں مسئلے اور اسی طرح کے اور بھی متعدد نئے مسائل ہیں جو سلف صالحین کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے اور یہ ایک فطری امر ہے۔ کیونکہ سماجی تغیرات اور زندگی کی نت نئی پیچیدگیاں ان نئے مسائل کے پیدا ہونے کے سبب ہیں۔ اور کائنات میں ان تبدیلیوں کا ظہور پذیر ہونا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے کہ تبدیلیوں کو وجود میں لاتی ہے اور خود نہیں بدلتی۔

یہ بات مسلم ہے کہ اسلام بنی نوع انسان کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے اور اس کا حال سابقہ آسمانی شریعتوں سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ پہلے جب بھی کوئی نئی شریعت آتی تو وہ پچھلی شریعتوں کے بنیادی اور اساسی اصول وقوانین کو باقی رکھتے ہوئے ان مسائل کو اپنا مرکز توجہ بناتی جو یا تو نئے ہوتے یا پچھلی شریعتوں میں اس درجہ وضاحت کے ساتھ موجود نہ ہوتے۔

اور ان دونوں امور (حالات زندگی میں مسلسل تبدیلی اور اسلام کے آخری دین ہونے) کی بنیاد پر ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ زندگی میں رونما ہونے والے ان نئے مسائل سے متعلق شریعت کا حکم بیان کرنے کے لئے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔

محترم سامعین!

فقہ کی کتابوں میں کاغذی نوٹ اور بینکنگ سسٹم سے متعلق ہمیں کوئی مستقل بات

نہیں ملتی، کیونکہ یہ نئے نظام اس وقت رونما ہوئے جب فقہ اسلامی اپنی نشو ونما اور جدت سے رک گیا، اور یہ وہ چیز ہے جسے باب اجتہاد کے بند ہو جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور بعض علماء کرام (اپنی تقلیدی رجحانات کی وجہ سے) ان مسائل کا حکم شرعی براہ راست کتاب وسنت سے اخذ کرنے کے بجائے ان جیسے دوسرے مسائل میں فقہاء کرام کی مستنبط کی ہوئی آراء پر قیاس کے ذریعہ متعین کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ جب کہ یہ ایک بنیادی غلطی ہے جس نے ہماری فقہی زندگی کے دائرہ کار کو تنگ کر دیا ہے۔

کیونکہ قیاس کا اصول (جیسا کہ فقہ اسلامی کا ہر اسکالر جانتا ہے) یہ ہے کہ قیاس ہمیشہ ان واقعات ومسائل پر ہوتا ہے جن کے احکام کتاب وسنت میں منصوص ہیں، لیکن اہل اصول میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ جدید مسائل کو ایسے مسائل پر قیاس کیا جائے جو خود مجتہد فیہ ہوں۔ اور یہ وہ جامد طریقہ کار ہے جس کے اندر نہ تو کسی اختلاف کو ختم کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی ایسا مرجع ومعیار بننے کی جس سے خطا وصواب کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ خطا وصواب کے درمیان امتیاز کا اصل معیار کتاب وسنت ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم فقہاء کرام کی ان آراء سے بھی صرف نظر کر لیں جو ان نئے مسائل کے سلسلے میں نہیں ہیں، لیکن وہ ہماری فقہ کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں جن سے ہمیں ان امور میں رہنمائی ملتی ہے جن پر حالات اور زمان ومکان کی تبدیلی اثر انداز نہیں ہوتی۔

یہ امر ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ دور حاضر میں مسئلہ اجتہاد سے متعلق دو اہم بنیادی مسائل پر اظہار خیال کریں:

۱- پہلے مسئلہ کا تعلق جزئی اجتہاد کی طرف توجہ مبذول کرنے سے ہے۔ کیونکہ دور حاضر میں علوم ومعارف کی کثرت وتنوع کی وجہ سے اجتہاد مطلق کے شرائط کا تحقق مشکل ہے اور کسی خاص علم وفن میں تخصص ومہارت اس دور کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور تمام علوم وفنون پر بصیرت رکھنے والے علماء کا وجود سلف صالحین کی طرح شاذ ونادر ہے۔ اب اس کی متبادل صورت یہ ہے

کہ اجتہاد میں اس طرح تخصص کیا جائے کہ علم کی مختلف شاخوں میں سے ہر شاخ کے ماہرین تیار ہوں۔مثلاً اقتصادیات،ساجیات،بین الاقوامی تعلقات وغیرہ۔

اور کسی مجتہد کو اجتہاد کی اجازت صرف اس شکل میں ہو جب کہ وہ اجتہاد میں مطلوب شرائط کا حامل ہو اور اپنے تخصص کئے ہوئے علم سے متعلق علوم شرعیہ کا بھی ماہر ہو اور عصری علوم کے مطالعہ کے ذریعہ اسے حقیقت حال کا بھی علم ہو۔

۲ – دوسرے مسئلے کا تعلق انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کی طرف توجہ مبذول کرنے سے ہے۔تا کہ اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں مجتہدین جس رائے پر متفق ہوں، وہ انفرادی اجتہاد کے مقابلہ میں اقرب الی الصواب ہو، تا کہ کار اجتہاد ایک منظم ادارے کی صورت میں تبدیل ہو جائے۔جس کی رکنیت کے شرائط اور طریقہ کار کا تعین ہو۔اور اس جیسے دوسرے اداروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت معلوم ہو۔اور اس طرح اسے ملک میں پائے جانے والے مختلف نظاموں کے درمیان صحیح مقام مل سکے۔اور اس کے ساتھ وہ دوسرے اسلامی ممالک میں پائے جانے والے اپنے جیسے اداروں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کر سکے۔اس سلسلہ میں میں آپ کے اس اہم اسلامک فقہ اکیڈمی کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہوں کہ اس کی نظر عالم اسلام کی دوسری فقہ اکیڈمیوں میں ہونے والی تحقیقات اور تجاویز وقرارداد پر رہے۔اگر ان کے فیصلوں سے آپ متفق ہوں تو اسی پر اکتفا کیا جائے۔اور آپ کی کوششیں ان امور کی طرف مبذول ہوں جو اب تک موضوع بحث نہ بنے ہوں۔خاص طور پر وہ امور جن کا تعلق ہندوستانی معاشرہ سے ہے اور جن کی طرف توجہ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔اس کے لئے میں ذیل میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔اور ہمیں مسرت ہوگی کہ یہ دونوں موضوعات تیسرے فقہی سمینار کے ایجنڈے میں شامل ہوں۔

پہلے مسئلہ کا تعلق اقلیتوں کی مخصوص فقہ سے ہے، چونکہ ہندوستانی معاشرہ مختلف نسلوں، زبانوں، تہذیبوں اور مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔اور مسلمان اس معاشرہ کی ایک اہم

اقلیت ہیں، ان کی ایک تاریخ ہے اور ان کے دوررس اثرات ہیں، اسی کے ساتھ ان کے کچھ مسائل اور مشکلات اور خصوصیات ہیں۔

پس مذکورہ صورت حال میں نہ تو اس پر دار الاسلام کے احکام نافذ ہوتے ہیں اور نہ دار الحرب کے اور نہ ہی دار العہد کے۔ اور اس سلسلے میں ہندوستان تنہا نہیں ہے بلکہ اس جیسے اور بھی بہت سارے ممالک ہیں جن میں مسلم اقلیتیں آباد ہیں، جن پر دستوری اور بین الاقوامی ترقی کی بنا پر دار کے مذکورہ اقسام کے احکام منطبق نہیں ہوتے، اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان حالات پر غور وفکر کیا جائے اور ان کے مناسب فقہی احکام تلاش کئے جائیں۔ اسی کو میں نے پہلے ''فقہ الاقلیات'' سے تعبیر کیا تھا۔ اور ان حالات کا صحیح اندازہ اور اس سے متعلق اجتہاد وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس سے دوچار ہیں، اور جہاں تک آپ کے سعودی، پاکستانی اور مصری بھائیوں کا تعلق ہے تو انہیں آپ کی طرح ان حالات کا علم نہیں ہے۔ اس لئے ان مسائل کی طرف توجہ دینا ان لوگوں کا اولین فریضہ ہے جن میں ان کے حل کرنے کی صلاحیت ہے۔ مذکورہ بالا مسائل کا تعلق تو فقہی احکام سے ہے۔

جہاں تک ایسے معاشرہ میں دین اسلام کی تبلیغ کا تعلق ہے تو ہمارا خیال ہے کہ موجودہ صورت حال میں تبلیغ دین کا سب سے مؤثر طریقہ اسوۂ حسنہ اور اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اور یہ شہادت علی الناس کا بہترین طریقہ ہے۔

دوسرے مسئلے کا تعلق علوم شرعیہ کی تعلیم وتعلم اور اس کو فروغ دینے سے ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ علماء ہند کو اسلامی علوم کے اہتمام اور اس کے قیمتی سرمایہ کی حفاظت اور اس کی تحقیق واشاعت میں ید طولی حاصل ہے۔

لیکن وقت آن پڑا ہے کہ اپنے ماضی کا جائزہ لیں اور سوچیں اور مستقبل کے لئے ایسا لائحہ عمل تیار کریں جو اگلے مرحلے کے لئے نقطۂ آغاز ہو۔ اور دور حاضر کے تقاضوں کو اچھی طرح پورا کر سکے۔ مثلاً علم العقیدہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم عقیدے کے ان عناصر کو نمایاں کریں

جن کا ذکر قرآن وحدیث میں قطعی دلائل کے ساتھ آیا ہے۔ساتھ ہی عقائد پر استدلال کے سلسلے میں قرآن وحدیث کے قطعی دلائل کے علاوہ عصری علوم اوران کی ترقیات سے بھی استفادہ کریں۔

اورعلم کلام کے ان پیچیدہ مسائل سے صرف نظر کریں جنہوں نے اپنے خاص دور میں اس وقت کے شکوک وشبہات کے ازالہ میں اپنا تاریخی کردار ادا کیا اوراب ہماری توجہات کا مرکز ان شکوک وشبہات کا ازالہ ہوجودورحاضر کی پیداوار ہیں۔

اورقرآن کریم ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس کتاب کے فہم وادراک اور اس کے احکام وفرامین پرعمل پیرا ہونے اوراسے اپنی زندگی کے لئے لائحہ عمل بنانے کے سلسلے میں اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کیفیت کیا ہو۔

قرآن عظیم کے سلسلے میں اتنی بات کافی نہیں کہ ہم اس کے صرف تشریعی پہلو کو اجاگر کریں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم عقیدہ وسلوک، اخلاق واعمال، تاریخ اور خدا کی تکوینی سنت کو بھی مرکز توجہ بنائیں۔اور قرآن کریم کی تفسیر میں لغوی، فقہی، کلامی اور مسائل تصوف کے علاوہ قرآن کی ان اساسی تعلیمات کو پیش نظر رکھیں جن کا تعلق انسان کی سیرت و کردار کی اصلاح وتعمیر سے ہے۔تاکہ قرآن کریم سے ہم اپنی موجودہ زندگی کو مربوط کرسکیں۔

اسی طرح سنت وسیرت نبوی ہم سے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کی ایسی جامع خدمت کریں کہ اس کی ہر روایت کی تحقیق محدثین کے طریقہ پر کرسکیں، اور پھر اسے انسائیکلو پیڈیا کی صورت میں مرتب کرسکیں۔ یہاں تک کہ سنت کے ہر اسکالر کے لئے ان کے شہ پاروں کی طرف رجوع کرنا آسان ہوسکے، اورسنت وسیرت کے ساتھ انہیں اپنے تعلق کی کیفیت معلوم ہوسکے، اوروہ قرآن کی روشنی میں کامل طریقہ پراس کا فہم وادراک کرسکیں اورنقدسند کے ساتھ نقدمتن کا بھی اہتمام کریں اورعلماء کی ایسی جماعت تیار کریں جوکہ مذکورہ بالاامور کوانجام دے سکیں یہاں تک کہ امت کا تعلق نئے سرے سے اس کی تہذیب وثقافت اور ہدایت کے سرچشمے سے قائم ہو۔

اور فقہ اسلامی ہم سے اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم ان مثالوں کی بنیاد پر گفتگو کرنے کی بجائے جن کی موجودہ زندگی میں کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے، ایسی مثالیں پیش کریں جن کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہے۔ (مثلاً غلامی سے متعلق جزئیات) تا کہ ہم فقہ اسلامی کا ربط عملی زندگی سے قائم کرسکیں، اور ساتھ ہی ایسے نئے ابواب کا اضافہ بھی کریں جن کا تعلق دور حاضر کے مسائل سے ہے۔ مثلاً کاغذی نوٹ کی شرعی حیثیت، بینکنگ سسٹم اور انشورنس کے مختلف مسائل وغیرہ۔

اور ہم اسلام کے مختلف فقہی مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کے شرعی دلائل اور شریعت کے اغراض ومقاصد کی روشنی میں کریں، تا کہ ہماری زندگی شریعت کے مصادر کا عملی نمونہ بن جائے جیسا کہ ائمہ عظام کے زمانے میں تھی۔ کہ جب وہ اپنے زمانے کے کسی مسئلے کے سلسلے میں کوئی حکم شرعی دیتے تو اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہوتی۔

اصول فقہ:

جہاں تک اصول فقہ کا تعلق ہے تو یہ وہ عظیم الشان علم ہے جس کے عناصر ترکیبی کو ترقی اور فروغ دینا ہمارا فریضہ ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف علم فقہ منضبط ہو بلکہ اس کی افادیت موجودہ انسانی علوم اور سماجی علوم کو بھی شامل ہو۔ جیسے علم الاقتصاد، سماجیات، نفسیات وغیرہ۔ یہ وہ جدید علوم ہیں جن کی نشو ونما انسانی افکار وتجربات کی روشنی میں وحی سے دور رہ کر ہوئی ہے۔ پس ضرورت اس کی متقاضی ہے کہ ہم ان علوم کا رشتہ وحی الٰہی سے جوڑیں، اور وحی کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کریں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان علمی حقائق اور تکوینی سنتوں کے درمیان اور ان جدید سائنسی حقائق کے درمیان ربط وتعلق قائم کریں جن تک جدید علوم کی رسائی ہوسکی ہے۔

اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ ہم ان علوم کے عناصر ترکیبی کو اس طرح فروغ دیں جو اس طریقہ کار کے مناسب ہو، تا کہ علم اصول فقہ اور دوسرے اسلامی علوم انسانی علوم کے

درمیان اپنا صحیح وزن قائم کرسکیں، تا کہ ہم اس طرح اس خلیج کو پاٹ سکیں جو اسلامی تہذیب اور عصری تہذیب کے درمیان حائل ہے، اور اس طرح یہ سارے انسانی علوم وحی کی برکات سے بہرہور ہوسکیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس وحی سے انہیں فیضیاب کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور میں اپنی بات ختم کرنے سے قبل دو باتیں خاص طور پر عرض کردینا چاہتا ہوں۔

پہلی بات کا تعلق کاغذی نوٹ کی شرعی حیثیت سے ہے۔ ماضی میں سونے اور چاندی کے سکوں کا خاص مقصد تھا جس کی تکمیل اس کے ذریعہ ہورہی تھی اور اسی بنا پر زکوٰۃ، صدقات، ربوا اور دوسرے دنیاوی معاملات سے متعلق شرعی احکام ان پر مرتب ہورہے تھے۔ جب سکے اس دور میں بتدریج بازار سے ہٹالئے گئے اور ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی جب کہ ان کاغذی نوٹوں کا اعتماد کلی یا جزوی طور پر سونے اور چاندی کے ان سکوں پر ہی رہا، پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوتا گیا اور ان کاغذی نوٹوں کا دارومدار ان سکوں پر کسی بھی شکل میں باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے بازار میں ایک شدید بحران پیدا ہوا، جس نے ماہرین اقتصادیات کو شش و پنج میں ڈال دیا کہ وہ کس طرح اس مسئلہ کا حل تلاش کریں یہاں تک کہ بعض ماہرین اقتصادیات اس بات پر مصر ہیں کہ ان کاغذی نوٹوں کا مدار سونے پر رکھا جائے۔

اور شرعی نقطۂ نظر سے جو چیز ہمارے لئے اہم ہے وہ یہ کہ فقہی احکام ہمیشہ کچھ مخصوص مقاصد کے ساتھ مربوط رہے ہیں۔ پھر جب وہ مقاصد ختم ہوگئے تو فقہی احکام بھی بدل گئے۔

اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ علماء اسلام جب کبھی اس مسئلہ پر باہم تبادلہ خیال کرتے ہیں تو ان کا ایک طبقہ ان کاغذی نوٹوں کو علی الاطلاق اصلی سکہ قرار دیتا ہے جب کہ دوسری جماعت اسے نقد (سکہ) تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہر دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو علی الاطلاق قبول کرنے کے نتیجہ میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس نے کسی کو راضی کیا اور کسی کو ناراض۔ اور بحث ومباحثہ کا میدان گرم ہی رہا۔ اگر ہم اس بات پر دھیان رکھیں کہ احکام کا تعلق ہمیشہ مقاصد سے رہا ہے تو کاغذی نوٹوں کی حیثیت کا تعین کرتے وقت ان مقاصد کو پیش نظر

رکھیں گے جو ان اوراق نقدیہ کا اصل فریضہ ہیں۔ یعنی ان کا ذریعہ تبادلہ ہونا اور ہم ان احکام پر نظر ثانی کر سکیں گے جن کا تعلق ان فرائض سے ہے جنہیں کاغذی نوٹ اب سرے سے پورا نہیں کر رہے ہیں۔ یعنی ان کا قیمت اور قدر کے تعین کے لئے معیار اور مخزن (STORE OF VALUE) ہونا۔

اور یہ بات ہمارے پیش نظر رہے کہ کاغذی نوٹوں کے سلسلے میں اصل پریشانی ان نوٹوں کا اپنی ذاتی قیمت کا کھو دینا ہے جس کی وجہ سے اس کا قیمتوں کے لئے معیار ہونا فوت ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس مختلف سامان کاغذی نوٹوں کی قیمت کی تعیین کیلئے معیار بن گئے۔ یعنی ایک بدلنے والی چیز ناقابلِ تغیر ہو گئی، اور جس میں تغیر و تبدل کی صلاحیت نہیں تھی وہ بدل گئی۔ پھر ان نوٹوں کا اپنی ذاتی قیمت کھو دینے کے ساتھ افراط زر کا پیدا ہونا جس کی وجہ سے اس کا قیمتوں کے لئے مخزن ہونا ختم ہو گیا۔ اور جس نے صارفین کو اموال کے حصول کی طرف متوجہ کر دیا جو زیادہ پائیدار رہنے والے ہیں۔

یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جب حکومت بازار کو ان کاغذی نوٹوں سے بھر دیتی ہے تو ان کی قیمت سامانوں کے مقابلے میں کم ہو جاتی ہے۔ جس پر نص قرآنی نہی ”وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ أَشۡيَآءَهُمۡ“ (سورۂ اعراف ۸۵:) (اور تم لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو) منطبق ہوتی ہے۔

اسی طرح ہم اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ کاغذی نوٹوں کی قیمت گھٹ جانے کا اثر ان طویل المیعاد قرضوں پر پڑتا ہے مثلاً مہر موجل۔ اور اس کا اثر نوٹ کی قدر و قیمت میں تیزی کے ساتھ تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جیسا کہ ٹرکی اور لبنان میں خاص طور پر اس کے اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ اور شائد کہ اس مسئلہ کا حل اس بات میں پوشیدہ ہو کہ ہم احکام کو قیمتوں کے ساتھ مربوط کریں، نہ کہ ظاہری صورت کے ساتھ۔

دوسری بات کا تعلق بینکنگ سسٹم سے ہے، تو بینکنگ سسٹم کے بعض معاملات

خاص طور پر ایسے معاملات جو انسانی خدمت سے متعلق ہیں۔ اور جن کا تعلق نوٹوں کے ادھار کاروبار سے نہیں ہے تو ایسے معاملات کا حکم حلت ہے، اوراس کے اوپر وہ احکام مرتب ہوتے ہیں جسے فقہ اسلامی میں اجارہ اور صرف کہا جاتا ہے۔

اور دوسرے بعض معاملات ایسے ہیں جن کی حرمت اور ان میں ربا کا تحقق واضح ہے۔ جیسے کہ بینک کی امانتوں کی مختلف شکلیں۔

اور بعض معاملات وہ ہیں جن میں احکام خلط ملط ہوجاتے ہیں، کیونکہ وہ دونوں قسموں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اعتمادات مستندیہ جو بعض لحاظ سے انسان کی خدمت ہے اور بعض لحاظ سے سودی قرض ہے۔

ہم صرف شریعت اسلامیہ سے متصادم بینکنگ معاملات کی حرمت کے قائل نہیں، بلکہ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسا متبادل انتظام کیا جائے جو شرعاً قابلِ قبول ہو۔ اوراس سے وہ نتیجے حاصل ہوسکیں جوان معاملات کا اصل مقصود ہیں۔ اور اسلامی بینکنگ سسٹم ایک کامیاب تجربہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دوسرے تجربات کی طرح اس میں بھی غلطیوں کا امکان ہے جسے اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے خلاف استعمال کررہی ہیں۔ اور کافی زورو شور کے ساتھ اس کا مطالبہ کررہی ہیں کہ اسلام میں زندگی کے معاملات کو منظم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اوراس بنا پر وہ اس کا مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام کو محض عقائد، عبادات اور اخلاقیات تک ہی محدود رہنا چاہئے۔ زندگی کے دوسرے معاملات میں اسے مداخلت کا حق نہیں ہے۔

اور سیکولر ذہنیت کے حاملین اسے مختلف طریقوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس بناء پر ہماری فقہی اکیڈمیوں اور تحقیقاتی اداروں کی ذمہ داری زیادہ اہم ہوجاتی ہے۔

ہم اللہ رب العزت سے دست بدعا ہیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے اور ان کے ذمہ

☆ صدر مفتی ومہتمم دارالعلوم کراچی، پاکستان

داروں اور کام کرنے والوں کی رہنمائی کرے اور انہیں اجر جزیل عطا کرے۔ آمین

☆☆☆

خطبۂ صدارت

مولانا محمد رفیع عثمانی ☆

خطبہ مسنونہ کے بعد اسلامک فقہ اکیڈمی اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ اس اجتماع کا جو سب سے بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں قدیم اور جدید علوم کے ماہرین کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس زمانہ میں سیاسی، تمدنی، اقتصادی، طبی وغیرہ مسائل اتنے پھیل گئے ہیں۔ اتنے گونا گوں ہوگئے ہیں کہ ان تمام کوششوں کو سامنے رکھ کر قرآن وسنت کی روشنی میں احکام شرعیہ کو مرتب اور مستنبط کرنا صرف اسی شخص کے بس کا کام ہوسکتا تھا جو مجتہد مطلق کہلانے کا اہل ہوتا۔ لیکن مجتہد مطلق کا جو مقام ہے، جو شرائط ہیں، آپ حضرات جانتے ہیں ان کے پیش نظر آج دور دور تک کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی ہے جو اجتہاد مطلق کا دعویٰ کر سکے یا اس سلسلہ میں کوئی کام کر سکے، لیکن واقعہ یہی ہے کہ حالات سیاسی میدان میں، اقتصادی میدان میں، معاشرتی میدان میں اور مختلف شعبہائے حیات میں اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، اور اتنے بڑے پیمانہ پر ان میں تبدیلی رونما ہورہی ہے کہ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ اس وقت اجتہاد مطلق کی ضرورت ہے، صورت حال یہ ہے کہ قرآن کو جو کچھ بیان کرنا تھا وہ بیان کر چکا، حضور ﷺ نے اپنی تیئس سالہ زندگی میں قرآن کریم کی جو تشریح فرمائی تھی وہ فرمادی، اسلاف امت نے ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی، نظم قرآن کی بھی اور معانی قرآن کی بھی، اور معانی قرآن وہ ہیں جو رسول اللہ

ﷺ سے منقول ہیں، ہمارا دعویٰ ہے اور عقیدہ ہے، اب کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں ہے کسی اور نبی کے آنے کا امکان نہیں ہے، اللہ نے اپنے دین کی تکمیل کردی اور اللہ نے ہمیں ایسی امت بنایا جو آخری امت ہے، اور قیامت تک تمام مسائل کا سامنا اسی امت کو کرنا ہے، ان حالات میں جب کہ تبدیلیاں تو معاشرہ میں اتنی تیزی سے آرہی ہیں، اتنے بڑے پیمانہ پر آرہی ہیں کہ ہمارا فقہی ذخیرہ اس میں شک نہیں ہے کہ ان تمام چیزوں کا حل اصولی طور پر اس میں ضرور موجود ہے، مگر جزوی طور پر اور جزئیات کی صورت میں وہ کفایت نہیں کررہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حالات میں تبدیلی اتنی شدت سے آئی ہے اور آرہی ہے کہ اجتہاد کے مسائل اور اس کے باقی مسائل کے لئے بھی بہ ظاہر آئندہ دوسرے سمینار سے کام چلنے والا نہیں ہے، اور عادۃ اللہ یہ ہے کہ جب کوئی ضرورت پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالی اس کا سامان بھی پیدا فرمادیتے ہیں، ایک طلب جب پیدا ہوتی ہے تو اللہ رب العالمین کی طرف سے اس کی رسد بھی آتی ہے، اللہ سے ہمیں قوی امید ہے کہ عنقریب نہ سہی لیکن عادۃ اللہ یہ بتاتی ہے کہ کوئی مجتہد مطلق بھی رونما ہونے والا ہے، کیونکہ اس کی ضرورت شدید ہے، پوری دنیا اس کی طالب ہے لیکن مجتہد مطلق کا جو مقام ہے وہ اتنا اونچا مقام ہے کہ آج کوئی اس کا دعویٰ بھی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا، شاید بظاہر حالات ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ اب امام مہدی علیہ السلام ہی مجتہد مطلق ہوکر آئیں گے، لیکن کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ظہور کب ہونے والا ہے، واقعہ یہ ہے کہ زندگی رواں دواں ہے، زندگی کا یہ قافلہ انتظار نہیں کرتا۔ ہمارے یہ مسائل جو روز بروز پیدا ہورہے ہیں ان کے بارے میں امت مسلمہ کی نظریں علماء امت کی طرف اٹھ رہی ہیں، اقتصادی میدان میں آپ کیا کہتے ہیں، طبی مسائل جو پیدا ہورہے ہیں ان میں آپ کی رہنمائی کیا ہے۔ معاشرہ میں اور سیاست کے میدان میں جو نت نئے نظریات، مسائل اور رسوم جڑ پکڑ رہی ہیں، ان میں اسلام کی ہدایت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں نظریں علماء کرام ہی کی طرف اٹھ رہی ہیں، اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اسی مسئولیت کو پورا کرنے کے لئے وہ جدو جہد اختیار کریں جو

ہمارے اسلاف کا وطیرہ رہی ہے۔ کیونکہ ابھی مغرب سے پہلے امام محمد رحمۃ اللہ کا قول آپ سن چکے ہیں کہ اگر محمد بھی سوگیا تو یہ پوچھنے والے کس سے پوچھیں گے،، جو ذمہ داری اس وقت ائمہ مجتہدین پر اور ایک ایک امام پر آرہی تھی اب جب کوئی شخص ان کی جگہ لینے والا نہیں ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ ذمہ داری جو امام محمد کے کندھوں تھی آج وہ ہم میں سے کسی ایک کے کندھے پر تو نہیں، لیکن ہمارے مجموعہ کے اوپر اور ان کے کندھوں پر یہ ذمہ داریاں موجود ہیں اور ہمیں یاد دلا رہی ہیں کہ راتوں کو جاگا کریں۔ ''من طلب العلی سہر اللیالی''۔

مجھے والد محترم کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ وہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے روایت کرتے تھے، علامہ عثمانی فرماتے تھے کہ علامہ انور شاہ کشمیری جب مرض الموت میں گرفتار تھے، ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی وفات کی خبر آجائے گی، ایک رات تہجد کے وقت دیوبند میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ علامہ کشمیری وفات پاچکے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ میں اس وقت بیتاب ہوکر جلد محلہ خانقاہ کی طرف حضرت کو دیکھنے کے لئے چلا، حضرت کے کمرہ میں پہنچا تو دیکھا کہ لالٹین جل رہی تھی، اس زمانہ میں بجلی نہیں تھی، اجازت لے کر حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب دوزانو ہوکر بیٹھے ہیں کتاب شامی ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ لالٹین پر جھکے ہوئے شامی کے مطالعہ میں غرق ہیں۔ بہت سخت علالت اور ضعف کا زمانہ تھا۔ حضرت علامہ شبیر احمد فرماتے ہیں کہ میں نے بطور ناز اور بطور شکایت عرض کیا کہ حضرت! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ شامی میں کون سا ایسا مسئلہ ہے جس کو آپ نے پہلے نہ دیکھا ہو، اور جو آپ کا دیکھا ہوا ہوتا ہے تو آپ کو یاد بھی ہوتا ہے، اور اگر کوئی مسئلہ ایسا تھا کہ جو آپ نے دیکھا نہیں تھا اور آپ کو یاد بھی نہیں تھا، تو ہم آپ کے غلام کہاں مرگئے تھے، ہم میں سے کسی ایک کو حکم دیتے وہ مسئلہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کردیتا، اس تکلیف میں آپ اتنی مشقت اٹھارہے ہیں، مطالعہ فرمارہے ہیں، علامہ عثمانی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب مجھے دیکھنے لگے اور فرمایا کہ بھئی! یہ بھی ایک بیماری ہے، مطالعہ بھی ایک بیماری ہے اللہ

تعالیٰ یہ بیماری مجھے عطا فرمائے، یہ بیماری ہماری چھوٹ گئی ہم صحتیاب ہوگئے۔ یہ بیماری ہمارے بزرگوں کو بھی تھی، راتوں کو جاگ کر انہوں نے امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے۔ بہت بھاری ذمہ داری ہم پر آگئی ہے۔

اب وقت نہیں رہا، صدیوں سال پہلے ہمارے اسلاف نے بہت عرق ریزی کے ساتھ جو کتابیں اور فقہ وفتاویٰ مرتب کئے، ان کو دیکھ کر اور آنکھ بند کر کے فتویٰ دیتے چلے جائیں، والد صاحب بکثرت فرماتے تھے کہ فقہاء کرام کا مشہور قاعدہ ہے: **"من لم یعرف أھل زمانه فھو جاھل"** حالات زمانہ پر جب تک نظر نہ ہو امت کی رہنمائی نہیں کی جاسکتی، فتویٰ اور فقہ کا دعویٰ نہیں کرسکتا، ان حالات میں ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں ہیں، فتویٰ میں انحطاط ہے، حالات میں ناسازگاری ہے، ہر شخص اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہے۔ علمی صلاحیتیں بھی دن بدن کم ہوتی جارہی ہیں ان حالات میں مسائل بڑھتے جارہے ہیں اور نئے نئے علوم سامنے آرہے ہیں، ان حالات میں اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے کہ جزوی مسائل میں جزوی اجتہاد کے راستے کو رواں دواں رکھا جائے۔ جزوی مسائل میں اور اجتہاد کے مسائل میں ہمارے تمام فقہاء اور اکابر الحمد للہ بڑے بڑے کارنامے چھوڑ گئے ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی امداد الفتاویٰ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ان کے اجتہادی کارناموں کا واضح ثبوت ہے اور ساتھ ہی حسین یادگار بھی ہے۔

یہ تصور ہمارے بہت سے حلقوں میں اب بھی موجود ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے، والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ آج بھی بند نہیں ہے اور آئندہ بھی بند نہیں ہوگا۔ ہاں اس میں جو دروازے ہیں اس میں داخل ہونے کے لئے کچھ شرائط ہیں، اس زمانہ میں وہ شرائط افراد میں موجود نہیں رہے، اسی واسطے سمجھا جارہا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔ بھلا قرآن وسنت کا کبھی دروازہ بند ہوگا؟ ہمارے یہ اکابر نئے مسائل میں مسلسل اجتہاد کرتے رہے ہیں، امدا الفتاویٰ کو اٹھا کر آپ دیکھیں خاص طور سے کتاب البیوع

اور معاملات کے جو مسائل ہیں، ان کے اندر اجتہاد فی المسائل آپ کو جگہ جگہ ملیں گے، اور انہوں نے پوری کوشش کی ہے صرف یہی کام نہیں کیا کہ یہ بتا دیا جائے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ میں نے اپنے والد ماجد سے بار بار سنا وہ ہمیں تلقین فرمایا کرتے تھے کہ معاملات بیوع و شراء سے متعلق، لین دین سے متعلق ان کے بارے میں جب مسائل آئیں تو مفتی کے لئے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ مسئلہ ناجائز ہے، بلکہ وہ یہ بھی بتلائے کہ یہ صورت تو ناجائز ہے لیکن اس صورت میں یہ تبدیلی کردی جائے تو جائز ہو جائے گا۔ جائز راستہ بتانا بھی مفتی کی ذمہ داری ہے ورنہ خطرہ ہے کہ بہت سے لوگ اس طرح مرتد ہو جائیں گے کہ ان کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ ہم مرتد ہو گئے ہیں، اسی وجہ سے ہماری ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں ہیں۔

ان حالات میں کسی ایک فرد کے بس کا کام یہ نہیں رہا کہ وہ اجتہاد فی المسائل کسی خاص میدان میں تنہا کر سکے، مثلاً معاملات ہی کے باب میں اجتہاد فی المسائل تنہا کوئی شخص کر سکے، اور سارے مسائل کو حل کر دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حالت زمانہ نے اور پچھلے دو سو سال کے سیاسی حالات نے جدید و قدیم علوم کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی کہ جن مسائل کا ہمیں حکم معلوم کرنا ہے ان مسائل کی صحیح صورت حال ہمیں نہیں معلوم اور جن حضرات کے سامنے صورت مسئلہ ہے انہیں جواب معلوم کرنے کا راستہ نہیں معلوم۔

میں مبارک باد پیش کرتا ہوں اسلامک فقہ اکیڈمی کے کارکنان حضرات کو خاص طور سے جناب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کو کہ انہوں نے اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم کیا، جس کے اندر انہوں نے قدیم وجدید دونوں کو ملا دیا اور اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے جو دو سو سال سے ہمارے درمیان حائل رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان مسائل میں جتنی احتیاج علماء اور فقہاء اور مفتی صاحبان کی ہے کم و بیش اس کے قریب قریب ہی احتیاج ہمیں ان علوم کے ماہرین کی ہے جن علوم کے بارے میں ہم مسائل کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ جدید علم کے ماہرین سے صورت حال ہمیں معلوم ہوگی، یعنی

صورت مسئلہ یہ بتائیں گے اور جواب آپ دیں گے، اور صورت مسئلہ متعین کرنا بھی آسان کام نہیں ہوتا اور ''السوال نصف العلم'' تو نصف العلم دانشور حضرات سے حاصل ہوگا اور باقی نصف العلم فقہاء کرام سے، مجھے امید ہے کہ یہ اکیڈمی اس سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کرے گی اور یہ اکیڈمی اجتماعی اجتہاد کا ایک میدان ہموار کررہی ہے۔

یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس اس امت میں نئی چیز نہیں ہے، غور کیا جائے تو پورے تسلسل کے ساتھ اس کی نظیریں ہمیں پچھلے چودہ سو سال کے اندر ملتی ہیں، اور خود عہد رسالت کے اندر ملتی ہیں، اساریٰ بدر (بدر کے قیدیوں) کے واقعہ میں حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، واقعہ حضرات علماء کرام کو معلوم ہے اور فیصلہ مشورہ کے بعد ہوا، اس میں خطا ہوئی اس پر عتاب بھی ہوا۔ یہ اجتماعی اجتہاد تھا، اور حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مجلس بنائی تھی، ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ جو بھی مسائل امت کو پیش آئے ہیں خلفائے راشدین نے صحابہ کرام کو جمع کرکے ان سے پوچھا ہے کہ آپ نے کوئی حدیث اس سلسلہ میں حضور ﷺ سے سنی ہو تو بتائیں، اگر حدیث مل جاتی تو فیصلہ ہوجاتا ورنہ اجتہاد ہوتا، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ بحث و مذاکرہ کا سلسلہ جاری رکھا اور تقریباً چالیس عظیم المرتبت تلامذہ کے ساتھ اجتماعی اجتہاد اور قیاس کا سلسلہ جاری رہنا یہ مشہور و معلوم ہے، عالمگیرؒ نے اپنے فتاوی عالمگیریہ مرتب کرنے کے لئے علماء کو جمع کیا، اس زمانہ میں حالات بدلے ہوئے تھے، نئے مسائل پیدا ہوئے تھے انہیں کو حل کرنے کی ضرورت تھی، اس لئے فتاویٰ عالمگیریہ مرتب ہوا۔ اس زمانہ کے فقہاء کی جلیل القدر جماعت مقرر کی گئی۔ ''مجلۃ الاحکام العدلیۃ'' خلافت عثمانیہ ترکی میں مرتب ہوا۔ یہ بھی علماء کرام ہی کی ایک عظیم جماعت نے مرتب کیا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا فقہی حل معلوم کرنے اور نکالنے کے لئے متعدد حضرات کو ''الحیلۃ الناجزۃ'' کی ترتیب کا حکم فرمایا جس میں میرے والد ماجد اور مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی شامل تھے، لیکن اس فتویٰ کو شائع

نہیں کیا جب تک کہ ہندوستان کے تمام ارباب افتاء سے مراجعت نہیں ہوگئی، اور اصحاب افتاء کی آراء اور تنقیدیں حاصل نہیں ہوگئیں، حرمین شریفین کے فقہاء سے خط و کتابت ہوئی ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا۔ میرے والد محترم فرماتے تھے: ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو درپیش ہیں، یا ملک کے تمام مسلمانوں کو درپیش ہیں، ان میں انفرادی فتاوی نہیں دیئے جائیں ان میں باہمی مشورہ نہایت ضروری ہے، اور تمام بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے، چنانچہ پاکستان میں بھی حضرت والد ماجد اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو آج بھی موجود ہے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نی نی کے نام سے ، اس مجلس کی طرف سے مختلف رسائل طبع ہوئے ، ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات دو دو سال تک تحقیق ہوتی رہی۔

میں عرض کروں کہ اپنے بزرگوں نے ہمیں یہ طریقہ بھی بتلایا کہ ان مسائل کی تحقیق اور اپنے خیالات پر تنقید سننے کے معاملہ میں کتنا وسیع الظرف ہونا چاہئے، میں اور میرے بھائی مولانا تقی عثمانی اس زمانہ میں جب یہ مجلس اعضاء انسانی کی پیوندکاری کے مسئلہ پر اور پراویڈنٹ فنڈ (P.F) اور دوسرے مسائل پر تحقیق کر رہی تھی، درجہ تخصص فی الافتاء میں تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ آدمی جو ابھی درس نظامی سے فارغ ہوا ہو اور درجۂ تخصص فی الافتاء میں پڑھ رہا ہو، ایک آدھ نحو کی کتاب بھی پڑھا رہا ہو، اس جیسی مجلس میں وہ کیا مشورے دے سکتا ہے، کیا مدد پہنچا سکتا ہے۔ لیکن ہم دونوں بھائیوں کو اور تخصص فی الافتاء کے طلبہ کو اس مجلس میں والد صاحب علماء کے ساتھ حکما بٹھاتے اور ہم سب کو بحث و تحقیق میں شریک کرتے، اس میں انہوں نے ہمیں اتنا جری بنا دیا تھا کہ جہاں مفتی اعظم پاکستان اور مولانا یوسف بنوری جیسے جلیل القدر علماء گفتگو کر رہے ہوں، مسائل پر بحث کر رہے ہوں، وہاں ہم لوگ صبح سے شام تک کتنی بار ان کی بات پر اعتراض کرتے، ان سے سوالات کرتے، ان دونوں حضرات کو میں نے دیکھا کہ ہماری باتیں ایسا سنتے تھے ہمہ تن گوش ہو کر جیسے کسی پیاسے کے سامنے پانی آ گیا ہو، یہ وجہ نہیں کہ

ہمارے پاس دلائل زیادہ تھے یا تھوڑے تھے، بلکہ وہ ہماری تربیت کر رہے تھے ہمیں بتلا رہے تھے کہ فقہی مسائل میں جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم پورا پورا وقت دیں اور صلاحیتیں خرچ کریں، یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ دوسرے کے غور وفکر کو پوری توجہ اور حق پسندی کے ساتھ سنیں، اس کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اس لئے مجھے یہ امید ہے کہ ہم انشاء اللہ اسی جذبہ کے ساتھ اس سمینار کے تمام مباحث میں حصہ لیں گے کہ ہم ہر ایک کی بات اسی توجہ کے ساتھ سنیں گے جیسے کوئی طالب علم اپنے استاد کی بات سنتا ہے، اس طرح ہم لوگ بہت سارے نتائج تک پہنچ سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انشاء اللہ مدد ہوگی۔

ہمارے بزرگوں کا ایک خاص طرہ امتیاز رہے، بلکہ پوری امت کے علماء اہل سنت والجماعت کے تمام فقہاء کا ایک خاص طرہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے اپنی بات کی پچھ نہیں کی۔ علمی غرور، انانیت اور بات کی پچھ سے بہت دور تھے۔ ہمارے فقہاء کرام اور اپنے تمام بزرگ اور جن بزرگوں کو ہم نے دیکھا اور جن کی جوتیاں سیدھی کیں ان کو بھی ہم نے یہی پایا کہ ایک ادنیٰ طالب علم ان کی کسی بات پر کوئی اعتراض کردے تو نہ صرف یہ کہ ان کو توجہ کے ساتھ سنتے تھے بلکہ اگر سمجھ میں آجائے تو فوراً قبول فرما لیتے تھے اور اپنی بات سے رجوع بھی کر لیتے تھے، چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ نے امداد الفتاویٰ میں حوادث الفتاویٰ کے ساتھ ساتھ ترجیح الراجح کا بھی ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

اور اگر کسی عالم نے کسی مسئلہ میں ان کی کسی خطا کی طرف توجہ دلائی اور حضرت کی رائے تبدیل ہوگئی تو صرف یہی نہیں کہ ان کو خط لکھ دیا کہ میں نے رجوع کر لیا ہے، بلکہ اس کو شائع کیا جاتا کہ میں نے پہلے اس مسئلہ کا جواب یہ لکھ دیا تھا فلاں صاحب کے توجہ دلانے یا بعض حضرات کے توجہ دلانے سے اب میری رائے یوں ہوگئی ہے اور میں پچھلے قول سے رجوع کرتا ہوں، اور اب میرا فتویٰ یہ ہے، اس میں کبھی ان حضرات نے نہ کوئی شرم محسوس کی ہے اور نہ ہی اپنے درجہ میں کمی محسوس کی ہے، ان کے اس اعتراف نے ان کی عظمت میں اضافہ کیا ہے، ہمارے والد ماجد کے فتاویٰ کا مجموعہ امداد المفتین کے نام سے شائع ہوا اس کا تھوڑا سا

حصہ شائع ہوا ہے، اگر مکمل شائع ہو جائے تو بیس پچیس جلدیں ہوں گی، اس میں بھی حضرت نے ایک مستقل باب قائم کیا تھا۔ ’’اختیار الصواب لمختلف الابواب فی ای اگر کسی مسئلہ میں ان کی رائے تبدیل ہو جاتی تو رجوع فرما لیتے تھے، اس بات کو میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اس زمانہ میں ہمارے بزرگوں کی یہ سنت مردہ ہوتی جا رہی ہیں، کسی ایک مفتی کے قلم سے اگر ایک فتویٰ نکل گیا اب یہ بہت کم رہ گیا ہے کہ توجہ دلانے اور خطا ظاہر ہونے پر رجوع کرلیں، اب بھی الحمدللہ ایسے حضرات علماء حق ہیں کہ اگر ان کے سامنے دلائل ان کے معارض آ جائیں تو رجوع کرنے میں ان کو تامل نہ ہوگا، لیکن اب ایسے حضرات بہت شاذ و نادر ہیں، ورنہ ہر ایک اس کوشش میں رہتا ہے کہ میرے قلم سے جو بات نکلی ہے اس کو منوایا جائے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو الحمدللہ دیکھا ہے، اور ان سے سیکھا ہے، پیوند کاری کے مسئلہ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں تقریباً دو سال تک بحث ہوتی رہی ہے بے شمار مسائل آئے ہوئے تھے۔ ان سب کو روکا گیا تھا اور سائلوں کو لکھ دیا گیا تھا کہ اس پر تحقیق ہو رہی ہے، وقت لگے گا۔ جب تحقیق ہو جائے گی تو آپ کو جواب دیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ انسان کا عضو تناسل کاٹ کر دوسرے انسان کو لگانا اگر ممکن ہو جائے تو اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ثبوت نسب وغیرہ کے مسائل۔ حلال و حرام وغیرہ کے مسائل بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے۔ اس بناء پر سوالات کی تحقیق شروع ہوئی اور جواب لکھا۔ اس جواب کا حاصل یہ تھا کہ والد صاحب نے یہ لکھ دیا تھا کہ انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں داخل کرنا حالت ضرورت میں جائز ہے، فروخت کرنا جائز نہیں۔ کوئی شخص اگر پیسوں کے بغیر نہیں دیتا تو دینے والا اگر مجبور ہے تو گنہگار نہیں ہوگا، لینے والا گنہگار ہوگا۔ یہ حاصل تھا اس جواب کا، حضرت والد صاحب کی وفات کے بعد اعضاء انسانی کے متعلق اور بھی عالم اسلام کے دار الافتاؤں سے کچھ فتاویٰ جاری ہوئے جو ہماری نظروں سے گذرے اور ان کو دیکھا، اور بھی کچھ حضرات علماء نے اس میں جو کام کیا تھا اس میں کچھ نئے دلائل ایسے سامنے آئے جن سے ہمیں اس بات کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ اس مسئلہ پر نظر ثانی کی جائے، بہت ممکن ہے کہ جو فتویٰ عدم جواز کا دیا گیا تھا اور پاکستان میں

شائع ہوا تھا ان دلائل کے آجانے کے بعد اس فتویٰ سے رجوع کیا جائے۔ اس فتویٰ پر دستخط کرنے والے جو حضرات موجود ہیں وہ رجوع کرلیں گے اور جو حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ہمیں امید ہے کہ ان کی روحوں کو اس سے تسکین ہوگی۔

میری ان دونوں معروضات کے خلاصہ کے طور پر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اپنی بات کی پچھ اور بات کو ہر قیمت پر منوانے کی کوشش یہ ہر تحقیق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، ہمیں اس سے بچنا چاہئے، اور دوسرے یہ کہ اجتماعی مسائل میں باہمی مشورہ کے بغیر انفرادی فتاویٰ جاری کرنے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے، اجتماعی اجتہاد و قیاس کا جو کام اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے سر لیا ہے وہ عظیم کام ہے۔ مشکل ہے، کٹھن ہے، لیکن وقت کی سب سے بڑی پکار ہے۔ پاکستان میں بھی الحمد اللہ اس سلسلہ میں خاصی پیش رفت اور خاصا کام ہوا ہے۔ میں اس موقع کو مناسب سمجھتے ہوئے اگر گنجائش ہو تو چند منٹ میں اس سلسلہ میں عرض کروں گا کہ کس انداز میں کام چلایا جائے، انفرادی طور پر تو اسی طرح کام چل رہا تھا جیسا کہ یہاں ہندوستان میں بھی الحمدللہ انفرادی طور پر جگہ جگہ کام ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نہیں ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بھی علمائے کرام نے کئی کئی چھوٹی چھوٹی مجالس قائم کی ہیں، جیسے مجلس تحقیقات مسائل حاضرہ۔ لیکن بڑے پیمانہ پر کام کی ضرورت تھی جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء، علماء دیوبند، علماء بریلی، اہلحدیث سب حضرات جمع ہوں، اور ان مسائل کا حل تلاش کریں۔ اس سلسلہ میں سرکاری سطح پر افسوس ہے، ۱۹۷۷ء سے پہلے کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ اللہ رب العالمین کا بڑا احسان تھا کہ پاکستان میں ایسے حالات پیش آئے کہ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کو زمام اقتدار سنبھالنی پڑی، جب وہ آئے تو ہم سب لرزہ براندام تھے کہ ایک فوجی جنرل آرہا ہے پتہ نہیں کس مزاج و مزاق کا انسان ہوگا، کس راستہ پر چلے گا۔ لیکن جب اس کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ الحمدللہ یہ اپنے بزرگوں کا تربیت یافتہ ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے انہیں خاص عقیدت اور گرویدگی تھی، ان کا پورا خاندان ان کے بہنوئی حضرت تھانوی سے بیعت تھے، انہوں نے الحمدللہ بڑے بڑے دو کام کئے ایک اسلامی

نظریاتی کونسل، جودستور کی رو سے پہلے سے ضروری تھی اور پہلے سے موجود تھی لیکن اس میں علماء کو نہیں رکھا گیا تھا، اس میں انہوں نے یہ کیا کہ اچھے ماہر علماء کو اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل کیا، مولانا یوسف بنوری، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا تقی عثمانی صاحب میرے بھائی اور بڑے بڑے علماء کرام کو اس میں شامل کیا اور ان کی ہمت افزائی کے لئے ان سے کہہ دیا کہ آپ کو جن وسائل کی ضرورت ہوگی وہ سب آپ کو فراہم کئے جائیں گے، پس جو کام آپ حضرات اسلامک فقہ اکیڈمی سے کررہے ہیں، الحمدللہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل نے کئی سال بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کیا۔ اور جو مسائل درپیش تھے ان کو حل کیا، لیکن ان کا کام زیادہ تر قانون سازی سے متعلق تھا کہ ان میں کیا کیا تبدیلیاں لائی جائیں، اگر چہ وہ بھی بہت بڑا کام تھا، کونسل کے ذمہ ضیاء الحق صاحب نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ بینکنگ کو سود سے پاک کرنے کے لئے اور مالیاتی نظام کو سود سے پاک کرنے کے لئے تجاویز دیں، اسلامی نظریاتی کونسل نے ایک (پینل مقرر کیا، جس میں متبحر علماء بھی تھے اور بینک کے ماہرین معاشیات بھی۔ اقتصادیات کے جدید ترین ماہرین بھی تھے اور سرکاری ذمہ داریوں کی بناء پر وہ اس بات پر مامور تھے کہ اس کام میں حصہ لیں) پینل نے تقریباً ایک دو سال تک شب وروز محنت کر کے اسلامی بنک کاری اور بلاسودی بینک کاری کے اوپر ایک مفصل اور جامع رپورٹ تیار کی، یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ الحمدللہ رب العالمین پورے عالم اسلام میں اور تمام اسلامی ممالک میں اور صرف مسلم ممالک ہی میں نہیں بلکہ جہاں بھی مسلمان آباد ہیں ان میں اب یہ جذبہ قوت سے پیدا ہورہا ہے کہ سود جس کو اللہ رب العالمین نے اعلان جنگ قرار دیا ہے اس سے کسی طریقہ پر جان چھڑائی جائے۔

مجھے یہ بتانے میں مسرت ہورہی ہے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے جو رپورٹ تیار کی ہے، اسلامی اور بلاسودی بینک کاری کے بارے میں وہ اس وقت تک جتنی رپورٹیں عالم اسلام میں تیار ہوئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ جامع اور بہتر رپورٹ ہے۔ صدر صاحب مرحوم نے اس رپورٹ کے مطابق وزارت خزانہ کو حکم دیا کہ اس رپورٹ کے مطابق

عمل درآمد کیا جائے، اور ہمارا پورا مالیاتی نظام سود سے پاک ہوجائے، لیکن یہ ہماری شامت اعمال ہے کہ وزارتوں میں، مالیات کے محکموں میں اوران جیسے اداروں میں جوحضرات ہیں وہ سود کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ان کوادنیٰ قسم کی بھی کوئی کراہت اس میں نظر نہیں آتی بلکہ وہ اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ اس کو چھوڑنے کوان کا دل بھی نہیں چاہتا، اگر کوئی معقول عذر بھی نہ ہو تو چھوڑنے کا جی نہیں چاہتا، اس کی وجہ سے وہ اس مسئلہ پر سوچنے کے لئے تیار نہیں ہیں، وہ رپورٹ وہاں وزارت خزانہ میں پہنچی، وہاں سے اسٹیٹ بینک کے گورنر کے پاس پہنچی، تو اسٹیٹ بینک کے گورنر نے پورے بارہ طریقے بینک کے مقرر کئے،لیکن ان سب بارہ کے بارہ طریقوں کوایسا تحریف زدہ کردیا کہ نام تو ہوابلا سودی بینک کاری کا،مگر سود جوں کا توں برقراررہا، اس کی شکایت علماء کرام نے کی۔ہم نے بھی بار بارعرض کیا،ضیاء الحق صاحب سے کہ آپ یہ کام نہ کریں کہ حلال بینک کاری کے نام سے سودی بینک کاری کریں، اس سے بہتر تو وہ تھا کہ لوگوں کومعلوم تو تھا کہ وہ حرام کررہے ہیں اور حرام کھارہے ہیں، اس میں حرام کھائیں گے، حلال سمجھ کر کھائیں گے، اس کی اصلاح کی جائے، وہ بے چارے یہ کہتے تھے کہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے علماء کواوروزارت خزانہ کےلوگوں کو پھر جوڑ کر بیٹھاؤں گا۔لیکن موقع میسر نہ آسکا یہاں تک کہ مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوگئی اور وہ انتظام حکومت سے الگ ہوگئے، صدر ضیاء الحق بحیثیت صدر برقراررہے لیکن انتظام حکومت جمہوری حکومت کے پاس آگیا، پھر ۲۹رمئی ۱۹۸۸ء میں پچھلے سال انہوں نے اسمبلی توڑ کے مسلم لیگ کوتوڑااور دو کمیشن انہوں نے بنائے ایک اسلامی اقتصادی کمیشن، ایک اسلامی تعلیمی کمیشن، اسلامی اقتصادی کمیشن کواب کی انہوں نے طاقت ور بنادیا۔اسلامی نظریاتی کونسل سے بدرجہا طاقت ور بنایا۔اس معنی کے لحاظ سے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ذمہ توصرف اتنا کام تھا کہ وہ سفارشات پیش کرسکے۔اس کمیشن کو یہ اختیار بھی دیا کہ مالیاتی ادارے جس پر اسٹیٹ بینک اور پاکستان کے تمام بینک شامل تھے، ان تمام اداروں پر اسلامی اقتصادی کمیشن کونگراں مقرر کیااور یہ اقتصادی کمیشن صرف پانچ افراد پر مشتمل تھی، جس میں مجھ ناکارہ کوبھی رکھا تھا، اورایک اسٹیٹ بینک کے گورنر، وائس

دوسرا باب

بینک انٹرسٹ اور سودی لین دین

اکیڈمی کا فیصلہ:

تجارتی سود اور اسلامی شریعت

سود کے سلسلے میں بحث ومباحثہ اور غور وفکر کے بعد اس ایوان کی متفقہ رائے حسب ذیل قائم ہوئی:

سود خواہ ذاتی مصارف کے قرضوں پر لیا دیا جائے یا تجارتی وکاروباری قرضوں پر، شریعت اسلامیہ کی نظر میں بہر حال حرام ہے۔ یہ سمجھنا کہ سود کی حرمت کا اطلاق تجارتی وکاروباری قرضوں پر نہیں ہوتا قطعاً غلط ہے۔ نیز یہ خیال کہ تجارتی وکاروباری قرضوں کا وجود زمانہ نزول قرآن میں نہیں پایا جاتا اس لئے حرمتِ ربوا کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا، کسی طرح درست نہیں۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین عرب جاہلیت نیز ان قوموں میں جن سے جاہلی عربوں کے تجارتی روابط تھے رائج اور شائع تھے، چنانچہ تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین تحریم ربوا کا اولین مورَد ہے۔ اس کے علاوہ بالفرض اگر تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین کا وجود زمانۂ نزولِ قرآن میں نہ بھی پایا جاتا تب بھی مستقل شرعی دلائل دونوں قسم کے قرضوں (ذاتی وشخصی اور تجارتی و کاروباری) پر اضافے، یعنی سود کی حرمت کے بارے میں قائم ہیں، قرآن وسنّت، اجماع و قیاس اور امت محمدیہ کا عمل متوارث سب یہی بتاتے ہیں کہ حرمتِ ربوا کے بارے میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ قرض لینے دینے کا مقصد اور محرک کیا ہے؟

سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد

تک کم ہے یا مناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہو، اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز۔ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا، دونوں صورتیں بہرحال حرام ہیں، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔

دارالاسلام — دارالحرب اور مختلف ممالک کی حیثیت کا تعین:

دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز، یا یہ کہ دارالحرب میں سود کے ثبوت کی ضروری شرط اموال کا معصوم ہونا موجود نہیں، اس لئے دارالحرب میں سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا، اور آیا ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں، اور یہ کہ ہندوستانی جمہوریہ دارالکفر ہوتے ہوئے بھی ان ممالک کی فہرست میں آتا ہے یا نہیں جن میں اموال معصوم نہیں رہتے، یہ اور اس طرح کے دیگر سوالات پر سیمینار میں غور کیا گیا اور مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا، اگرچہ سیمینار میں عام رجحان یہ رہا کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں سودی کاروبار کے جواز کا فتوی نہیں دیا جاسکتا، لیکن پھر بھی مقالات اور مباحثات میں آنے والے مختلف نقاط نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے ایسی کمیٹی تشکیل کئے جانے کی سفارش کرتا ہے جس میں محقق علماء وفقہاء کے علاوہ ماہرین علم سیاست، دستوری قوانین اور بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قوانین کے ماہرین کو شریک کیا جائے، یہ کمیٹی اس کا جائزہ لے کہ اسلام کی دستوری ہدایات اور اسلامی قانون بین الممالک کی روشنی میں آج کے مختلف نظام ہائے حکومت کو کتنی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اور ان کے علیحدہ علیحدہ کیا حکم ہوں گے، اس سلسلے میں دو ممالک کے باہمی تعلقات اور ان میں سے ایک کے لئے دوسرے کی حیثیت اور ساتھ ہی خود اس ملک میں بسنے والی مسلم آبادی کی اپنے ہم وطنوں اور اپنے ملک کی حکومت کے ساتھ تعلقات کی قانونی نوعیت شرع اسلامی کی روشنی میں کیا ہونی چاہیے۔

یہی کمیٹی اس پر بھی غور کرے کہ کیا کچھ ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں معاملات ربویہ اور عقود فاسدہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ جائز قرار دیئے جائیں۔

غیر سودی بینک کاری کے لئے پروجیکٹ کی تیاری:

دوسرا فقہی سیمینار، سودی معاملات سے متعلق غور وفکر کے ذیل میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ غیر سودی بینک کاری اور مقامی سطح پر ایسی سوسائیٹیز کا قیام جو غیر سودی بنیادوں اور جائز شرعی عقود و معاملات کی بنیاد پر سرمایہ کاری اور امداد فراہم کرنے کا کام کرے مفید ہوسکتا ہے، بشرطیکہ ان کاموں کی انجام دہی کے لئے ایسے نظام سامنے ہوں، جو شرع سے متصادم نہ ہوں، اس وقت ملک میں ایسی مختلف کوششیں جاری ہیں لیکن ان کوششوں میں باہم تنظیم اور یکسانیت کا فقدان ہے، یہ سمینار ضروری سمجھتا ہے کہ جدید بینکنگ کے اصولوں اور شریعت کے احکام کو سامنے رکھتے ہوئے غیر سودی بینک کاری کا ایک جامع منصوبہ (Project) تیار کیا جائے جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو سود کی حرمت سے بچائے اور ان کو معاشی استحکام بخشے، بلکہ دیگر پسماندہ اور کمزور انسانی طبقات کو بھی سہارا دے سکے، جو امت رحمۃ للعالمین کا فریضہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے ایسے خاکہ اور منصوبہ (Project) کی تیاری کے لئے علماء وفقہاء، نیز بینکنگ اور معاشیات کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے۔

سود سے متعلق مسائل:

دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ مورخہ ۸/تا۱۱/دسمبر ۱۹۸۹ء میں سودی قرض سے متعلق سوالات زیر بحث آئے۔ احکام شرع، قواعد فقہ اور نظائر، نیز زمانہ کے حالات و مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل امور پر اتفاق کیا گیا:

۱- ربوا (سود) قطعی حرام ہے، اور جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲- سود ادا کرنے کی حرمت بذاتِ خود نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سودخواری کا ذریعہ ہے، اس لئے بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ کون سا عذر معتبر ہے اور کون سے نہیں، اور کون سی حاجت قابل لحاظ ہے اور کون سی حاجت قابل لحاظ نہیں۔ اس سلسلہ میں معتمد اصحاب افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

۳- ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں، جس میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے۔ اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے۔ اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ (Subsidy) کے مساوی ہو، یا اس سے کم ہو، تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

۴- ہندوستان میں حکومت جب اراضی مملوکہ کو اِکوائر کرتی ہے (یعنی بحکم سرکاری وہ اراضی مفاد عامہ کے لئے جبراً خریدی جاتی ہیں) اور حکومت اس کی قیمت مالکان اراضی کو اپنے ضابطوں کے پیش نظر اپنی منشاء کے مطابق ادا کرتی ہے۔ مالکان اراضی سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں، عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکان اراضی کو اکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں۔ سیمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ قیمت کا جزء ہے جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

۵- سرکاری بینکوں سے ملنے والے ترقیاتی قرضوں اور ان میں ادا کئے جانے والے سود کے مسئلہ پر ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں غور کر کے کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے یہ سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے علماء و متخصصین کی ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے، جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ تک پہنچے۔

''بینک انٹرسٹ نی نی کے سود ہونے پر شرکاء سیمینار کا اتفاق ہے، انٹرسٹ کی رقم بینک سے نکالی جائے یا چھوڑ دی جائے؟ نکال لی جائے تو کس مصرف میں خرچ کی جائے؟ اس سلسلہ میں درج ذیل امور طے پائے:

۱– بینکوں سے ملنے والے سود کی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے، بلکہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے۔

۲– بینک کے سود کی رقم کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر خرچ کر دیا جائے اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳– سود کی رقم مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

۴– اکثر شرکاء سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہیے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

بینک انٹرسٹ وسودی لین دین

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

قرآن وسنت میں ربوا کی حرمت جس شدت وقطعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، دوسری طرف موجودہ ربوا کے بینکنگ نظام نے ایسی صورت حال پیدا کردی ہے کہ سماج کے اکثر افراد خصوصا اعلی اور متوسط طبقہ کا بینکوں سے برابر واسطہ پڑتا ہے، بینکوں سے معاملات پڑنے کی وجہ سے ربوا کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن کے بارے میں عصر حاضر کے بابصیرت فقہاء اور ارباب افتاء کا اجتماعی فیصلہ امت مسلمہ کے سامنے آنا چاہئے، اسی طرح حکومت ترقیاتی اسکیموں کے تحت قرضے تقسیم کرتی ہے اور ان قرضوں پر کچھ سود بھی وصول کرتی ہے، ان ترقیاتی قرضوں کے بارے میں جو فقہی سوالات ابھرتے ہیں وہ بھی اصلا ربوا ہی کے مسئلہ سے مربوط ہیں، اس نوعیت کے بہت سے مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ ربوا کے بارے میں چند اصولی باتیں طے کر کے اہم سوالات کے شرعی جوابات دیئے جائیں، اس پس منظر میں مندرجہ ذیل سوالات وتنقیحات جواب وتحقیق کے لئے پیش خدمت ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اہم سوال یا تنقیح رہ گئی ہوتو اسے بھی شامل کرلیں۔

۱۔ ربوا کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا دائرہ کیا ہے؟

۲۔ کیا دار الحرب میں سودی معاملات، حقیقت قرار نہیں دیئے جاسکتے، اس وجہ

سے کہ اموال اہل حرب معصوم اور قابل ضمان نہیں، اور سود کے تحقق کے لئے بدلین کا معصوم و متقوم ہونا ضروری ہے، لہذا اس شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے حقیقت ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوگا اگرچہ وہ معاملات صورۃً سودی معاملات ہوں؟

۳– دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کیا ہے اور شرطیں کیا ہیں، اور کیا موجودہ حالات میں ''دارثنی'' کا حصر دارالاسلام اور دارالحرب میں درست ہے، کیا ہندوستان (جیسا ملک جہاں ایک دستوری حکومت، تمام شہریوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر قائم ہے اور قانونی و دستوری نقطۂ نظر سے بلا تفریق مذہب وزبان وعلاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کے وسائل آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق ہے) دارالحرب ہے؟ اگر دارالاسلام اور دارالحرب کے علاوہ دار کی کوئی تیسری قسم ہے تو وہ کیا ہے اور اس کی شرطیں کیا کیا ہیں؟

۴– بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا بینکوں سے لینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، اور لینے کے بعد اسے کس مصرف میں خرچ کیا جائے، سرکاری بینکوں اور غیر سرکاری بینکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق ہے؟

۵– سود لینے اور دینے کے حکم میں کیا کوئی فرق کیا جا سکتا ہے، اور کیا غیر اسلامی ملک میں واقعی کچھ ایسی مجبوریاں ہو سکتی ہیں جن کی بنیاد پر سود دینا جائز ہو؟

۶– کیا سودی قرضے لینے کی کسی حال میں شرعاً گنجائش ہے؟ کن حالات اور کن مجبوریوں کے تحت مسلمان کے لئے سودی قرض لینا جائز ہو سکتا ہے؟

۷– حکومت ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی، صنعت وحرفت کی ہمت افزائی نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جو سودی قرضے تقسیم کرتی ہے اس کا لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح ہے یا اس سے کچھ مختلف

ہے؟

کیا اس بنیاد پر حکومت کے سودی قرضوں کا لینا جائز قرار پاسکتا ہے کہ حکومت ہند ترقیاتی قرضوں کے لئے جو رقم مختص کرتی ہے وہ اس کی مختلف ذرائع سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جمہوری حکومت کے خزانہ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے، اس خزانہ عامہ میں سے جو رقم ترقیاتی اسکیموں کے لئے مختص کی گئی ہے، اس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حق حاصل ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لئے جب آگے بڑھتا ہے تو ان قرضوں پر سود عائد کرنے کی پالیسی آڑے آتی ہے، لہذا جس طرح اپنا حق وصول کرنے کے لئے بہت سے فقہاء نے رشوت دینے کو جائز کہا ہے اسی طرح یہاں حق وصول کرنے کے لئے مجبوراً سود دینے کی اجازت کیوں نہ دی جائے؟

۸- اگر حکومت کسی قرض پر کوئی چھوٹ بھی دیتی ہو اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہو تو اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہے تو کیا اس قرض لینے کو شرعاً جائز کہا جائے گا؟

۹- غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں بسا اوقات سود ادا کئے بغیر چارہ نہیں، مال کی روانگی کے دن سے ہی سود لگا دیا جاتا ہے اور اسی طرح اگر کوئی تاجر دیگر ممالک کو مال برآمد کرے تو بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت اسے سود ملتا ہے، درآمد برآمد کی اس تجارت میں سود سے نجات مشکل ہے، ان صورتوں کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

۱۰- بینک دو طرح کے ہیں ایسے بینک جس کے مالک اشخاص و افراد ہوتے ہیں اور دوسرے سرکاری بینک جو حکومت کی ملکیت ہے، کیا قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں دونوں قسموں کے بینکوں کے حکم میں کچھ فرق ہوگا؟

۱۱- کچھ افراد یا کمپنیاں سرمایہ کرتی ہیں یعنی صنعت وحرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں اور اس پر سود لیتی ہیں، مثلاً کوئی شخص اگر ٹرک حاصل کر کے چلانا چاہتا

ہے تو وہ اپنی پسند کا ٹرک خریدتا ہے، سرمایہ کار اس کی قیمت ادا کرتا ہے اور قسط وار اپنا سرمایہ مع سود وصول کر لیتا ہے، سرکاری بینکوں سے سرمایہ حاصل کرنے میں ضابطہ کی خانہ پوری طول عمل کا موجب ہوتی ہے، دوسری طرف رشوت دینی پڑتی ہے، تیسری طرف انکم ٹیکس وغیرہ کے مسائل ہوتے ہیں، ان سے بچنے کے لئے عام طور پر تاجر و صنعت کار پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے معاملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیا کسی مسلمان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ ان پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے اپنی صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے سرمایہ حاصل کرے اور اس پر سود ادا کرے، واضح رہے کہ یہ صورت حاجت واضطرار کی نہیں ہے۔

☆☆☆

ضمیمہ سوال نمبر ۲:

بعض معاملات جو سودی معاملات کہے جاتے ہیں

کیا وہ بہ اعتبار شرع بھی سودی معاملات ہیں

سید امین الحسن رضویؒ ☆

سود کو اسلام نے مطلقاً حرام قرار دیا ہے، یہ بات شبہ کی ادنی ترین رمق سے بھی پاک ہے ،دوسری بات یہ کہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب، خواہ جسے انگریزی میں (INTEREST) کہا جاتا ہے، یا وہ جس کے لئے انگریزی کا لفظ (USUARY) ہے، اپنی تمام صورتوں میں حرام ہے،شرح سود کی کمی بیشی یا شرائط ادائیگی میں سختی یا سہولت کے عوامل سود کی مطلق حرمت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتے، اسلام کی نظر میں یہ اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی طرح کا وسیع الاطراف گناہ کوئی اور نہیں،یعنی سود کا لینے والا دینے والا سودی معاملہ کی دستاویز لکھنے والا اور اس پر گواہ بننے والا، سب کو یکساں درجہ کا گناہ ہوگا،مزید یہ بات بھی اہم ہے کہ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو بعض شرائط کے تحت خنزیر پالنے کھانے شراب کشید کرنے اور استعمال کرنے حتی کہ اپنے منادر وکلیسا بنا کر شرک جیسا شریعت کی نظر میں نا قابل معافی گناہ کرنے تک کی آزادی شریعت عطا کرتی ہے،لیکن نہیں اجازت ہے تو ان غیر مسلموں کو آپس میں سودی لین دین کرنے کی،خواہ وہ اہل ذمہ ہوں یا معاہد ومستامن۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سود اپنی ہر شکل میں مطلقاً حرام ہے،اس میں

☆فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، تغلق آباد۔

مجھے کوئی شبہ نہیں، لیکن شبہ مجھے ان معاملات کے بارے میں ہے جنہیں سودی معاملہ تو کہا جاتا ہے لیکن مجھے اطمینان نہیں کہ وہ بہ اعتبار شرع بھی سودی معاملات کہلائے جا سکتے ہیں، میری معروضات کی بنیاد یہ اصول ہے کہ سود وہ ہے جو بہ اعتبار شرع سود ہو نہ کہ وہ جسے لوگ سود کہتے ہوں، اور اسی طرح ہر وہ معاملہ سودی معاملہ ہوگا جو بہ اعتبار شرع سودی معاملہ ہو، خواہ دنیا اسے سود نہ کہے، میں چند مثالوں سے اپنے مدعا کو واضح کرتا ہوں۔

۱— پورے ہندوستان میں قانون حصول اراضی LAND ACQUISITION (ACT نافذ ہے، اس قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار رہے کہ وہ کسی بھی جائداد غیر منقولہ مثلاً اراضی، باغات مکانات وغیرہ کو جب چاہے مفاد عامہ کی ضرورت کے پیش نظر مالک جائیداد کی رضامندی کے بغیر بہ ادائیگی معاوضہ حاصل کرسکتی ہے، عملی طور پر اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی تو یہ کہ حکومت پہلے اس بات کو مشتہر کرتی ہے کہ فلاں جائداد مفاد عامہ کے پیش نظر حکومت حاصل کرنا چاہتی ہے، جن لوگوں کو اس پر ادعاء ملکیت ہو وہ رجوع ہوں، اور اس جائیداد کی بازاری قیمت کے بارے میں اپنا تخمینہ پیش کریں، اس کے بعد افسر متعلقہ چند رہنما اصولوں کی روشنی میں اس جائیداد کی قیمت متعین کرتا ہے اور وہ رقم مالک کو پیش کی جاتی ہے اور پھر حکومت اس جائیداد کو اپنے قبضے میں لیتی ہے۔ اگر مالک جائیداد اس رقم سے غیر مطمئن ہو تو وہ درخواست دیتا ہے کہ تعین قیمت کے لئے معاملہ سپرد عدالت کردیا جائے، پھر عدالت تحقیقات کا عمل شروع کرتی ہے اور شہادت لے کر خود قیمت کا تعیین کرتی ہے۔ عدالت جس کا تعین کرتی ہے وہ اگر حکومت کی تعین کردہ مالیت سے زیادہ ہو تو عدالت یہ بھی حکم دیتی ہے کہ اس کی متعین کردہ قیمت اور حکومت کی مقررہ کردہ قیمت میں جتنا فرق ہے اس قیمت پر اس مدت کے لئے چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود بھی ادا کیا جائے جو مقدمہ کے سپرد عدالت ہونے کے بعد سے عدالت کے فیصلے تک اور اس کے بغل میں حکومت کی طرف سے بقیہ رقم مالک جائیداد کو ادا ہونے تک گذرے، یہ مدت بالعموم دو یا تین سال ہوتی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت

کو اگر جائیداد کے حاصل کرنے کی فوری ضرورت ہوتی ہے تو حکومت صرف ایک اعلان جاری کر کے جائیداد پر فوراً قبضہ کر لیتی ہے اور بعد کو اس جائیداد کے مالکوں کو طلب کرنے اور ان سے اس جائیداد کی مالیت کا تخمینہ حاصل کرنے اور پھر خود جائیداد کی مالیت کا تعین کرنے کا عمل شروع کرتی ہے جس کے مکمل ہونے تک دو سال کا عرصہ گذر ہی جاتا ہے اس کے بعد افسر بالآخر متعلقہ مالیت کا تعین کرتا ہے، تو قانوناً یہ لزوم ہے کہ جائیداد پر قبضہ کئے جانے والی تاریخ سے مالیت کا تعین کئے جانے کی تاریخ تک کے عرصہ کے لئے اس پوری قیمت پر چھ فیصد سالانہ شرح سے سود بھی قیمت میں شامل کرے اس کے بعد عدالت سے رجوع کرنے کا وہی عمل بھی ہوسکتا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس جائیداد کی اصل قیمت پر یہ جو زائد رقم بعنوان ''سود'' نی قانوناً دی جاتی ہے، کیا وہ شریعت کی نگاہ میں بھی سود اور نتیجۃً حرام ہے؟ ایک تو یہ کہ اس پورے معاملہ میں نہ تو معروف معنی میں راس المال ہے اور نہ ہی قرض کا کوئی عنصر۔ دوسرے یہ کہ اس معاملہ کی مذکورہ اول صورت میں یعنی جبکہ حکومت نے جائیداد پر قبضہ کر لیا ہو اور بعد کو تعین قیمت کا عمل شروع کر کے سال دو سال بعد قیمت ادا کرے، تو کیا بعنوان سود دیئے جانے والی اس اضافی رقم کو مالک جائیداد کی اپنی ملکیت سے حق انتفاع سے اس مدت کے لئے محروم رہنے کا معاوضہ نہیں سمجھا جاسکتا، مان لیجئے کہ ایک اسلامی حکومت میں ایسا ہی حصول اراضی کا قانون نافذ ہو بس اس فرق کے ساتھ کہ موجودہ قانونی اضافہ کو سود لینا اور بعنوان سود ادا کرنا ہے، اسلامی حکومت کا قانون اسی اضافہ رقم کو حق انتفاع واستفادہ سے محرومی کا معاوضہ کہے تو کیا اسلامی حکومت کے قانون کے تحت اس عنوان سے یعنی بعنوان حرجانہ دیا جانے والا اضافہ سود نہ ہوگا اور حکومت کے لئے اس کا دینا اور مالک جائیداد کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا؟

اگر جواب اثبات میں ہو تو وہی اضافی رقم جو موجودہ قانون کے تحت بعنوان ''سود'' نی

دی جاتی ہے، وہ اپنی عین میں سود نہیں ہے اور اس کا لینا بھی جائز ہونا چاہئے، اس معاملہ کی اوپر مذکورہ صورت دوم کے بارے میں بھی بعنوان ''سود نی نی دی جانے والی زائد رقم کے تعلق سے بھی میرے شبہہ کی یہی بنیاد ہے کہ آج جو قیمت مالک جائیداد کو ادا کی گئی لیکن ایک عرصہ بعد عدالت نے اس کو غیر واجبی قرار دے کر اس میں اضافہ کر دیا اور اضافہ شدہ رقم اور پہلی دی ہوئی رقم کے فرق پر چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود کے عنوان سے دلوائی تو کیا بہ عنوان ''سود نی نی دلائی گئی اس زائد رقم کو حقیقی وصول طلب رقم اور اس کے استفادہ سے اس عرصہ میں محروم رہنے کا معاوضہ یا حرجانہ قرار نہیں دیا جا سکتا؟ اور اگر کوئی اسلامی حکومت اپنے قانون میں اس زائد رقم کو معاوضہ یا حرجانہ قرار دے کر ادا کرنے کی گنجائش رکھے تو علماء اسے شرعاً سود قرار دے کر اس کے حرام ہونے کا فتوی دیں گے؟

مذکورہ بالا مثال میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس صورت میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہے جو سود کی تقریباً تمام ہی صورتوں میں موجود ہوتا ہے۔

۲ — (دوسری مثال) فلاحی ریاست کے تصور کے تحت حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو زرعی ترقیاتی قرضے دیئے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا کہ ملک کی بڑھتی ہوئی غذا کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے، اور دوسرے ملکوں سے غلہ درآمد کرنے کی ضرورت نہ رہے، اور نتیجہ بیرونی زرمبادلہ کی بچت ہو وغیرہ، یہ قرضے مثلاً سینچائی کی غرض سے کنویں کھودنے، ٹیوب ویل لگانے، اور ٹریکٹر وغیرہ خریدنے کے لئے دئے جاتے ہیں، اور ایک مقررہ شرح سود کے ساتھ قسطوں پر واپس لئے جاتے ہیں۔ ان قرضوں کے لئے وصول ہونے والی درخواستوں کی تنقیح سے لے کر درخواست گذار کو رقم کی ادائیگی اور پھر اس کی بالاقساط واپس وصولی تک کے عمل میں متعدد سرکاری اعمال کی کارکردگی شامل ہوتی ہے اور بحیثیت مجموعی اس شعبہ کے نظم کے لئے حکومت کو خاصے مصارف برداشت کرنے ہوتے ہیں، جب کہ ان قرضوں کو دینے سے حکومت کا مقصد نفع کمانا ہرگز نہیں ہوتا۔

میرا سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں حکومت اپنے رأس المال پر مدت کے معاوضے میں جو اضافی رقم ایک متعین شرح سے بعنوان سود وصول کرتی ہے، اس کی بجائے اگر وہ اس زائد رقم کو انتظامی مصارف قرار دے کر وصول کرے، جبکہ فی الواقع اس معاملہ میں حکومت پر مصارف کا اچھا خاصا بوجھ پڑتا ہی ہے، تو کیا راس المال پر وہ اضافہ شرعاً جائز ہوگا اور مسلمانوں کے لئے اس نظم کے تحت قرض لینا اور کچھ اضافہ کے ساتھ واپس کرنا مباح ہوگا؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو کیوں نہ اسی پر موجودہ صورت معاملہ کو قیاس کرتے ہوئے بعنوان سود وصول کی جانے والی رقم کو انتظامی مصارف سمجھ کر مباح قرار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کر دوں، چند برس ہوئے کہ ایشیا کی ترقیاتی بینک (ASIAN DEVELOPMENT BANK) کے ایک ڈائریکٹر سے جو پاکستانی تھے میری گفتگو ہو رہی تھی، انہوں نے مجھے بتایا کہ بعض مسلم ملکوں کی حکومت نے بینک سے نمائندگی کی کہ بینک چونکہ سود پر قرض دیتا ہے اس لئے اس بینک سے سود لینے پر ان کے ملک کے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اعتراض ہے، اس پر بنک نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ رأس المال پر اضافہ کو بجائے سود کے انتظامی مصارف SERVICE CHARGE & ADMINISTRATIVE کا عنوان دے گا جبکہ بینک کا نظام جوں کا توں باقی رہے گا۔

۳— انڈین آئیل کارپوریشن مرکزی حکومت کا ایک تجارتی ادارہ ہے، اسے اندرون ملک نکلنے والے پٹرول اور گیس وغیرہ فروخت کی اجارہ داری حاصل ہے، اور اس میدان میں کوئی اس کا حریف نہیں ہے، اس کارپوریشن میں کچھ رقم حکومت کی لگی ہوئی ہے اور کچھ رقم پبلک کی ہے جو اس کارپوریشن کے حصص SHARE فروخت کرنے کی شکل میں کارپوریشن کو ملی ہے، اس مشترکہ سرمایہ سے یہ کارپوریشن اپنا کاروبار کرتا ہے، لیکن کارپوریشن کے حصص مضاربت کے اصول پر فروخت نہیں کئے جاتے بلکہ کارپوریشن انہیں متعین حصص کی مالیت پر سودا کرنے کے اقرار سے فروخت کرتا ہے، اور ختم سال پر اسی شرح سے حصص کے مالکوں کو سود ادا کر دیا

جاتا ہے، یہ کارپوریشن سال کے ختم ہونے پر سال بھر کے نفع ونقصان کا میزانیہ بھی تیار کر کے مشتہر کرتا ہے، میرا یہ سوال ہے کہ اگر ایک مسلمان اس کارپوریشن کے حصص کے خریدتے وقت دل میں یہ نیت رکھے کہ وہ اسلامی اصول مضاربت کے تحت سرمایہ کاری کر رہا ہے اور ختم سال پر جب کارپوریشن کا بیلنس شیٹ BALANCE SHEET اس کے سامنے آئے گا تو اگر اسے پتہ چلے کہ کارپوریشن کو اس سال خسارہ ہوا ہے تو وہ اس کے حصص پر بعنوان سود ملنے والی رقم نہیں لے گا اور اگر منافع ہوا لیکن باعتبار حصہ رسدی اس سے کم ہوا جتنا کارپوریشن بشکل سود مقررہ سے ادا کر رہا ہے تو وہ صرف اتنا بطور منافع قبول کرے گا جتنا باعتبار حصہ رسدی اس کے حصّہ میں آنا چاہئے، تو کیا اس نیت کے ساتھ ایک مسلمان کا ان حصص کو خریدنا اور منافع اور نقصان کے میزانیہ کی روشنی میں وہ عمل کرنا جس کا میں نے ذکر کیا جائز ہوگا؟

۴— اس سال کی آخری ماہ جولائی یا آغاز اگست میں ہندوستان کے ایک فوجی محمد یونس کے معاملہ کا اخبارات میں چرچا ہوا تھا۔ یہ صاحب ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ میں محاذ پر زخمی ہو گئے تھے اور ایسے زخمی ہوئے تھے کہ فوجی خدمت کے اہل نہیں رہے، چنانچہ انہیں خدمت سے سبکدوش DISCHARGE کر دیا گیا، لیکن واجبات جو از روئے ضوابط ایسی صورت میں محکمہ فوج سے وصول شدنی قرار پائے تھے ادا نہیں کئے گئے، محمد یونس اس بارے میں مختلف محکمہ جاتی سطحوں پر کوشش کرتے رہے اور ہر جگہ ناکام ہو کر بالآخر عدالت میں رجوع ہوئے اور عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دیکر اس رقم کا تعین کیا جو حکومت انہیں ادا کرے اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ ۱۹۶۵ء سے تاریخ ادائیگی تک یعنی تقریباً چوبیس سال کی مدت کے لئے حکومت اس رقم پر چھ فیصد سالانہ شرح سے سود بھی مزید ادا کرے۔

اس معاملہ میں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ محمد یونس کو ادا شدنی جس رقم کا تعین عدالت نے ۱۹۸۹ء میں کیا وہ رقم اصلاً محمد یونس کو ۱۹۶۵ میں واجب الادا تھی، لیکن حکومت کی غفلت کی

وجہ سے ۲۴ سال تک وہ اس رقم سے استفادہ کرنے سے محروم رہے، اور اس عرصہ میں مختلف سطحوں پر اپنے جائز حق کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہے، اور بالآخر عدالت میں رجوع ہونے کے سلسلہ میں جو مالی زیر باری، وقت اور توانائی کا زیاں، اور ذہنی پریشانی میں وہ مبتلا رہے پوشیدہ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسا معاملہ کسی اسلامی حکومت میں پیش آئے اور وہاں بھی شخص متعلقہ کو اتنے طویل مراحل سے ناکام گذرنے کے بعد بالآخر قاضی کی عدالت سے انصاف ملے، اور قاضی یہ حکم دے کہ اصل واجب الاداء رقم کے علاوہ ایک متیعن رقم حکومت اس شخص کو بطور حرجانہ تاوان مزید ادا کرے تو کیا وہ زائد رقم باعتبار شرع سود قرار دی جاسکے گی؟

اگر جواب نفی میں ہو تو کیا محمد یونس کو جو زائد رقم اس معاملہ میں عدالت نے بعنوان سود دلوائی ہے اس کو حرجانہ پر قیاس کر کے اس کے حق میں جائز قرار نہیں دیا جاسکتا؟

☆☆☆

ربوا درحقیقت کیا ہے؟

بروی جماری مہتر

تعارف: یہ مضمون ربوا (سود) شرح سود اور شرح منافع کے درمیان تعلق قائم کرنے کی ایک کوشش ہے تاکہ ربوا اور منافع کو ختم کرنے سے متعلق اسلامی معیشت کے اصول کو بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکے، ان معاشی اختلافی اصولوں کے درمیان یکسانیت اور تضاد پر بھی بحث ہوگی لیکن اس مضمون میں صرف ربوا پر غور کیا جائے گا، دوسرے نکات آئندہ زیر بحث آئیں گے۔

ربوا کے لغوی معنی ہیں اضافہ یا ایزاد، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر اضافہ یا ایزاد برا ہے، اصطلاحی لحاظ سے ربوا جس کا امتناع اسلام کا مدعا ہے اصل پر ادائیگی یا وصولی میں وہ اضافہ ہے جو صحیح متبادل قیمت کا حامل نہیں قطع نظر اس کے کہ یہ مذکورہ اضافہ خواہ نقد کی شکل میں ہو یا جنس کی، اس سلسلے میں الجزری کی ''الفقہ علی المذاھب الاربعہ نی نی سے، جو اسلامی اصول فقہ کے چاروں مؤثر مکاتب خیال یا مسالک سے متعلق قانونی آرا کا لبّ لباب ہے۔ تفصیلی اقتباسات پیش کرنا مناسب ہوگا۔

ربوا کے معنی ہیں وہ اضافہ جو دو متجانس مساویات میں سے ایک پر تبادلہ کی صورت میں بغیر کسی متبادل معاوضہ کے حاصل کیا جائے، اس کی درجہ بندی دو اقسام میں کی جا سکتی ہے، اول ربوا النسیئہ جس میں یہ اضافہ معینہ قیمت کی ادائیگی میں التوا یا تاخیر کے باعث ہوتا ہے، مثال کے طور پر موسم سرما میں ایک ارداب (ایک پیمانہ) گیہوں کی خریداری کے معاوضہ میں

موسم گرما میں ڈیڑھ ارداب گیہوں، چونکہ یہ نصف ارداب جس کا اضافہ معاوضہ میں کیا گیا فروخت شدہ کی مساوی قیمت سے علیحدہ تھا یا زائد تھا اور صرف جنس کی ادائیگی کی تاخیر کے بدلہ میں ادا کیا گیا اس لئے یہ ربوا ہوا، اس کو ''ربوا النسیۂ نی نی کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم ہے ''ربوا الفاضل''، جس کے مطابق مذکورہ اضافہ بلا امتیاز تاخیر ہو اور معاوضہ میں ادا کی گئی کسی چیز پر اثر انداز نہ ہو ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ارداب گیہوں کا تبادلہ ہاتھ کے ہاتھ اسی جیسے ایک ارداب اور ایک قلہ گیہوں سے کیا جائے اور خریدار اور بیچنے والے مال کا باہمی قبضہ حاصل کر لیں، یا جیسے دس قیراط سونے کی کسی چیز کا تبادلہ اسی جیسے سونے کی بارہ قیراط وزنی کسی چیز سے کیا جائے۔

ربوا کی اقسام کو مختلف الفاظ کا جامہ پہنانے کے باوجود تقریباً اسلامی فقہاء اس پر متفق ہیں کہ ربوا قرض اور فروخت دونوں میں استعمال ہوتا ہے، قرض کی صورت میں جو ربوا ہوتا ہے وہ ربوا الدیون ہوتا ہے اور مال کی فروخت کے سلسلے میں جو ربوا ہوتا ہے وہ ربوا البیوع کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں جو تنسیخ ربوا کا فرمان الٰہی ہے وہ ربوا الدیون سے متعلق ہے، اس لئے ربوا الدیون کو ربوا الجاہلیہ، اور ربوا القرآن بھی کہا جاتا ہے، ربوا الدیون کو فقہاء نے ربوا لنسیہ کا نام بھی دیا ہے، کیونکہ الدیون (قبضہ) سے متعلق قرض کی ادائیگی میں اضافہ بوجہ انتظار وقت یا مدت ادائیگی جز ولازم ہے۔

ربوا البیوع کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے، یہ قبل از اسلام کے عربوں کے علم میں بھی نہیں تھا، وہ صرف ربوا الدیون کے ہی عادی تھے، ربوا البیوع کی تنسیخ پیغمبر اسلام ﷺ کی احادیث سے عمل میں آئی، ملحد عربوں کو یہ تنسیخ قابل حیرت محسوس ہوئی، کیونکہ ربوا کے سلسلے میں ان کا تصور صرف ربوا الدیون تک ہی محدود تھا۔ ربوا البیوع کو مزید دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے، (۱) ربوا الفاضل (۲) ربوا النسیۂ۔ ربوا البیوع میں ربوا النسیۂ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ انتظار کا عنصر فروخت کے معاملہ میں بھی موجود ہے۔

چونکہ ربوا الدیون (قرض میں ربوا) ایک جانا مانا مفروضہ ہے، اس لئے اس مضمون میں ربوا البیوع (تجارت میں ربوا) کے کم معروف محمولات پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ ربوا البیوع کے بنیادی حقائق مندرجہ ذیل احادیث سے سامنے آتے ہیں:

۱- سونا برائے سونا مساوی، چاندی برائے چاندی مساوی مساوی، کھجور برائے کھجور مساوی مساوی، نمک برائے نمک مساوی مساوی، جو برائے جو مساوی مساوی۔ اگر تبادلہ میں کوئی زیادہ طلب کرتا ہے وہ ربوا کا ارتکاب کرتا ہے، اگر فوری دست بدست سپردگی کی جائے تو چاندی کے عوض سونا فروخت کرو، اگر فوری دست بدست سپردگی ہو تو کھجوروں کے بدلے جو فروخت کرو (بخاری مسلم)۔

۲- سونے کے عوض سونا، چاندی کے عوض چاندی، گیہوں کے عوض گیہوں، جو کے بدلے جو، کھجور کے بدلے کھجور، نمک کے بدلے نمک، مساوی مساوی اور دست بدست، تم مختلف اشیاء کی تجارت لین دین کر سکتے ہو خواہ وہ دو مختلف نوعیت کی ہوں اور اگر ان کا تبادلہ دست بدست ہو (بخاری و مسلم)۔

یہ عمل جسے عرب ربوا نہیں سمجھتے تھے اسلام میں ربوا قرار دیا گیا ہے، ان احادیث سے مسلم فقہاء نے مندرجہ ذیل اصول وضع کئے جو ربوا البیوع کے دائرہ میں آتے ہیں:

۱- دھات سے دھات یا اشیائے خوردنی سے اشیاء خوردنی مثلاً سونے سے سونا یا کھجور سے کھجور کے تبادلہ میں دو شرائط پوری ہونی ضروری ہیں:

(الف) دونوں اشیاء کی مقدار قطعی مساوی ہو۔

(ب) فوری ادائیگی ہو (یعنی دست بدست)۔

۲- دو مختلف دھاتوں کے تبادلہ یا دو مختلف اشیاء خوردنی کے تبادلہ (مثلاً سونے سے چاندی یا گیہوں سے جو کا تبادلہ) اس میں شرط صرف مال کی ادائیگی کی ہے مساویت کی شرط نہیں ہے۔

۳- دھات سے اناج (مثلاً سونے یا چاندی کا گیہوں یا جو سے تبادلہ) کے تبادلہ کے سلسلے میں مذکورہ بالا دونوں شرائط ختم کر دی گئیں ہیں، ان کی آزادانہ تجارت ہوسکتی ہے خواہ ان میں مساویت ہو یا نہ ہو، مال کی ادائیگی فوری ہو یا تاخیر سے ہو، تبادلہ کی شرائط کی مندرجہ ذیل نقشہ میں تلخیص پیش کی جاتی ہے:

	قیمتی دھاتیں		اشیائے خوردنی			
	سونا	چاندی	گیہوں	جو	کھجور	نمک
سونا	۲	۱	صفر	صفر	صفر	صفر
چاندی	۱	۲	"	"	"	"
گیہوں	صفر	صفر	۲	۱	۱	۱
جو	"	"	۱	۲	۱	۱
کھجور	"	"	۱	۱	۲	۱
نمک	"	"	۱	۱	۱	۲

پیمانہ:۔ صفر- غیر مشروط

۱-فوری ادائیگی کی شرط

۲-مساویت اور فوری ادائیگی کی شرط

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ ربوا النسیہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ربوا الفاضل کا ارتکاب اس وقت ہوتا ہے جب اوپر مذکورہ قواعد میں تحریر اصول مساویت کی خلاف ورزی کی جائے، اس لئے ربوا الفاضل کی تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ یکساں اقسام کی اشیاء کا تبادلہ مقدار میں اضافہ کے ساتھ کیا جائے۔ اس موقع پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ قطعی یکساں مساوی اشیاء کے

تبادلہ کا کوئی مقصد نہیں نکلتا تا آنکہ وہ ماہیتی اعتبار سے مختلف ہوں، پھر مختلف ماہیت کی اشیاء کے تبادلہ میں یکسانیت کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اوپر جو اصول دیئے گئے ہیں وہ لین دین کے اصول کے تبادلہ یعنی پیسے کے بجائے جنس سے جنس کے تبادلہ سے متعلق ہیں، مختلف صفات کی ایک ہی اشیائے تجارت میں ربوا الفاضل سے بچنے کا راستہ لین دین میں پیسے کا استعمال ہے، مسلم اور احمد نے مندرجہ ذیل حدیث ابوسعید خدری کے حوالے سے اس سلسلے میں بیان کی ہے:

ایک دن حضرت بلالؓ رسول اللہ ﷺ کے لئے کچھ برنی کھجوریں (ایک اعلیٰ قسم کی کھجور) لائے، پیغمبر خدا نے دریافت فرمایا کہ یہ کھجوریں کہاں سے لائے۔ حضرت بلالؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس کچھ کمتر درجہ کی کھجوریں تھیں جن کا تبادلہ میں نے مساوی وزنوں کی ان بہتر کھجوروں سے کرلیا۔ پیغمبر خدا نے ارشاد فرمایا ''یہ تو قطعی ربوا ہے ایسا بالکل مت کرو بلکہ جب تم خریدنا چاہو تو اپنی کمتر کھجوریں کسی چیز (نقد) کے عوض فروخت کرو اور اس سے جو قیمت تم کو وصول ہو اس سے بہتر قسم کی کھجوریں خریدلو''۔

اس طرح شریعت کا فیصلہ ہے کہ ایسی اشیاء کے تبادلہ کی صورت میں جو ایک ہی ہوں مگر ان کی صفات مختلف ہوں تو یا تو ان کا تبادلہ اسی ماہیت کی شئی سے بغیر اس کی قیمت کو زیر غور لائے ہوئے کیا جائے یا پھر ان کا تبادلہ ان کے بازاری نرخ کے مطابق روپیہ سے کیا جائے۔

عمر چھپرہ کے نزدیک ربوا الفاضل کا امتناع ایسی اجناس لین دین کی تجارت کے پیشگی تدارک کے لئے ہے جس کے لئے نتیجہ میں ناجائز منافع حاصل ہو، اس کے ساتھ زر نقد کو تجارت یا لین دین کا ذریعہ بنانے کی ہمت افزائی بھی کرنا ہے۔

ربوا النسیئہ کا ارتکاب اس صورت میں ہوتا ہے اگر فوری تبادلہ کی شرط کی خلاف

ورزی ہو، یعنی اگر دو یکساں اشیاء کے تبادلہ میں کسی ایک کی ادائیگی میں تاخیر ہو جائے تو چونکہ اس تاخیر کے باعث وقفہ انتظار میں اس شئے کی قیمت میں اضافہ کا امکان ہو سکتا ہے، اس لئے ان کی طے شدہ متناسب قیمت میں ادائیگی یا حوالگی کی تاریخ تک فرق پیدا ہو جائے گا، اس کا اطلاق مختلف النوع اشیائے تجارت پر ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم سود سے متعلق بحث کو آگے بڑھائیں، ہم کو قرآن پاک کی آیت کی روشنی میں تجارت اور ربوا کے فرق اور عدم یکسانیت کا تجزیہ کر لینا چاہئے۔ قرآن کریم میں سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے: ''وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے روز نہ کھڑے ہوں مگر ایسے جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے، اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود کو''۔

ابن حزم کے مطابق بیع (تجارت) اور ربوا (سود) میں یکسانیت صرف اس حد تک ہے کہ ان دونوں میں شئے کا تبادلہ شئے یا معاوضہ سے ہوتا ہے، تاہم محض باہمی تبادلہ ہی ایک معاہدہ کو جائز یا قانونی نہیں بنا دیتا اس کے لئے اور بھی باتیں قابلِ غور ہیں۔

بیع (تجارت) میں ایک تو خرید ہے اور دوسری ہے فروخت، جو ایک جائز معاشی عمل اور ایک سودمند کوشش ہے، اس میں اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے جیسے مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے یا مال کا تبادلہ زر سے ہوتا ہے۔

ربوا کی بنیاد پر کئے گئے سودے میں اشیائے تبادلہ کے درمیان قیمت کے لحاظ سے کوئی قانونی یا اخلاقی رشتہ نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اس میں پیسہ خود پیسہ میں اضافہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، خواہ یہ سودا طرفین کے باہمی سمجھوتے اور اتفاق سے ہوا ہو۔ اس سودے میں مال کی فروخت میں بغیر کسی معاشی جہت پیسہ کو اپنی قیمت میں اضافہ کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جسے قرآن کریم نے اتنی وضاحت سے پیش کیا ہے اور جس میں ملحد عربوں کے اس تصور کی نفی کی گئی ہے کہ بیع (تجارت) اور ربوا (سود) میں مماثلت ہے۔

بیع اور ربوا کے درمیان مودودی صاحب نے چار بنیادی اختلاف پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر دونوں کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱ـ تجارت میں خریدار اور دوکاندار برابری کی بنیاد پر تبادلہ کرتے ہیں، دوکاندار سے خریدار منافع حاصل کرتا ہے اپنے خریدے ہوئے مال پر جبکہ دوکاندار اپنی اس کاوش اور محنت کے بدلے میں منافع حاصل کرتا ہے جو وہ مال کے حصول کے لئے خریدار کے واسطہ صرف کرتا ہے۔سود کے کاروبار میں قرض دینے والا اپنے دیئے ہوئے قرض کی رقم پر ایک مقرر رقم زر اصل پر ایزاد کے ساتھ حاصل کر لیتا ہے،لیکن مقروض کو اس روپیہ کے استعمال سے وقت یا وقفہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا جبکہ یہ ضروری بھی نہیں کہ اسے کوئی منافع حاصل ہو،اگر وہ یہ قرض اپنی گھر یلو ضرورت کے لئے لیتا ہے پھر تو اسے کسی بھی طرح کا منافع یہاں تک کہ اسے ٹائم سے بھی فائدہ اٹھانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔اور اگر وہ یہ قرض کسی کاروبار میں استعمال کرنے کے لئے لیا ہے تو ابھی اسے معینہ مدت کے اندر نفع اور نقصان کا برابر کا خدشہ رہتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں یا ربوا میں وہ پارٹی جو قرض دیتی ہے یقینی طور پر منافع میں رہتی ہے جبکہ مقروض پارٹی کو منافع حاصل کرنے کا موقع غیر یقینی ہوتا ہے۔

۲ـ تجارت میں دوکاندار خریدار سے کتنا ہی منافع حاصل کر لے لیکن یہ منافع صرف ایک ہی بار کا ہوتا ہے،سودی کاروبار میں قرض خواہ سود اس وقت تک طلب کرتا رہتا ہے جب تک کہ زر اصل کی ادائیگی مکمل نہیں ہو جاتی۔وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ غیر ادا شدہ قرض پر سود کی رقم ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھتی چلی جاتی ہے،اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مقروض نے قرض کی رقم اپنے کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کیا تب بھی اس بات کے امکانات بہت محدود ہیں کہ وہ قرض کی رقم سے منافع حاصل کرے،سودی کاروبار یا ربوا میں قرض خواہ امکانات اس تحدید کا کوئی سامنا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس یہ قطعی ممکن ہوتا ہے کہ مقروض کی آمدنی کے تمام ذرائع،اس کی تنخواہ،اس کا اثاثہ یہاں تک کہ اس کے گھر کے برتن تک قرض خواہ کے

مطالبات پورے کرنے سے قاصر رہیں۔

۳- تجارت کے نقطۂ نظر سے جس لمحہ ایک شئے کا تبادلہ اس کی قیمت سے ہوتا ہے یہ سودا ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد خریدار اور دوکاندار کو کچھ نہیں دیتا، کرایہ کے کاروبار میں یہ سودا خواہ مکان کا ہو، زمین کا ہو یا کسی اور چیز کا، اصل اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور بعد میں مالک کو واپس کردیا جاتا ہے۔ مالک کو کرایہ دار جو کرایہ کی رقم ادا کرتا ہے وہ اس چیز یا جگہ کو استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بدلے میں کرتا ہے۔ ربوا کے سودے میں مقروض زر اصل کو خرچ کردیتا ہے جو وہ بطور قرض حاصل کرتا ہے اور پھر یہ زر اصل سود کی رقم کے اضافہ کے ساتھ قرض خواہ کو واپس کرتا ہے۔

۴- تجارت میں فرد اپنی محنت ومشقت سے یا اپنی مہارت اور ہنرمندی سے منافع حاصل کرتا ہے، سود کے کاروبار میں فرد اپنی اندوختہ پونجی قرض کے طور پر دوسرے کو دیتا ہے اور بغیر کسی ذاتی کاوش یا محنت ومشقت یا بغیر کسی مہارت یا ہنرمندی کے اپنے مقروض کی آمدنی میں حصّہ دار بن جاتا ہے، اگر یہ بھی کہا جائے کہ اس نے قرض دی رقم کو کمانے کے لئے جبکہ یہ رقم اس کے پاس نہیں تھی اس نے محنت کاوش، مشقت اور ہنرمندی سے کام لیا تھا تب بھی کسی جائز معاشی جدوجہد سے محروم کسی کاروبار میں پونجی لگانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اصطلاحی معنوں میں ربوا یا سود کے کاروبار میں لفظ پارٹنر شپ یا شریک استعمال نہیں ہوسکتا، کیونکہ پارٹنر شپ یا شریک جو ہوتا ہے وہ کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اس کے برعکس سود کا کاروبار کرنے والا ایک ایسا پارٹنر یا شریک ہوتا ہے جو نفع یا نقصان کی ذمّہ داری سے مبرّا ہوتا ہے خواہ اس کام کو کتنا ہی منافع کا امکان ہو، وہ صرف ربوا یا سود کا طلب گار ہوتا ہے جس کی شرط قرض کی رقم دیتے وقت واضح کردی تھی۔

چنانچہ تجارت اور ربوا کے درمیان یہ فرق بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ تہذیب وتمدن کی تعمیر وترقی میں تجارت ایک غالب عنصر کی شکل میں سامنے آتی ہے اور اس کے برعکس ربوا

ایک تفریقی اور تخریبی کاروبار یا طاقت ہے جو معاشرہ کو اور انجام کار تہذیب وتمدن کا شیرازہ منتشر کردیتا ہے۔

☆☆☆

بینک انٹرسٹ، سودی قرض
اور
ہندوستان کی شرعی حیثیت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ☆

۱– ربا کی حقیقت:

ربا کے لغوی معنی ئی ئی اضافہ ئی ئی کے ہیں، کتاب وسنت میں متعدد مواقع پر یہ الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ربا ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو:

''وفی الشرع عبارة عن فضل مالا یقابله عوض فی معاوضة مال بمال'' (عنایہ علی ہامش الفتح ۶/۱۴۷)۔

۱– ابن اثیر کا بیان ہے :''الاصل فیه الزیادة علی رأس المال من غیر

☆ ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

تبایع"(النہایہ)۔

۲–زیلعیؒ کہتے ہیں :"**ھو فضل مال بلاعوض فی معاوضة مال بمال**"۔

۳–یہی تعریف کم وبیش دوسرے اہل علم نے بھی کی ہے مگر اس تعریف میں ربا کی ایک خاص نوع ہی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، رباء کی دو قسمیں ہیں ربوا فضل، ربوا نساء۔

دو چیزیں جو ایک ہی جنس کی ہوں اور ان کا ذریعہ پیمائش بھی ایک ہی ہے، جس کو فقہاء حنفیہ"قدر نی نی سے تعبیر کرتے ہیں تو ایسی صورت میں خرید و فروخت کے معاملہ میں ایک کی طرف سے نقد اور دوسرے کی طرف سے ادھار کا معاملہ درست نہیں، اس کو"ربو نساء نی نی کہتے ہیں۔

ربا کی دوسری قسم"ربا فضل" ہے، عام طور پر فقہاء نے ربا کی جو تعریف کی ہے وہ اسی نوع کی ہے، یعنی فریقین میں سے ایک کی طرف سے ایسا اضافہ جس کے عوض دوسرے فریق کی طرف سے کچھ نہ ہو، اس ربا کی ایک صورت وہ تھی جو ایام جاہلیت میں مروج تھی، ایک شخص کسی سے قرض لیتا تھا، جب ادائیگی کا وقت آتا تو قرض دہندہ دریافت کرتا کہ ادا کروگے یا اس پر سود ادا کروگے، چنانچہ مقروض مزید مہلت حاصل کر کے سود دینے کو تیار ہوتا اور قرض دہندہ مان لیتا۔

"**فکان الغریم یزید فی عدد المال و یصیر الطالب علیه**"(الجامع لأحکام القرآن ۳۴۸/۳)۔

لیکن سود کی اس مروجہ صورت کے سد باب کے لئے شریعت نے دو ہم جنس چیزوں کی نقد خرید وفروخت میں بھی طرفین کی جانب سے برابری کو ضرور قرار دیا، اور کمی بیشی اور تفاضل کو حرام قرار دیا، اسی طرف آپ ﷺ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا:

"**لا تبیعوا الدرھم بالدرھمین فانی أخاف علیکم الربا**"

سود کی اسی تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سود چاہے حاجاتی قرض پر لیا جائے

یا تجارتی قرض پر، مروجہ اصطلاح کے مطابق دین استہلاکی ہو یا دین استثماری، وہ بہرصورت حرام ہے، کیونکہ حدیث اور فقہاء کی تصریحات سے سود کی جو تعریف اور حقیقت مستنبط ہوتی ہے، وہ ہر طرح کے ربا پر صادق آتی ہے، بعض حضرات کا یہ خیال کہ بینک وغیرہ جو لوگوں کی رقم کو تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے، اس کی طرف سے ملنے والا نفع ''سود'' میں داخل نہیں، کیونکہ اس سے کسی غریب کا استحصال نہیں ہوتا، صحیح نہیں ہے اور اس کی چند وجوہ ہیں:

۱- آپ ﷺ نے کسی تفریق کے بغیر ہر طرح کے قرض پر نفع کے حصول کو ناجائز قرار دیا ہے: ''کل قرض جرّ منفعة فهو ربا''۔

۲- شریعت میں سرمایہ کار کے لئے نفع اٹھانے کی ایک ہی صورت ''مضاربت'' کی شکل میں مقرر ہے، جس میں سرمایہ کار نفع و نقصان کی اساس پر شریک ہوتا ہے۔

سرمایہ کار اپنے لئے بہر طور پر نفع مقرر کرلے اس صورت کو شریعت جائز نہیں رکھتی، اسی لئے ''مخابرہ'' سے منع کیا گیا، ''مخابرہ'' یہ ہے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کاشتکار کو کاشت کے لئے دے اور اپنے لئے ایک مخصوص مقدار اس پیداوار کی متعین کرلے، جس کی کاشت وہ اس زمین میں کرے گا، تجارتی قرض پر سود حاصل کرنے میں بھی بعینہ یہی قباحت ہے۔

۳- یہ رائے اس اصول پر مبنی ہے کہ قرآن کے زمانہ نزول میں سودخوری کی جو کیفیت پائی جاتی تھی آیت ربا میں صرف اسی صورت کی ممانعت تسلیم کی جائے گی، یہ فقہاء کے اس اصول مقررہ کے خلاف ہے کہ نصوص میں ہمیشہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ اس کے موقع ورود کا، ''**العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد**'' اگر قرآن و حدیث کے اوامر ونواہی میں اس عموم اور اطلاق پر عمل نہ کیا جائے تو دین بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا، آج شراب اور مسکرات کی بعض ایسی انواع وجود میں آچکی ہیں کہ نزول قرآن کے وقت ان کا وجود نہ

تھا، قمار اور جوئے کی بعض ایسی صورتیں رواج پا گئی ہیں کہ پہلے ان کا تصور بھی نہ رہا ہوگا، ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ اجنبی مرد وعورت کے مادہ حیات کے اختلاط کی شکل میں ’’زنا‘‘ کی ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ ماضی میں کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا، تو کیا ان تمام معاملات میں اسی اصل کا انطباق کیا جائے گا؟

۴– یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ تجارتی قرضوں کا اس زمانہ میں رواج ہی نہیں تھا، ایسے قرضوں کا رواج تو تھا ہی اور بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام جاہلیت میں بعض قبائل تجارتی اغراض کے لئے سودی قرض بھی حاصل کرتے تھے، ان حالات میں ربا کی حرمت سے متعلق آیات وروایات کا اطلاق اور تجارتی قرضوں میں کسی طرح کی تفریق سے گریز اس بات کا ثبوت ہے کہ ممانعت کا یہ حکم تجارتی قرضوں کو بھی شامل ہے (مولانا مودودی نے اپنی کتاب ’’سود‘‘ میں ایسی متعدد نظیریں پیش کی ہیں اور مولانا تقی عثمانی نے تکملۃ فتح الملہم میں تفصیل سے ان روایات کی تخریج کی ہے، ملاحظہ ہو: کتاب مذکور ۱/۱۷۵، ۵۷۴)۔

۵– حکم کی بنیاد حکمت پر نہیں ہوتی ہے بلکہ ’’علت‘‘ اور معاملہ کی ظاہری صورت پر ہوتی ہے، پس ربا کی تعریف جس معاملہ پر صادق آتی ہے وہ بہر حال ربا کہلائے گی، اس میں کسی غریب کا استحصال ہو یا نہیں، یہی وجہ ہے کہ ظاہری شکل کے تبدیل ہوجانے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اس معاملہ کو سود میں شامل نہیں قرار دیا، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ او رحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کے بعض حضرات ایک صاع عمدہ کھجور دو اور تین صاع معمولی کھجور دے کر حاصل کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ پہلے ان معمولی کھجوروں کو درہم کے ذریعہ فروخت کرلو اور پھر ان دراہم کے ذریعہ عمدہ کھجور کو خریدلو (ردالمحتار ۴/۳۴۶)۔

۶– ’’تجارتی قرض‘‘ کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں استحصال نہیں ہوتا، صحیح نہیں ہے، تاجر کو اس سرمایہ کے استعمال میں نقصان بھی ہوسکتا ہے، نہ نفع نہ نقصان کی صورت بھی پیش

آسکتی ہے، یاجوتناسب نفع کامقرر کردیا ہے، عین ممکن ہے کہ خوداس کواتنی آمدنی نہ ہوسکے، ان تمام صورتوں میں قرض دہندہ بہرطور نفع قبول کرلے گا اور اس طرح یقینا قرض گیرندوں کا استحصال ہوگا۔

پس ربا ایسی متعین قدرزائد کا نام ہے جس کے مقابلہ معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو، خواہ یہ قرض تجارتی اغراض کے لئے دیا گیا ہو یا وقتی ضروریات وحاجات کے لئے، اسی طرح ایسی تمام شکلیں جن میں قرض سے مالی نفع حاصل کیا جائے گو تعبیر بدل دیا جائے ''ربانی ہی کے حکم میں ہے، اسی لئے فقہاء نے مال رہن سے استفادہ کوحرام قرار دیا، اور رہن سے استفادہ اور قرض گیرندہ کے استحصال کی ایک خاص صورت جس کو ''بیع بالوفا'' سے موسوم کیا جاتا تھا، فقہاء نے اس سے منع فرمادیا اور اس کو ''رہن'' کے حکم میں رکھا (السیر الکبیر ۴؍۹۳۴ فقرہ ۲۹۱۹)۔

دارالحرب میں سود:

اب ہمیں دارالحرب میں سود کے جواز وعدم جواز کے مسئلہ پر آنا چاہئے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دارالحرب سے جو لوگ مستامن کی حیثیت سے عارضی طور پر دارالحرب میں آئیں ان سے بھی سود لینا درست نہیں، البتہ دارالاسلام سے جو مسلمان عارضی امان حاصل کر کے دارالحرب جائیں، وہ وہاں کے حربیوں سے سود لے سکتے ہیں، گو وہ حربی مسلمان کیوں نہ ہوں۔ "**ولو اسلم الحربی فی دار الحرب ولم یھا جر الینا فکذلک الحکم عند أبی حنیفة**" (تبیین الحقائق ۴/۹۷)، یہ امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ کی رائے ہے (شرح النقایہ ۲/۵۹)، جمہور فقہاء اس صورت میں بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں، یہی رائے احناف میں قاضی ابو یوسفؒ کی ہے (وقال ابو یوسف لا یجوز فی دار الحرب الاما یجوز له فی دار الاسلام بدائع الصنائع ۷/۱۳۲)۔ اور اس کے قائل امام مالک (المدونہ ۳/۲۷۹) وشافعی (المجموع شرح مہذب ۹/۳۹۱) اور احمد بھی ہیں، البتہ فقہاء مالکیہ میں ابن رشد اس کے جواز کے قائل نظر آتے ہیں اور حضرت عباس کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں (مقدمات ابن رشد مع المدونہ ۳/۲۸،۳۸)۔

مجوزین کے دلائل:

جو لوگ جواز کے قائل ہیں، ان میں امام محمدؒ نے السیر الکبیر (۴/۱۲،۱۱،۱۴) میں کاسانی نے بدائع الصنائع (۷/۱۳۲) میں اور سرخسی نے مبسوط (۱۰/۹۵) میں وضاحت سے اپنے دلائل پیش کئے ہیں، ان دلائل کا حاصل یہ ہے:

۱- مکحول نے رسول اللہ ﷺ سے مرسلاً نقل کیا ہے:

"**لا ربا بین المسلم الحربی فی دار الحرب**" (دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہوتا) یہ روایت گو مرسل ہے اور مرسل روایات کی حجیت اور مقبولیت محدثین کے درمیان متفق علیہ نہیں ہے، لیکن امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک ثقہ (جو خود بھی

ثقہ ہی کی روایت کو قبول کرتا ہو) کی مرسل معتبر ہے (المبسوط ۱۰/۹۵)۔

۲۔ حضرت عباسؓ غزوہ بدر یا کم از کم فتح خیبر سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے مگر آپ نے ہجرت نہیں فرمائی، پھر ۱۰ھ حجۃ الوداع کے موقع سے آپ نے اعلان فرمایا:

"ربا الجاهلية موضوع وأوّل ربا اضعه ربا العباس بن عبد المطلب فانه موضوع كله"۔

جاہلیت کا ربا ختم کیا جاتا ہے اور پہلا ربا جو ختم کرتا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا ہے کہ وہ کل کا کل ختم کیا جاتا ہے۔

گویا حجۃ الوداع کے واقعہ تک آپ نے حضرت عباس کے سودی کاروبار پر امتناع عائد نہیں فرمایا، یہ اس لئے کہ مکہ دار الحرب تھا اور دار الحرب کے حربیوں سے سود لینا جائز تھا۔

۳۔ حربی کا مال معصوم اور قابل احترام نہیں اور حرمت مال معصوم کے لینے کی ہے، اس لئے حربی سے سود لینا جائز ہے۔

مانعین کے دلائل :

۱۔ جو لوگ دار الحرب میں بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل قرآن و حدیث کی وہ تاکیدات ہیں جو مطلقاً سود کو حرام قرار دیتی ہیں، اور مسلمان و کافر اور دار الاسلام اور دار الحرب کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتیں کہ جس طرح شراب نوشی اور زنا کی حرمت کی نصوص مطلق ہیں اور جو بلا تفریق دار الاسلام اور دار الحرب میں یکساں حرام ہیں، اور اسی سود کی حرمت کا حکم بھی عام اور مطلق ہونا چاہئے۔

۲۔ حربی امان لے کر دار الاسلام آئے تو جس طرح اس کے مال کو اس عہد کی وجہ سے معصوم تسلیم کیا جاتا ہے اور اس سے سود حاصل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جب مسلمان امان لے کر دار الحرب میں داخل ہو تو اس کی عہد کی وجہ سے اس کے حق میں اس کا مال معصوم اور محفوظ ہو جائے گا۔

۳- حضرت ابو بکرؓ نے ایک مشہور واقعہ کے مطابق قمار کے ذریعہ اونٹ حاصل کئے تھے، حضور ﷺ کے پاس یہ اونٹ لائے تو آپ ﷺ نے ان کو صدقہ کر دینے کا حکم فرمایا: "وأخذ الحضر فجاء به الى رسول الله ﷺ قال تصدق به" (شرح نقایہ ۲/۵۹)۔

۴- آپ ﷺ نے رکانہ سے کشتی کی ہار جیت میں بکریوں کی شرط لگائی تھی، جب آپ نے تین بار شکست دے دی اور بکری آپ ﷺ کو دے دی گئی تو آپ ﷺ نے واپس فرمادی۔ "فرد رسول الله الغنم عليه" (النہایہ علی الہدایہ ۳/۶۵)۔

دلائل جواز پر ایک نظر:

۱- جہاں تک مکحول کی روایت ہے تو اکثر اہل علم اور اہل فن نے اس کو قابل استدلال نہیں تسلیم کیا ہے، امام شافعیؒ کا بیان ہے: "هذا حديث ليس له ثبات لا حجة فيه۔ خود عینی کہتے ہیں۔ "هذا حديث غريب ليس له اصل سند" ۲- ابن قدامہ لکھتے ہیں: "لم يرد في صحيح ولا في مسند ولا كتاب موثوق به"

مرسل بے شک معتبر ہے لیکن قرآن مجید کی صریح آیت، کثرت سے صحیح وصریح روایات اور دین کے اصول مسلمہ کے خلاف محض ایک مرسل روایت جس کا قابل استدلال ہونا بھی اہل فن کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے، کیوں کر راجح اور معتبر ہوسکتی ہے؟ اس لئے حق یہی ہے کہ اتنے واضح اور قوی دلائل پر اس حدیث کو ترجیح دینا مشکل ہے۔

یہ تو اس روایت کے ذریعہ ثبوت کا حال ہے، ربا کی حلت پر اس حدیث کی دلالت بھی قطعی اور صریح نہیں ہے، حنفیہ کا استدلال اس امر پر موقوف ہے کہ روایت میں "لا نفی کو "نفی نفی" کے معنی میں لیا جائے اور یہ مفہوم سمجھا جائے کہ مسلم اور حربی کے درمیان ربا ہوتا ہی نہیں ہے، لیکن اگر اس کو "نہی نفی" اور ممانعت کے معنی میں لیا جائے تو معنی یوں ہوں گے کہ: ربا مسلم اور حربی کے درمیان بھی ممنوع ہے" اسی کو امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے معنی ہیں "لا يباح الربا في دار الحرب" (دار الحرب میں ربا جائز نہیں)، ابن قدامہ نے

اس پر خود قرآن مجید کے طریق تعبیر سے استدلال کیا ہے کہ قرآن نے ”فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ“ (سورۂ بقرہ: ۱۹۷) میں ”لا“ کو اسی نہی اور ممانعت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ پس اگر اس مفہوم اور توضیح کو قبول کر لیا جائے تو یہ حدیث بھی جمہور کے حق میں ہے۔

۲- حضرت عباس والے واقعہ سے استدلال بھی صحیح نظر نہیں آتا، مختلف اہل علم نے اس استدلال کا رد کیا ہے، ڈاکٹر نزیہ حماد (جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ) نے ان سب کو جمع کر دیا ہے اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(الف) ممکن ہے کہ حضرت عباس کو خصوصی طور پر اس کی اجازت دی گئی ہو، مثلاً کسی مسلمان کے لئے عام حالات میں اظہار شرک اور اعلان کفر کی اجازت نہیں، لیکن حضرت عباس کو مکہ میں خصوصی طور پر اس کی اجازت مرحمت فرمائی گئی، ظاہر ہے کہ سود کا لینا اظہار شرک سے کمتر ہے، اس لئے اگر سود لینے کی اجازت ہو تو قطعاً عجیب نہیں۔

(ب) ہوسکتا ہے کہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کا اعلان باقی ماندہ سود سے متعلق ہو جو حضرت عباس کے قبول اسلام سے پہلے کا ہو، کیوں کہ قبول اسلام کے بعد بھی حضرت عباس کے سودی معاملات جاری رکھنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اور اگر قبول اسلام کے بعد بھی انہوں نے کاروبار جاری رکھا ہے تو عین ممکن ہے کہ ایسا لاعلمی اور ناواقفیت کی وجہ سے ہوا ہو، اس لئے حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے اس کو نافذ فرمایا ہے یہ توجیہ امام سبکی نے کی ہے۔

(ج) ایام جاہلیت میں سود کی جو صورت رائج تھی وہ ”سودی قرض نی نی کی تھی ادھار اور قرض کے معاملات میں ہی سود لیا جاتا تھا، اسلام نے نقد معاملات میں بھی بہ شرطیکہ معاملہ دو ہم جنس اشیاء کے درمیان ہو، سود اور کمی بیشی کو حرام قرار دیا جس کو ”ربا فضل نی نی کہا جاتا ہے ممکن ہے کہ حضرت عباس ”ربا فضل نی نی کو جائز سمجھتے رہے ہوں، اس لئے حرمت کا حکم نازل ہونے کے بعد ”ربا نسیئہ نی نی کو چھوڑ دیا ہو لیکن ”ربا فضل نی نی پر عامل رہے ہوں، اسی پس

منظر میں، حجۃ الوداع کے موقع سے آپ ﷺ نے اس طرح کا اعلان فرمایا ہوگا۔

(د) آیت قرآنی: "یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" کے نزول تک سود کی قطعی حرمت کا حکم نہیں ہوا تھا، اس کا اندازہ دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے: بنوثقیف نے قبول اسلام کے وقت یہ شرط رکھی کہ وفد بنوثقیف کی واپسی کے ایک ماہ بعد تک ان کو بتان باطل رکھنے کی اجازت دی جائے آپ نے اس کو رد فرما دیا۔ انہوں نے نماز معاف کرانی چاہی، آپ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا، لیکن انہوں نے شرط لگائی کہ لوگوں کے ذمہ ان کی جو سودی رقوم باقی ہیں ان کو اس کے وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا، آپ ﷺ نے ان کی اس شرط کو منظور فرمالیا۔

اسی طرح فتح مکہ کے بعد جب حضرت عتاب بن اسید کو آپ ﷺ نے مکہ کا گورنر مقرر فرمایا تو ان کے سامنے یہ معاملہ آیا کہ بنوعمرو بن عمیر بن عوف کی سودی رقوم بنومغیرہ کے ذمہ باقی تھیں چنانچہ اول الذکر نے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور بنومغیرہ نے اب کہ مسلمان ہو چکے تھے، ادا کرنے سے انکار کر دیا، حضرت عتاب نے آپ کو اس قضیہ کی بابت خط لکھا، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی:

"یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ، فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" (بقرہ: ۲۷۸-۲۷۹)۔

اے اہل ایمان! خدا سے ڈرو اور باقی ماندہ سود سے باز آجاؤ اگر تم واقعی اہل ایمان ہو، اگر ایسا نہیں کرتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ، ہاں البتہ اگر تائب ہو جاؤ تو تم کو اصل سرمایہ واپس لینے کا حق ہے تا کہ نہ تم ظلم کرو اور نہ خود ظلم کا شکار ہو۔

پس اگر حضرت عباس نے حجۃ الوداع سے پہلے سود کا کاروبار جاری رکھا، تو اس بنیاد پر نہیں کہ دارالحرب میں حربیوں سے سود لینا جائز ہے بلکہ اس لئے کہ اس وقت تک سود کی حرمت کو

قطعیت حاصل نہیں ہوئی تھی، خود ڈاکٹر نزیہ نے اسی توجیہ کو بہتر سمجھا ہے اور اس کے وجوہ پیش کئے ہیں۔

ان تاویلات کو قبول کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت عباس حجۃ الوداع کے واقعہ تک سود لیا کرتے تھے تو پھر یہ واقعہ خود حنفیہ کی رائے کے لئے بھی مفید نہ ہوگا، کیونکہ رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد مکہ دارالاسلام بن چکا تھا، تو گویا حضرت عباس نے دارالاسلام بننے کے بعد بھی سودی کاروبار جاری رکھا، حالانکہ یہ بالاتفاق حرام ہے۔ جہاں تک حربی کے مال کے معصوم ہونے کی بات ہے تو خود فقہاء حنفیہ ''عہد نی نی اور'' امان نی نی کو منجملہ اسباب مصلحت کے تسلیم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام میں مقیم'' اہل ذمہ نی نی سے سود لینا جائز نہیں اور دارالاسلام میں امان لے کے آنے والے حربی'' مستامن نی نی سے بھی سود لینا جائز نہیں، پس دارالحرب میں امان لے کر جانے والے مسلمان کا چونکہ دارالحرب کے تمام باشندوں سے بحیثیت اجتماعی ''عہد نی نی ہو چکا ہے، اس لئے اس کے حق میں ان کے مال کو بھی معصوم ہونا چاہئے۔

ان کے علاوہ شراب وخنزیر کی فروخت کی اجازت، سود کی اجازت اور دوسرے عقود فاسدہ کی اجازت سے اس بات کا قوی احتمال ہے کہ حدود شرعیہ کی حرمت وشناعت کا جو تصور مسلمانوں میں ہے یا ہونا چاہئے، بتدریج وہ ختم ہوتا جائے، اور یہ اتنا بڑا مفسدہ ہے کہ تنہا اس کی حرمت کے لئے کافی ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسفؒ کی رائے قوی نظر آتی ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کے مقابلہ امام ابو یوسفؒ کی رائے دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہو تو امام ابو یوسف کی رائے پر بھی فتویٰ دیا جاتا ہے۔

۳- دارالحرب کسے کہتے ہیں؟

یہ بات اہل علم کے لئے محتاج اظہار نہیں کہ ''دارالاسلام نی نی اور'' دارالحرب'' کی اصطلاح خالص فقہی اصطلاح ہے، کتاب اللہ اور حدیث صحیح میں صراحت کے ساتھ یہ اصطلاحات

ذکر نہیں کی گئی ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ائمہ مجتہدین کے یہاں بھی عام طور پر حدود وقیود کے ساتھ ان اصطلاحات پر بحث نہیں کی گئی ہے، ان کی تحریروں سے محض یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن ممالک پر مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل تھی، ان کو فقہاء ''دارالاسلام نی نی یا ''دارنانی نی سے تعبیر کرتے ہیں، اور جن ممالک پر اہل کفر کا اقتدار تھا ان کو کہیں ''دارالکفر نی نی اور کہیں ''دارالحرب نی نی کہہ دیتے ہیں، اس عہد میں نظامہائے حکومت میں وہ تنوع غالباً نہیں تھا جو اب ہے، آج مختلف ممالک میں مذہبی اقلیت ہونے سے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی پوزیشن میں جو تفاوت ہے اور فوجی وعسکری طاقت کے عالمی توازن میں عالم اسلام کا جو تنزل ہم نگاہ حسرت سے دیکھ رہے ہیں، اس زمانہ کے فقہاء ان سے دوچار نہیں تھے، اس لئے دارالاسلام اور دارالحرب ایسی زندہ حقیقتیں تھیں کہ ان کی منطقی تحدید اور اصطلاحی تعریف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

بعد کے فقہاء نے البتہ ان اصطلاحات پر بحث کی ہے اور متاخرین میں بھی شاید احناف ہی ہیں جن کی تحریروں میں اس موضوع پر خاص توجہ کی گئی ہے کہ مسائل عصر سے اعتناء اور بدلتے ہوئے حالات واقدار پر احکام شرعیہ کی تطبیق اور اسمیں دقیق النظری، وسیع المشربی اور اعتدال وتوازن احناف کا وہ وصف ہے کہ کم فقہاء اس میں ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں، غالباً صاحب کافی اور سرخسی کے بعد پوری وضاحت وتفصیل کے ساتھ اس پر سب سے پہلے چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم ملک العلماء علاء الدین کاسانیؒ (م ۵۸۷ھ) نے گفتگو کی ہے فرماتے ہیں: ہمارے اصحاب کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس مملکت میں احکام اسلامی کو غلبہ وظہور حاصل ہوجائے وہ دارالاسلام ہے۔

''لا خلاف بین أصحابنا فی أن دار الکفر تصیر دار الاسلام بظهور أحکام الاسلام فیها'' (بدائع الصنائع ۱۳۰/۷)۔

البتہ ''دارالاسلام نی نی ''دارالکفر'' کب بن جاتا ہے اس میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کی رائیں مختلف ہیں۔

دارالاسلام میں کہ وہ کب دارالکفر بنے گا فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین شرطوں سے دارالکفر بنے گا، ایک احکام کفر کا غلبہ، دوسرے دارالکفر سے اتصال، تیسرے کوئی مسلمان یا ذمی مسلمانوں کے سابقہ امان کی وجہ سے مامون نہ رہ سکے، قاضی ابویوسف اور امام محمد نے کہا محض احکام کفر کے غلبہ سے دارالاسلام دارالکفر بن جائے گا (بدائع الصنائع ۷/۱۳۰)۔

بعد کے فقہاء عام طور پر الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ اسی کو نقل کرتے گئے ہیں، عالمگیری میں مزید توضیح کی گئی ہے کہ عملی طور پر دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: (۱) اہل کفر مملکت اسلامی کے کسی حصہ پر قابض ہو جائیں (۲) کسی شہر، کسی علاقہ کے لوگ (العیاذ باللہ) مرتد ہو جائیں اور قوانین کفر جاری کر دیں۔ (۳) یا حکومت اسلامی کی بالادستی کو قبول کر کے اسلامی مملکت میں رہنے والی غیر مسلم آبادی عہد شکنی کرے اور کسی حصہ پر غلبہ حاصل کر لے (ہندیہ ۲/۲۳۲)۔ کاسانیؒ نے امام صاحب اور صاحبین کی دلیل بھی پیش کی ہے، صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ دار کی نسبت اسلام کی طرف اسی وقت درست ہو سکتی ہے جب کہ وہاں اسلام کا غلبہ ہو جیسے کہ جنت کو ''دارالسلام نی نی (جائے سلامتی) اور دوزخ کو ''دارالبوار نی نی (جائے تباہی) سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے غلبہ وظہور ہی تنہا وہ سبب ہے جس کو ''دارالاسلام'' اور ''دارالکفر'' کی اساس قرار دیا جانا چاہئے، امام صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کی اس نسبت کا مقصود بعینہ اسلام اور کفر نہیں ہے بلکہ امن و خوف ہے، پس جہاں مسلمانوں کو مامون رہنے کے لئے نئی شہریت اور امان کی ضرورت ہو اور جو مملکت اسلامی سے متصل نہ ہو کہ مظلوم مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے وہ مداخلت کر سکے، ایسی صورت میں وہ دارالکفر بن جائے گا۔ یہاں یہ پہلو قابل لحاظ ہے، گویا کاسانی کی تشریح کے مطابق جس ملک میں مسلمانوں کو امن حاصل ہو وہ دارالحرب نہیں ہے فرماتے ہیں:

”ومعناه ان الامان ان كان للمسلمين فيها على الاطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق فهى دار الاسلام، وإن كان الأمان فيها للكفرة على الاطلاق فهى دار الكفر“ (ہندیہ ۲/۲۳۲)۔

مسلمانوں کو علی الاطلاق امن حاصل ہو اور کافروں کو خوف تو دار الاسلام ہے، اور ان کافروں کو علی الاطلاق امن اور مسلمانوں کو خوف ہو تو دار الکفر ہے۔

تاہم عالم گیری اور شامی وغیرہ میں اس مسئلہ میں صاحبین کی رائے کو قرین قیاس قرار دیا گیا ہے (ہندیہ ۲/۲۳۲)۔ میرا خیال ہے کہ اگر واقعی اصحاب مذہب سے ان اصطلاحات کے بارے میں صراحت اور اختلاف منقول ہو، تو عجب نہیں کہ یہ اختلاف ”اختلاف برہان“ کے بجائے ”تغیر زمانی نی کا نتیجہ ہو، اس کا اندازہ اس شرط سے ہوتا ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے لگائی ہے کہ دار الحرب ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ”دار الاسلام“ سے اس کا اتصال نہ ہو گو کہ حضرت الامام کے عہد میں مملکت اسلامی کی دفاعی بالا دستی اور عسکری قوت کے تحت یہ بات ناقابل تصور تھی کہ ایک مملکت کافرہ جو اس کے پڑوس میں ہو، خودسری کا ثبوت دے، اس لئے وہ ایسی غیر اسلامی مملکتوں کو بھی دار الحرب کے زمرہ میں نہیں رکھتے ہیں، جب کہ صاحبین کے زمانہ میں خلافت اسلامی کی یہ پوزیشن باقی نہ رہی ہوگی، یا ایسے آثار پیدا ہو گئے ہوں گے جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہوں گے کہ آئندہ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے گی، اس لئے انہوں نے احکام اسلامی اور احکام کفر کے اجراء و غلبہ کو بنیاد بنایا ہوگا۔

اس کو اس سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ فقہاء متاخرین جو عام طور پر صاحبین کے ہم خیال ہونے کے باوجود بعض ایسے خطوں کو جہاں احکام کفر جاری و ساری تھے، اس بنا پر بالقوہ دار الاسلام کے حکم میں رکھا ہے کہ مملکت اسلامی کی سرحدیں ان کو اس طرح گھیرے ہوئی تھیں کہ کسی بھی وقت دار الاسلام سے اس کا الحاق و انضمام عمل میں آسکتا تھا، شامیؒ کا بیان ہے:

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ شام میں جو جبل تیم اللہ دروز اور اس کے تابع بعض شہر

ہیں، دارالاسلام ہیں، کیونکہ گو وہاں دروز حکام ہیں یا نصاری ہیں، ان کے مذاہب پر فیصلہ کرنے والے ان کے قضاۃ بھی ہیں، اور بعضے علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں پر سب وشتم کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے امراء کے تحت رہتے ہیں اور اسلامی شہر ہر طرف سے ان کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور جب بھی ولی امران پر ہمارے احکام نافذ کرنا چاہے نافذ کرسکتا ہے (ردالمحتار ۳/ ۲۵۳)۔

اس سے اس شبہ کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے کہ موجودہ مسلم مما لک جہاں عموماً احکام اسلامی نافذ نہیں ہیں کیوں کر دارالاسلام کہلا سکتے ہیں؟ کہ گو یہاں احکام اسلامی نافذ نہیں ہیں لیکن سربراہ مملکت کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے، اس لئے بالقوہ یہ دارالاسلام ہی متصور ہوگا۔

صاحبین رحمہا اللہ کے نقطۂ نظر کے بارے میں یہ بات پیش نظر رکھی جانی چاہئے کہ ان کے نزدیک احکام کفر کے اجراء وظہور کا مطلب یہ ہے کہ کلیۃً احکام کفر ہی نافذ ہوں، اگر احکام اسلامی بھی نافذ ہوں اور احکام کفر بھی، تو پھر یہ دارالکفر نہ ہوں گے۔

"لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرک لا تكون دار الحرب" (ردالمحتار ۳/ ۲۵۳)۔

اور احکام اسلام سے کس نوع کے احکام مراد ہیں؟ اس کا اندازہ درمختار کی اس صراحت سے ہوتا ہے کہ جمعہ وعیدین وغیرہ کی اجازت اور ادائیگی بھی احکام اسلام کے اجراء کی علامت ہے۔

"ودار الحرب تصير دار الإسلام با جراء أحكام أهل الإسلام فيها كجمعة وعيد" (درمختار علی ہامش الرد ۳/ ۲۵۳)۔

گویا مذہبی عبادات کی علانیہ انجام دہی کا حق بھی منجملہ "اجرائے احکام اسلام" ہی کے ہے۔

دارالکفر پر بحث کے دوگوشے:

اب اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ ایا ''دار ثنائی کی یہ تقسیم فقہاء نے اپنے زمانہ وحالات کے لحاظ سے کی ہے یا یہ قطعی تقسیم ہے اس کے لئے دارالکفر پر دو پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے، ایک اس کی خارجہ پالیسی اور مملکت اسلامی سے اس کے تعلقات کی نوعیت، دوسرے اندرون ملک اقلیت اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک، فقہاء نے جس زمانہ میں ان اصطلاحات پر بحث کی تھی، اس زمانہ میں مسلمان غیر مسلم ملکوں کے شہری بن کر بہت کم رہتے تھے، اور وہ ہجرت کر کے دارالاسلام منتقل ہو جاتے تھے، اس زمانہ میں نہ آج کی طرح قومیت کے فتنہ نے عالم اسلام میں سرایت کیا تھا جس نے ایک مسلم ملک کا دروازہ دوسرے ملک کے مسلمانوں کے لئے بند کر دیا ہے، اور نہ وہ قانونی الجھنیں تھیں جو اس زمانہ میں تارکین وطن کو پیش آتی ہیں، دارالکفر میں مسلمانوں کا سفر عموماً تجارتی اغراض سے ہوا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ سبھی کتب فقہ میں دارالحرب میں جانے والے مسلمان مستامن اور تاجر کے احکام کی جو تفصیل ملتی ہے، دارالحرب کے مسلمان باشندے کے متعلق نہیں ملتی، اس لئے فطری بات ہے کہ فقہاء نے عام طور پر ان اصطلاحات میں دارالاسلام اور دارالکفر کے خارجہ تعلقات کو مد نظر رکھا ہے جبکہ موجودہ حالات میں ہمیں داخلی صورت حال اور مسلمانوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کو سامنے رکھ کر غور کرنا ہے۔

قرآن مجید کی ہدایات کی روشنی میں:

قرآن مجید اپنے زمانہ نزول کے پس منظر کو سامنے رکھ کر کافروں کے دو گروہ کرتا ہے، ایک محاربین کا دوسرا معاہدین کا، ایک وہ جو اسلام کے خلاف برسر پیکار تھے، دوسرے وہ جن سے مسلمانوں کی نا جنگ اور بقاء باہم کا معاہدہ تھا، قرآن نے ایک سے زیادہ مواقع پر ان دونوں گروہوں کا ذکر کیا ہے، محاربین کے بارے میں کہا گیا:

''قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ،

وَاقْتُلُوْ هُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" (البقرة/۱۹۰)۔

خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جہاد کرو جو تم سے برسر جنگ ہوں، ہاں حد سے تجاوز نہ کرو کہ خدا حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جہاں کہیں ان کو پاؤ قتل کردو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے تم ان کو نکالو کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ سنگین شئی ہے ۔

قرآن نے دوسرے موقع پر اس طبقہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا : "أَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللهِ" (سورۂ محمد/۱)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں محارب قوم وہ ہے جو مسلمانوں سے آمادہ قتال ہو، اپنے ملک میں اسلامی تشخص کے ساتھ ان کو رہنے کی اجازت نہ دیتی ہو اور خدا کی راہ پر چلنے اور اس کی دعوت دینے سے روکتی ہو، یعنی وہاں مسلمانوں کو مذہب پر چلنے اور اپنے مذہب کی طرف دعوت دینے کی آزادی حاصل نہ ہو۔

معاہدین کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

"إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْ تُّمْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" (توبہ/۴)۔

سوائے ان مشرکین کے جن سے تمہارا معاہدہ ہو پھر وہ تمہارے ساتھ عہد شکنی نہ کریں ،اور تمہارے مقابلہ کسی کی مدد نہ کریں تو ان سے مدت معاہدہ تک عہد وفا کرو کہ خدا اہل تقوی کو پسند کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معاہدین جب تک خود معاہدہ کو ختم نہ کریں یا معاہدہ شکنی نہ کریں مسلمانوں کے لئے روا نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا اقدام کریں جو اس معاہدہ کے منافی ہو، یہاں تک کہ اگر وہاں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو اور مسلمان مملکت اسلامی سے مدد کے طالب

ہوں تب بھی مسلمانوں کے لئے اس معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں:

"وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ" (سورۂ انفال: ۷۲)۔

اور اگر وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد ضروری ہے سوائے اس قوم کے کہ تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو۔

انہی معاہدین کی مملکت کو بعض فقہاء نے "دار العہد نی نی یا "دار الصلح نی نی سے تعبیر کیا ہے قاضی ابوالحسن ماوردی فرماتے ہیں:

"تعتبر دار هولاء المصالحين دار عهد وصلح عند الشافعية و بعض الحنابلة" (الاحکام السلطانیۃ / ۱۳۳ بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ / ۸)۔

شافعیہ اور بعض حنابلہ کے نزدیک ان مصالحین کا ملک دار العہد اور دار الصلح تصور کیا جاتا ہے۔

اور اس اصول کو سامنے رکھ کر فقہاء نے دونوں طرح کی غیر مسلم اقوام سے مصالحت کی اجازت دی ہے، ان سے بھی جو خراج اور عوض ادا کریں اور ان سے بھی جو مملکت اسلامی کو کوئی خراج ادا نہ کریں، علامہ سمرقندی کہتے ہیں:

"وكذا الجواب في الموادعة والصلح على ترك القتال مدة بمال أو بغير مال تجوز من الامام ان راى المصلحة" (تحفۃ الفقہاء ۳/ ۲۹۷)۔

یہی حکم موادعت یعنی مال لے کر یا بغیر مال کے ناجنگ معاہدہ کرنے کا ہے، امام کی طرف سے ایسا معاہدہ درست ہے اگر اسی میں مصلحت سمجھتا ہو۔

پھر جو مملکت کافرہ مسلمانوں کو خراج ادا کرے اس کے دار الاسلام ہونے پر اتفاق ہے، اور جس مملکت سے مساویانہ سطح کا معاہدہ ہو اور وہ دار الاسلام کی باجگزار نہ ہو وہ ماوردی کے بیان کے مطابق اکثر فقہاء کے نزدیک دار الاسلام ہی کہلائے گا، اور بعض شوافع وحنابلہ

کے نزدیک ''دارالعہد ''نی سے موسوم ہوگا، غالباً یہ اختلاف اس اصل پر مبنی ہوگا کہ جمہور کے نزدیک مسلمانوں کے اس ملک میں مامون ہونے کی وجہ سے یہ دارالاسلام کہلاتا ہوگا، اور جن حضرات کی نظر احکام اسلامی کے جاری ہونے پر ہوگی وہ اس کو دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان ایک نیا نظام سیاسی، ''دارالعہد ''نی قرار دیتے ہوں گے۔

اس طرح خارجہ پالیسی اور تعلقات کے اعتبار سے دار کی تین قسمیں ہوئی : ''دارالاسلام ''نی، ''دارالحرب'' اور ''دارالعہد ''نی۔

عہد رسالت میں نظام ہائے مملکت:

غیر مسلم ممالک میں مسلمان شہریوں کے ساتھ سلوک اور ان کے مذہبی اور بنیادی حقوق کے اعتبار سے رسول ﷺ کے زمانہ میں تین طرح کی مملکتیں ملتی ہیں مکہ نی مدینہ اور حبش، مکہ میں مسلمانوں کو مذہبی حقوق بالکل نہ تھے، نہ عبادت کر سکتے تھے، اور نہ اپنے دین کی طرف دعوت دے سکتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے لئے اپنے دین اور جان ومال کی حفاظت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں خود قرآن نے ان پر ہجرت کو فرض قرار دیا:

''وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْئٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا'' (انفال:۷۲)۔

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کر جائیں۔

یہ وہی نظام مملکت تھا جس کو بعد میں فقہاء نے ''دارالحرب ''نی سے تعبیر کیا۔

مدینہ میں حکومت کی بنیاد گو مختلف اقوام کی بقاء باہم اور مذہبی آزادی کے اصول پر تھی، خود امام محمد نے اس ''موادعت ''نی کا ذکر کیا ہے لیکن مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل

تھی، اس لئے یہ ’’دارالاسلام ثانی‘‘ کہلایا۔

حبش میں اقتدار کی باگ گو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، مگر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی، فقہاء نے عام طور پر اس نظام مملکت سے تعرض نہیں کیا ہے اور اس پر زیادہ بحث نہیں کی ہے، شاید ایسا اس لئے ہوا کہ ہجرت کے واجب ہونے کی وجہ سے بعد کے ادوار میں غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں نے آباد ہونے سے گریز کیا، اور اس وقت فقہاء کو اس پہلو پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، لیکن موجودہ حالات میں سیرت کا یہ گوشہ علماء کی خاص توجہ کا طالب ہے، غالباً اسی نظیر کو سامنے رکھ کر ماضی قریب کے علماء نے دار کی ایک نئی صورت ’’دارالامن‘‘ کا اختراع کیا، پس داخلی حالات اور مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے لحاظ سے دار کی تین قسمیں ہوئیں دارالاسلام، دارالحرب، دارالامن۔

دارالاسلام : وہ مملکت ہے جہاں مسلمانوں کو ایسا سیاسی موقف حاصل ہو کہ وہ تمام احکام اسلامی کے نفاذ پر قادر ہوں۔

’’إن دار الحرب تصير دار الاسلام بشرط واحد وهو اظهار حكم الاسلام فيها‘‘۔

دارالحرب: وہ مملکت کافرہ ہے، جہاں کافروں کو امن حاصل ہو اور مسلمان شہری امن سے محروم ہوں، جیسا کہ کاسانیؒ کا قول گذر چکا ہے، نیز وہاں مسلمان مذہبی حقوق وعبادات اور جمعہ وعیدین وغیرہ کی علانیہ انجام دہی سے قاصر ہوں، جیسا کہ درمختار میں ’’اجراء احکام اسلام ثانی‘‘ کا مفہوم گذر چکا ہے، رہ گیا دارالاسلام سے متصل نہ ہونا تو جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ یہ ایسی شرط ہے جو اس زمانہ کے خاص تناظر وحالات میں رکھی گئی تھی، موجودہ حالات میں جیسا کہ عالم اسلام کو فوجی اور عسکری بالادستی حاصل نہیں رہی، یہ شرط قابل عمل باقی نہیں رہی ہے۔

دارالامن : وہ ملک ہے جہاں کلید اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو لیکن مسلمان مامون ہوں، مسلمان دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں اور ان اسلامی احکام پر جن کے

نفاذ کے لئے اقتدار ضروری نہ ہو، پر عمل کر سکتے ہیں، اگر ملک کا کوئی غیر مسلم باشندہ کسی مسلمان پر شخصی طور پر تعدی کرے تو یہ اس کے دار الامن رہنے کے منافی نہیں جیسا کہ دار العہد کے کسی شخص کے دار الاسلام میں داخل ہو کر رہزنی کرنے کو ''دار العہد ثانی کے دار الحرب قرار دیئے جانے کا سبب نہیں قرار دیا گیا۔

''وإذا وادع الامام أهل الحرب فخرج رجل من تلک الدار فقطع الطريق فی دار الإسلام واخاف السبيل فاخذه المسلمون فليس هنا بنقض منه للعهد'' (السیر الکبیر ۶۹۵/۵)۔

اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات اور بلوے جن میں غیر مسلموں کا ایک گروہ غیر آئینی طور پر مسلمانوں سے قتل وقتال کے درپے ہو جاتا ہے، کسی ملک کے دار الامن ہونے کے مغائر نہیں ۔

''وكذلک العدد منهم إذا فعلوا ذلک ولم يكونوا أهل منعة فهذا والواحد سواء'' (حوالہ سابق)۔

ہاں اگر آئینی اور قانونی طور پر مسلمانوں کو امن وسلامتی نہ ہو اور ان کے جان واملاک کو مباح قرار دیا گیا ہو تو اب یہ ملک دار الحرب کے زمرہ میں آجائے گا۔ جیسا کہ سربراہ قوم کی اجازت سے حملہ آور ہونے والی معاہدہ قوم کو فقہاء نے حربی کے حکم میں رکھا ہے۔

''وإن كانوا خرجوا باذن مليكهم فقد نقضوا جميعاً العهد فلا باس بقتلهم و سبيهم حيثما وجدوا'' (حوالہ سابق ص ۱۶۹۶)۔

حقیقت یہ ہے کہ ''دار الامن ثانی کے مسلمان باشندے اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ تعلقات میں انہیں اصول وضوابط کے پابند ہوں گے جن کے پابند مسلمان ملک کے شہری دوسری معاہد قوم کے افراد کے ساتھ سلوک و برتاؤ میں ہیں، اس لئے کہ جس طرح دار الاسلام معاہدین سے بحیثیت ملک بقاء باہم اور ایک دوسرے کی سلامتی اور آزادی کا عہد کرتا ہے اسی

طرح دارالامن میں مسلمان اپنی ہم سایہ قوموں سے ایک ہی ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے باہمی سلامتی اور امن وآزادی کا معاہدہ کرتے ہیں۔

''دارالامن نی نی کے احکام میں ہم ''قانون امان'' اور ئی ئی استیمان'' سے بھی فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ''امان'' اور ''استیمان نی نی کی حیثیت مستقل شہریت اور توطن کی نہیں ہے، بلکہ سفر اور عارضی قیام کی اجازت کی ہے، اور مستامن اور امان دینے والے افراد کے درمیان تعلقات کی نوعیت مساویانہ نہیں ہوتی بلکہ ایک کی حیثیت شہری کی ہوتی ہے اور دوسرے کی مسافر کی، جب کہ ''دارالامن'' میں مسلمان اور کافر کے درمیان تعلقات مساویانہ سطح کے ہوتے ہیں اور دونوں اسی ملک کے شہری قرار پاتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی جان ومال کے احترام، حفاظت وسلامتی اور اپنے مذہب پر قائم رہنے کے حق کے اعتبار سے ان کے حقوق یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام:

دارالامن چونکہ دارالکفر ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو یہاں امن اور مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اس لئے اس پر نہ دارالحرب کے تمام احکام جاری کئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی پوری طرح دارالاسلام کے حکم میں رکھا جاسکتا ہے، دار کی ان مختلف صورتوں میں مسلمان باشندوں کا کیا رول ہو؟ اس کے لئے یہاں ان احکام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو فقہاء نے دارالاسلام اور دارالحرب کے ذکر کئے ہیں، دارالاسلام کے درج ذیل احکام ہیں:

۱- اسلام کے تمام شخصی اور اجتماعی قوانین کا نفاذ۔

۲- دارالکفر کے مہاجرین کی آبادکاری۔

۳- دارالحرب میں پھنسے ہوئے کمزور مسلمانوں (مستضعفین) کی اعانت (نساء)۔

۴– جہاد اور اسلامی سرحدات کی توسیع کی سعی۔

دارالحرب کے درج ذیل احکام ہیں:

۱– یہاں اسلام کا قانون جرم وسزا جاری نہ ہوگا۔ "**الحدود والقود لا یجری فیھا**" (ردالمحتار ۳/ ۲۵۳، بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔ البتہ امام مالک کے نزدیک دارالحرب میں بھی حدود جاری ہوں گی "**تقام الحدود فی دارالحرب عند مالک خلافا للثلاثة**" (ملخصا: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶/ ۳۹۱)۔

۲– دارالحرب کے دو مسلمانوں کے درمیان بھی کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہوجائے تو دارالاسلام کا قاضی اس کا فیصلہ نہیں کرے گا "**ولو اختصما فی ذالک فی دارنا لم یقض القاضی بینھما بشئی**" (السیر الکبیر ۴/ ۱۴۸۶)۔

۳– دارالحرب کے باشندوں سے اسلحہ کی فروخت درست نہ ہوگی "**لا ینبغی ان یباع السلاح من اھل الحرب**" (ہدایہ ۲/ ۵۴۴، باب المستامن)۔

۴– دارالحرب کے کسی باشندہ کو دارالاسلام میں ایک سال تک قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی سوائے اس کے کہ وہ وہاں کی شہریت کا طالب ہو "**اذا دخل الحرب الحربی الینا مستامناً لم یکن ان یقیم فی دارنا سنة، و یقول له الإمام إن أقمت تمام السنة وضعت علیک الجزیة**" (ہدایہ ۲/ ۵۶۶)۔

۵– دارالحرب میں لوہے کی کان دریافت ہو یا ایسی چیزیں جن سے اس ملک کی دفاعی قوت میں اضافہ ہوتا ہو تو مسلمان ماہرین کے لئے کان کنی، اور ایسی مفید صنعتی معلومات اور ٹکنالوجی کی منتقلی درست نہ ہوگی۔

"**ولو أصاب المستامن معدن حدید فی دار الحرب فانه یکرہ له ان یعمل فیه ویستخرج منه الحدید**" (السیر الکبیر ۴/ ۱۴۷۷، ولا غیر ذلک مما یتقوون بہ علی المسلمین فی الحرب ۴/ ۱۴۷۶)۔

٦– دارالحرب کے مسلمان باشندوں پر واجب ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں، البتہ مختلف لوگوں کے حالات کے اعتبار سے ابن قدامہ نے دارالحرب کے مسلمان باشندوں کی تین قسمیں کی ہیں:

اول: وہ جن پر ہجرت واجب ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے دارالحرب میں اپنے ایمان کا اظہار ممکن نہ ہو، اور وہ واجبات دین کی ادائیگی سے قاصر ہوں، نیز وہ ہجرت کرنے پر قادر بھی ہوں، جن کا سورہ انفال (آیت ١٠) میں حکم دیا گیا ہے۔

دوم: وہ لوگ جو بیماری، خواتین اور بچوں یا حکومت کے جبر و دباؤ کی وجہ سے ہجرت پر قادر نہ ہوں، ہمارے زمانہ میں دوسرے ملکوں میں شہریت حاصل کرنے میں جو دقتیں حاصل ہیں وہ بھی منجملہ انہی اعذار کے ہیں، ایسے لوگوں پر ہجرت واجب نہیں، اور یہی حضرات "**الا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا**" کے مصداق ہیں۔

سوم: وہ لوگ جو دارالحرب میں اپنے اسلام کا اظہار کر سکتے ہوں، فرائض دینی کو ادا بھی کر سکتے ہوں اور ہجرت پر بھی قادر ہوں، ایسے لوگوں کے لئے ہجرت کرنا محض "مستحب" ہے، جیسا کہ حضرت عباسؓ نے ایمان لانے کے بعد مکہ سے ہجرت نہیں فرمائی اور حضرت نعیم نحام نے اپنی قوم بنوعدی کی خواہش پر قبول اسلام کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہجرت نہیں کی (المغنی مع الشرح الکبیر ١٠/ ٥١٤)۔

٧– مسلمان زوجین میں سے ایک دارالحرب سے دارالاسلام ہجرت کر جائیں یا دارالاسلام سے منتقل ہو جائیں اور دارالحرب میں توطن اختیار کر لیں تو "تباین دارین" کی وجہ سے دونوں میں تفریق ہو جائے گی۔

٨– دارالحرب میں کافر زوجین میں سے ایک اسلام قبول کر لیں تو مسلمانوں کے نظام قضا کے فقدان کی وجہ سے دوسرے فریق پر اسلام کی پیش کش نہ کی جائے گی بلکہ تین حیض

گذر جانے کے بعد از خود زوجین میں تفریق ہوجائے گی جب کہ دارالاسلام میں دوسرے فریق پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردے تب دونوں میں تفریق عمل میں آئے گی۔

۹ — امان حاصل کرکے جانے والے مسلمان تجار دارالحرب کے باشندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسلام کے مالی قوانین کے پابند نہ ہوں گے، ہاں یہ ضروری ہوگا کہ ان کے ساتھ دھوکہ دہی نہ کریں۔ چنانچہ اگر مسلمان تجار حربیوں سے شراب، یا خنزیر یا مردار خرید کرکے اس کی قیمت حاصل کرلیں یا قمار یا جوئے کے ذریعہ مال حاصل کریں تو یہ اس کے لئے حلال ہوگا۔

"المسلم الذی دخل دارالحرب بأمان إذا با ع درهما بدرهمين أو با ع خمرا أو خنزيرا أو ميتةً أو قامرهم وأخذ المال يحل"

اسی اصول کی بنیاد پر دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کی بھی اجازت دی گئی ہے، البتہ یہ رائے امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی ہے، جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ۔

۱۰ — بنیادی اور اصولی طور پر دارالحرب کے باشندوں کی جان اور مال معصوم نہیں ہے، یہاں تک کہ دارالحرب میں رہنے والا مسلمان بھی اس کے حکم سے مستثنیٰ نہیں ہیں، ابن نجیمؒ کا بیان ہے:

"وحكم من أسلم فی دار الحرب ولم يهاجر كالحربی عند أبی حنيفة لأن ماله غير معصوم عنده" (البحر الرائق ۵/۱۴۷)۔

اور اس شخص کا حکم جو دارالحرب میں مسلمان ہو اور ہجرت نہیں کی حربی کا ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک، اس لئے کہ اس کا مال امام صاحب کے نزدیک معصوم نہیں ہے۔

دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کی جان کو بھی غیر معصوم تسلیم کیا گیا ہے، ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں:

”لا قيمة لدم المقيم فی دارالحرب بعد إسلامه قبل الهجرة الينا“ (احکام القرآن للجصاص ۲/۲۹۷)۔

قبول اسلام کے بعد بھی جو دارالحرب میں مقیم ہوں، ان کے ہجرت کرکے ہمارے یہاں آنے سے پہلے ان کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔

اس بنا پر دارالحرب میں مقیم کسی مسلمان کو دوسرا مسلمان قتل کردے اور وہ دارالاسلام میں بھاگ آئے تو یہاں اس پر قانون قصاص جاری نہ ہوگا، ہاں مسلم مملکت میں جو غیر مسلم آباد ہوں جن کو ”ذمی“ کہا جاتا ہے، اسی طرح وہ حربی جو امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوئے ہوں، ان کی جان و مال کفر کے باوجود معصوم متصور ہوں گے، اسی لئے ان سے سودی کاروبار وغیرہ درست نہیں ہوگا (بدائع الصنائع ۷/۱۳۲)۔

۱۱- دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کیلئے بہت سے احکام میں ناواقفیت کا اعتبار ہے کہ دارالاسلام میں انہی میں ناواقفیت کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

غور کیا جائے تو دارالحرب کے یہ احکام تین اصولوں پر مبنی ہیں:

اول: یہ کہ دارالحرب، دارالاسلام کی حدود ولایت سے باہر ہے۔

دوم: یہ کہ دارالحرب کے باشندے اسلام کے خلاف محارب اور برسر پیکار ہیں، اس لئے ان کو جانی و مالی نقصان پہنچانا اصولی طور پر درست اور جائز ہے۔

سوم: دارالحرب میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے احکام اسلامی سے ان کا بے خبر ہونا ایک گونا قابل عفو ہے۔

دارالامن کے احکام:

انہی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے دارالامن کے احکام متعین کرنے ہوں گے، جہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ یہ دارالاسلام کی حدود ولایت سے باہر ہوتا ہے، لیکن یہ ملک آئینی

طور پر اسلام کے خلاف محارب نہیں ہوتا اور مسلمانوں کو مذہبی اور دعوت وتبلیغ کی آزادی ہوتی ہے، لہذا دارالامن کے احکام حسب ذیل ہوں گے:

۱– دارالامن میں اسلامی حدود وقصاص جاری نہ ہوں گے۔

۲– دارالامن کے مسلمانوں اور باشندوں کے معاملات دارالاسلام کی عدالت میں فیصل نہ ہوسکیں گے۔

۳– یہاں کے مسلمان باشندوں پر ہجرت واجب نہیں ہوگی۔

۴– یہاں کی دفاعی قوت میں اضافہ اور مدد مسلمانوں کے لئے درست ہوگا، جیسا کہ صحابہ نے شاہ حبش نجاشی کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تھی۔ بشرطیکہ وہ کسی مسلم ملک سے برسر پیکار نہ ہو۔

۵– احکام شرعیہ سے ناواقفیت اور جہل کے معاملہ میں جسطرح دارالحرب کے مسلمانوں کو معذور سمجھا جائے گا اسی طرح ان کو معذور نہیں سمجھا جائے گا۔

۶– زوجین میں سے ایک دارالامن سے دارالاسلام میں چلے جائیں تو ان کے درمیان محض ''تباین دار'' کی وجہ سے تفریق واجب نہ ہوگی، کیونکہ صلح وامن کی فضا کی وجہ سے آمدورفت اور حقوق زوجیت کی تکمیل ممکن ہے۔

۷– زوجین میں سے ایک اسلام قبول کرلیں تو تفریق میں وہی قانون نافذ ہوگا جو دارالحرب کا ہے، کیونکہ دارالاسلام کے قاضی کو اختلاف دار کی وجہ سے ولایت حاصل نہیں ہے، اور خود اس ملک میں مسلمانوں نے باہمی تراضی سے قاضی مقرر کیا ہے تو اس کو صرف مسلمان ہی پر ولایت حاصل ہے، دوسرا فریق جو حالت کفر میں ہے اس پر ''قاضی المسلمین'' کی ولایت ثابت نہیں۔

۸– جیسے دارالاسلام میں رہنے والے ''ذمی'' اور دارالحرب سے آنے والے ''مستامن حربی'' کی جان ومال معصوم ہیں اور غیر اسلامی طریقوں سود، قمار، شراب وخنزیر کی

فروخت وغیرہ کے ذریعہ ان کے مال کا حصول جائز نہیں، اسی طرح ''دارالامن ثانی'' کے دوسرے باشندوں کے ساتھ معاہدہ وامن کی وجہ سے ان کے جان ومال بھی معصوم ہیں، اوران غیر شرعی طریقوں پر ان کا حصول جائز نہیں۔

موجودہ دور کے غیر مسلم ممالک:

موجودہ دور میں جو غیر مسلم مملکتیں ہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جو اسلام یا مطلقاً مذہب کی معاند ہیں، جہاں نہ مذہبی تشخصات کے ساتھ مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں، جیسے کمیونسٹ بلاک کے ممالک یا بلغاریہ وغیرہ، دوسری قسم کے ممالک وہ ہیں جہاں مغربی طرز کی جمہوریت رائج ہے، جن میں یا تو سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور تمام قومیں اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوتی ہیں، جیسے خود ہمارا ملک ہندوستان ہے، یا سلطنت کا ایک مذہب ہوتا ہے لیکن دوسری مذہبی اقلیتیں بھی اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہوتی ہیں، اوران کو اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی اجازت ہوتی ہے، جیسے امریکہ، برطانیہ وغیرہ، ایک آدھ ملک ایسے بھی ہیں جہاں قدیم بادشاہت باقی ہے، لیکن وہاں بھی مذہبی اقلیتوں کو مذہبی حقوق حاصل نہیں۔

میرے خیال میں پہلی نوع کے ممالک یعنی کمیونسٹ ممالک ثانی دارالحرب ثانی کے زمرہ میں ہیں، گو بعض کمیونسٹ ممالک میں مذہبی آزادی اور اظہار رائے وغیرہ کے حقوق میں ایک گونہ نرمی پیدا کی گئی ہے، تاہم اب بھی وہ دارالحرب ہی ہیں، اس کے علاوہ جو ممالک ہیں وہ سبھی ''دارالامن'' میں شمار کئے جا سکتے ہیں اور یہ اور بات ہے کہ مختلف ملکوں میں مذہبی حقوق کے معاملہ میں ایک گونہ تفاوت بھی پایا جاتا ہے، ہندوستان ان ممالک میں ہے جس کے دارالامن ثانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، جمہوری نظام کی وجہ سے مسلمان اس ملک کے اقتدار میں شامل ہیں، عبادت اور عقیدہ وضمیر کی آزادی کے معاملہ میں ان کو وہی حقوق حاصل ہیں جو اکثریتی فرقہ کو حاصل ہے، دعوت وتبلیغ کی اجازت بہت سے مسلم ممالک سے زیادہ یہاں ہے،

شخصی قوانین جتنے ان کے محفوظ ہیں اکثریتی فرقہ کے بھی نہیں ہیں۔ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہے، رہ گئے فرقہ وارانہ فسادات اور ان میں بعض طبقوں کی طرف سے تعدی کا پایا جانا جو قانون ملکی کے لحاظ سے ایک غیر آئینی فعل ہے اور جرم ہے، تو پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ کسی ملک کے ''دارالامن'' ہونے کے مغائر نہیں، اس لئے یہاں خرید و فروخت اور دوسرے مالی قوانین میں احکام شرعیہ کی پیروی ضروری ہوگی، اور مسلمانوں کے لئے ''سود'' حرام ہوگا۔

۴- بینک انٹرسٹ کا مصرف:

بینک سے حاصل ہونے والا نفع قرض پر حاصل کیا جانے والا نفع ہے، لہذا ''ربا'' ہے، اس نفع کا بینک میں چھوڑنا ایک سودی کاروبار میں مزید تعاون ہے، اور غالباً ایسی رقوم کا استعمال کبھی ایسی مدات میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ کفر کو تقویت پہنچتی ہے، اس لئے بطریق ''استحسان'' اس کا نکال لینا واجب ہے، سرکاری اور غیر سرکاری بنک دونوں کا حکم مساوی ہے، کیونکہ سرکاری بنک سے ملنے والا سود ''افراد'' سے وصول کیا جاتا ہے، اور سرکاری بنک کے واسطہ سے پوری قوم سے سود وصول کیا جاتا ہے، مگر وہ خود بھی اس کا ایک فرد ہے، لیکن پوری قوم کے مقابلہ اس کا ''وجود'' اتنی قلیل نسبت رکھتا ہے کہ یہ دوسروں ہی سے سود حاصل کرنے کے حکم میں ہے، اس سلسلہ میں حد سرقہ وغیرہ کے بعض احکام سے جن میں بیت المال کی چوری پر حد سرقہ کا نفاذ عمل میں نہیں آتا غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہئے، اس لئے کہ ''حدود'' معمولی شبہات کی وجہ سے معاف کر دی جاتی ہیں، جب کہ ربا کا معمولی شبہ **''دعوا الربا والريبة''** کے تحت اس کو حرام کر دیتا ہے۔

بعض بزرگوں نے اس رقم کا مصرف فقراء و مساکین کو قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مال جسے اس کے مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہو فقہاء نے اسے واجب

التصدق قرار دیا ہے، جیسا کہ عالمگیری اور شامی وغیرہ کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں تفصیل یوں ہے کہ مدات آمدنی چار ہیں:

۱—زکوۃ وعشر جن کا مصرف خود قرآن نے متعین کر دیا ہے۔

۲—مال غنیمت اور زمین سے نکلنے والی کانوں اور دفینوں کا خمس، ان کا مصرف یتامی، مساکین اور مسافرین ہیں۔

۳—تیسرے خراج وجزیہ اور معاہدہ کے تحت غیر مسلم ممالک واقوام ومملکت اسلامی میں اجنبی ممالک سے آنے والے تجّار سے لیا جانے والا ٹیکس۔ یہ رقم رفاہی امور مثلاً سرحدوں کی حفاظت، قلعوں کی تعمیر، راستے میں حفاظتی چوکیوں کے قیام، پلوں کی تعمیر اور نہر و آب رسانی کے نظم، مسافرخانے اور مسجدوں کی عمارت اور سرکاری ملازمین کی تنخواہ نیز اساتذہ و طلبہ کے وظائف پر خرچ کی جائے گی۔

۴—چوتھے مال لقطہ اس سے غریب مریضوں کے اخراجات، دوا ومعالجہ، تجہیز وتکفین اور بے روزگار اور بے سہارا لوگوں کے اخراجات وغیرہ پورے کئے جائیں گے (ہندیہ ۱؍۱۹۰—۱۹۱)۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ قتال اور جنگ کے بغیر جو مال بیت المال کو حاصل ہو وہ مسلمانوں کے مصالح عامہ پر خرچ کیا جائے گا، جیسے سرحدوں اور قلعوں کی تعمیر اور قاضی وغیرہ کی تنخواہ (ہدایہ ۲؍۶۰۰ طبع مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

صاحب درمختار نے بیت المال کی حاصل ہونے والی آمدنی اور اس کے مصارف کے سلسلہ میں محمد بن شحنہ کے چند اشعار نقل کئے ہیں، جس میں ''ضوائع نی نی یعنی لقطہ، لاوارث کے متروکہ یا متروکہ کا ایسا حصّہ جس کا کوئی حقدار نہ ہو کا مصرف یوں بیان کیا گیا ہے۔

ورابعها فمصرفه جهات تساوى النفع فيها المسلمون

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مصالح مسلمین میں لقطہ وغیرہ کو خرچ کیا جا سکتا ہے۔
علامہ شامی نے لکھا ہے کہ یہی رائے امام فخر الاسلام بزدوی کی ہے کہ یہ آمدنی مساجد،

سرحدات، مسافر خانے اور پلوں کی تعمیر میں بھی صرف کی جاسکتی ہے (ردالمحتار ۲/۵۸)۔ محمد ابن شحنہ کے ان اشعار کے نقل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود صاحب درمختار کا رجحان بھی اسی طرف ہے، عالمگیری کی عبارت میں لقطہ کی آمدنی کو تکفین میت میں استعمال کی اجازت دی گئی ہے، اور اسے امام طحاوی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ اور اس طرح کی دوسری آمدنی جس کا کوئی مالک موجود نہ ہو ایسے مدات میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے، جس میں تملیک نہ پائی جاتی ہو، شامی نے گو بزدوی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے، اور زیلعی اور صاحب ہدایہ کی نقل کو ترجیح دی ہے کہ یہ رقم فقراء پر خرچ کی جائے گی لیکن زیلعی سے جو مصارف نقل کئے گئے ہیں ان میں تکفین میت بھی ہے، اور یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ میت کی تجہیز و تکفین فقہاء کے نزدیک تملیک کا حکم نہیں رکھتی، اسی طرح علامہ سرخسی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام لقطہ سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مضاربت کے لئے دے سکتا ہے، اور قرض پر لگا سکتا ہے (المبسوط ۱۱/۴)۔ ان نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بنک انٹرسٹ کو عام رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، اس میں شبہ نہیں کہ مال لقطہ وغیرہ کو بعض فقہاء نے فقراء پر صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن وہ اس اصل پر مبنی ہے کہ صدقہ کرنے کا مقصود اصل مالک سامان کو ثواب پہنچانا ہے۔

"ان الملتقط له ان يتصدق بها بعد التعريف على ان يكون ثوابها لصاحبها ان اجاز وان ابى فله الضمان على المتصدق" (المبسوط ۴/۴)۔

جبکہ بنک انٹرسٹ کے خرچ کرنے کا مقصد محض مال حرام کو اپنی ملکیت سے نکالنا ہے، یہی وجہ ہے کہ **"لا صدقة فی غلول"** کے تحت اس مال میں صدقہ اور ثواب کی نیت کرنا بھی جائز نہیں ہے، جلال الدین سیوطی نے بھی ایسے مال کو جس کا مالک معلوم نہ ہو کا مصرف مسلمانوں کی عام مصالح قرار دیا ہے۔

"فاما عند الياس فالمال حينئذ للمصالح، لأنها من جملة اموال بيت المال

ماجھل مالکه"(الاشباہ والنظائر للسیوطی ر ۱۷۴)۔

اسی لئے میری رائے ہے کہ بنک انٹرسٹ تمام رفاہی کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے، البتہ مساجد کی تعمیر میں اس کا استعمال اس کی حرمت وعظمت کے خلاف ہے، اس لئے اس سے منع کیا جائے گا۔

۵–سود لینے اور دینے میں فرق ہے :

فقہاء کے یہاں عام قاعدہ تو یہ ہے کہ جن چیزوں کا لینا جائز نہیں ان کا دینا بھی جائز نہیں، "**ماحرم أخذه حرم اعطاءه**"، البتہ اگر اپنے آپ سے کسی ضرورت کے دفع کرنے یا اپنے کسی جائز حق کے حاصل کرنے کے لئے کبھی ضرورت دامنگیر ہو تو فقہاء نے اس کو اسی قاعدہ سے مستثنی کیا ہے، مثلاً جان ومال کی حفاظت اور سلطان وامیر کو عدل وبرابری پر آمادہ کرنے کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

"**الرشوه لخوف علی ماله أو نفسه او یسوی امره عند سلطان او امیر**"

(الاشباہ والنظائر للسیوطی ر ۲۸۱)۔

اور اسی اصل پر ابن نجیم نے سود لینے اور دینے میں فرق کیا ہے کہ سود لینا کسی طرح جائز نہیں، لیکن حاجتمندوں کے لئے سود دینا جائز ہے

"**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**"(الاشباہ والنظائر مع الغمز ۱ر ۲۹۴)۔

موجودہ حالات میں واقعی بعض دفعہ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں کہ سودی قرض کا حصول ایک ضرورت بن جاتا ہے۔

۶–سودی قرض کب جائز ہے؟

ابن نجیمؒ نے لکھا ہے :"**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" کہ اصحاب

حاجت کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہوتی ہے۔

یہاں علامہ ابن نجیم نے حاجت کی بنا پر سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، اور کہا ہے کہ یہ منجملہ ان حاجات کے ہے جو ضرورت کا حکم رکھتی ہے، اصولیین کی اصطلاح میں حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف تو نہ ہو لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہو جائے۔

"واما الحاجیات معناها انها مفتقر الیها من حیث التوسع و رفع الضیق المؤدی فی الغالب الی الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب" (الموافقات ۳/۵)۔

یہ حاجات بعض اوقات "ضرورت" نی نی کے حکم میں تسلیم کی جاتی ہیں، اور جیسے ضرورت کی بنا پر نا جائز بقدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح حاجت کی بنا پر بھی فقہاء احکام میں سہولت پیدا کرتے ہیں، سیوطی کا بیان ہے:

" الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" (الاشباہ والنظائر للسیوطی/۱۸۰)۔

آگے سیوطی نے حاجت کی بنا پر نا جائز ہونے کی جو مثال دی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ امام نوویؒ نے مقصد تعلیم کے لئے عورت کے غیر محرم کے سامنے ہونے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ علامہ سبکیؒ کا قول نقل کیا ہے:

"قد کشفت کتب المذاهب فا نما یظهر منها جواز النظر للتعلیم فیما یجب تعلمه و تعلیمه کالفاتحة" (الاشباہ والنظائر للسیوطی/۱۸۱)۔

میں نے کتب مذاہب پر نظر ڈالی جس سے اندازہ ہوتا ہے ایسے امور کی تعلیم وتعلم کے لئے جو شرعاً واجب کا درجہ رکھتے ہیں جیسے سورہ فاتحہ غیر محرم کو دیکھنا جائز ہے۔

گوخود سیوطی کو اس سے اتفاق نہیں تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات فقہاء نے معمولی مشقت کو بھی ''حاجت'' کے تحقق اور حکم میں تخفیف اور توسیع کے لئے کافی سمجھا ہے، فقہاء کی آراء سامنے رکھی جائیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اشخاص و افراد کے لئے جس درجہ کی مشقت کو گوارا کیا گیا ہے، اگر اس سے امت کے اجتماعی حالات متعلق ہوجائیں اور وہ ''عموم بلوی'' کا درجہ اختیار کر لے تو وہی مشقت احکام میں تخفیف اور سہولت کا باعث بن جاتی ہے، جیسا کہ فقہاء نے ضرورت عامہ کو سامنے رکھ کر ''خیار نقد ثمن'' خیار غبن فاحش اور بعض مشائخ بلخ و بخارا نے بیع بالوفاء کے جواز کا فتوی دیا ہے (الاشباہ مع الحموی ۱/۲۵۷)۔

اسی طرح خلاف قیاس بعض فقہاء نے ''ضمان درک'' کو جائز رکھا ہے (الاشباہ والنظائر للسیوطی/۱۸۰)۔ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ افراد و اشخاص کے لئے بھی حاجت اور مشقت کا کوئی ایسا بے لچک پیمانہ نہیں رکھا جا سکتا جو سب کے لئے مساوی ہو بلکہ لوگوں کے حالات، عادات اور مختلف علاقوں کے عرف و رواجات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر ہی حاجت اور مشقت کا تعین کرنا ہوگا، فقہاء کے یہاں اس کی نظیریں موجود ہیں، مثلاً حجاج کے لئے زاد و راحلہ کا مسئلہ ہے، ابن ہمام نے لکھا ہے: **''یعتبر فی حق کل انسان ما یصح معه بدنه''** اسی طرح کی بات نفقہ وغیرہ کے متعلق فقہاء نے لکھی ہے، پس اس سے اصولی طور پر یہ بات منقح ہوتی ہے کہ:

(الف) عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

(ب) ضرورت یعنی ایسے حالات میں جب کہ کھانے، کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لئے سودی قرض کے سوا چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی نوبت ہو تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

(ج) حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا

ضرر کا اندیشہ ہو تو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی، جیسے غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لئے اس پر مجبور ہو یا انکم ٹیکس وغیرہ کے ناواجبی قانون سے بچنے کے لئے ایک قانونی ضرورت بن گئی ہو۔

(د) مشقت کے معاملہ میں ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہوں، نسبتاً زیادہ تخفیف برتی جاسکتی ہے۔

(ھ) اشخاص وافراد کے لئے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات اور ان کے علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائے گا۔

۷- ترقیاتی قرضے:

جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ ایسے ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود کمانا نہیں ہوتا بلکہ عوام کے لئے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر اس پر لئے جانے والے قرضے کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا مفتی نظام الدین صاحب حال مفتی دارالعلوم دیو بند کا رجحان ہے (نظام الفتاوی جلد اول)۔ تاہم یہ بات اس لئے تشفی بخش نہیں معلوم ہوتی ہے کہ سودی قرضوں پر وصول کی جانے والی شرح قرض کی مقدار کے لحاظ سے اور اسی تناسب سے کم وبیش ہوتی ہے، اگر یہ دفتری اجرت ہوتی تو ضرور تھا کہ یہ فرق نہ پایا جاتا، کیونکہ رقم پچاس ہزار ہو یا پانچ ہزار دفتری کارروائی میں وقت اور محنت یکساں لگتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کو رشوت والے مسئلہ پر ایک درجہ میں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ رشوت دینے والا بھی اپنے ایک حق جائز کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے، اور سودی قرض لینے والا بھی سرکاری خزانوں پر اپنے حق قرض کی وصولی کے لئے سود دینے پر مجبور ہے، تاہم چونکہ ان دونوں حقوق میں بہت تفاوت ہے اس لئے کہ حکومت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مرفہ الحال لوگوں کو مزید معاشی خوشحالی کے لئے قرض دیتی چلی جائے،

اس لئے اس قرض کو بھی ایسی صورت کے ساتھ مشروط رکھنا چاہئے کہ کاروبار کا بقا اور تحفظ اس کے بغیر دشوار ہو جائے۔

۸— سود کا تحقق اس وقت ہوگا جب ایک طرف سے ایسا ''فضل نی نی ہو کہ دوسری طرف سے اس کا کوئی عوض نہ ہو، لہذا یہ صورت سود میں داخل نہ ہوگی۔

۹—غیر ملکی درآمدات و برآمدات پر سود:

ربا قرض پر نفع حاصل کرنے کا نام ہے، مذکورہ صورت میں مثلاً پانچ سو روپے کی ایک چیز کسی ملک سے چلتی ہے اور دوسرے ملک میں سو روپے کے اضافہ کے ساتھ اس کی قیمت چھ سو روپے ہوگی اور اس دوسرے ملک میں خریدار نے چھ سو روپے میں حاصل کرلیا تو یہ میرے نزدیک اس سامان کی اصل قیمت ہے، سود نہیں، کیونکہ پہلے دئے ہوئے کسی قرض پر نفع نہیں ہے، اسی طرح جو مال باہر بھیجا جائے اس کی قیمت اندرون ملک پانچ سو مشخص ہو اور بیرون ملک چھ سو میں وصول کیا جائے تو یہ بائع کی طرف سے زیادہ فی الثمن ہے، نہ کہ سود۔

۱۰— سرکاری بنک میں چونکہ ایک جہت یہ ہے کہ اس پر تمام جمہور کا حق ہے ایک درجہ میں قرض حاصل کرنے کا بھی حق ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے امام کو بیت المال سے قرض دینے کا حق دیا ہے (تبیین الحقائق ۳؍۲۰۷)، اس لئے اس سے سودی قرض حاصل کرنے کا معاملہ دوسرے بنکوں کے مقابلے میں نسبتاً خفیف اور کمتر ہے۔

۱۱— ہاں اگر سرمایہ کار قرض خواہ کی توجہ دور کرتا ہے اور اضافہ کے ساتھ واپس لیتا ہے تب تو یہ سود ہی ہے، پس اگر ٹرک کا حصول اس کے لئے حاجت کا درجہ رکھتا ہو اور انکم ٹیکس کے قانون سے بچنے کے لئے سودی قرض حاصل کرنا پڑے یا قانونی طور پر حصول کے لئے بھی رشوت دینی پڑے، تو اس کی اجازت ہونی چاہئے، نیز اگر سرمایہ کار براہ راست مالکان ٹرک کو قیمت ادا کرے اور قبضہ کر کے خریدار کے حوالے کرے تب تو یہ معاملہ سود میں داخل نہ ہوگا۔ ''بیع

مرابحہ نی نی کے قبیل سے ہوگا۔

جواب ضمیمہ سوالات ــ :۲

۱ــ مذکورہ صورت میں صورت حال یہ ہے کہ مالکان اراضی کو حکومت نے ابتداءً جو قیمت ادا کی ہے وہ اس کے بحیثیت ''ثمن نی نی قبول کرنے پر راضی نہیں ہے، اس لئے ثمن ابھی متعین ہی نہیں ہوئی ہے، عدالت جس وقت رقم کا تعین کرتی ہے ادائیگی کا حکم دیتی ہے، اسی وقت دراصل شئی مقرر ہوتی ہے، لہذا خیال ہے کہ عدالت نے جو رقم مقرر کی اور اس پر جو شرح سود عائد کیا ہے، ان سب کے مجموعہ کو ''ثمن نی نی تصور کیا جائے اور اس کو جائز سمجھا جائے۔

۲ــ ''زرعی ترقیاتی قرضوں'' کی جو صورت لکھی گئی ہے، فقہی اعتبار سے اس پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اجرت کے لئے فقہاء کے نزدیک اجرت کی قطعی مقدار کا متعین ہو جانا ضروری ہے، اس کے بغیر اجرت مجہول اور غیر متعین تصور کی جاتی، اور چونکہ ایسی صورت میں عام طور پر نزاع پیدا ہو جاتی ہے اس لئے احتیاطاً فقہاء اس صورت کو منع کرتے ہیں، تاہم ایسی جہالت اور عدم تعیین اگر معاشرہ میں مروج ہو جائے اور باعث نزاع نہ بنتی ہو تو اس کو بھی گوارا کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں خاتم المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی یہ تحریر خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے:

کبھی نزاع کے اندیشہ سے معاملہ فاسد ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی دوسرا سبب گناہ نہیں ہوتا، ایسے معاملات میں اگر نزاع کی نوبت نہ آئے تو میرے نزدیک دیانۃً یہ معاملہ جائز رہے گا گو قضاء فاسد رہے گا، کیونکہ فساد کی اصل علت یعنی نزاع نہیں پائی گئی (فیض الباری ۳/۲۵۸، کتاب البیوع)۔

لیکن مشکل ہے کہ قرض کی مقدار پر اس کے تناسب سے اجرت کا حصول اور مدت ادائیگی میں اضافہ کے ساتھ اس پر اضافہ اپنی ظاہری شکل کے لحاظ سے بعینہ سود ہے اور بظاہر کوئی مناسب تاویل نظر نہیں آتی، اس لئے یہ ہے تو سود ہی، البتہ عام اصول کے مطابق بوقت

☆مفتی دار العلوم دیوبند۔

''خافت نی نی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور چونکہ یہ اسکیم حکومت کی طرف سے ہے، اس لئے بہ نسبت پرائیوٹ کمپنیوں کے اس سے استفادہ کا معاملہ خفیف ہے۔

۳– کسی اضافہ کے سود ہونے اور نہ ہونے اور اس کی وجہ سے حرمت وحلت کا تعلق تنہا لینے والے کی نیت سے نہیں ہے، بلکہ دینے والے کی نیت اور معاملہ کی ظاہری صورت سے بھی ہے، اس لئے یہ صورت سود ہی کے حکم میں ہے اور ناجائز ہے۔

۴– مذکورہ صورت میں ۱۹۶۵ء کی رقم کی مدت خرید میں ۲۴ سال کی مدت میں جو کمی واقع ہوئی ہے اور جس کا اندازہ سونے کی قیمت میں تفاوت سے کیا جا سکتا ہے، اتنی مقدار اس کے لئے جائز ہوگی، ۶ فیصد سالانہ کی شرح سود کا جتنا حصّہ اس سے زیادہ ہو وہ سود ہی کے حکم میں ہے، اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو بنک انٹرسٹ کا ہے۔

☆☆☆

موجودہ سودی بینکنگ نظام
اور
معاشی مسائل کا حل

مفتی حبیب الرحمن خیرآبادی ☆

موجودہ دور میں لین دین اور تجارتی معاملات بڑی حد تک سود پر چل رہے ہیں، کیونکہ تجارت وزراعت کا انحصار عام طور پر بینکوں پر ہو گیا ہے جو تمام کے تمام سودی کاروبار پر مبنی ہیں، حکومت کے ترقیاتی منصوبوں میں عوام کی ترقی وخوشحالی کے لئے بہت سے شعبے قائم کئے گئے ہیں، جس کے ذریعہ بینک قرض دیتا ہے اور اس پر برائے نام سود وصول کرتا ہے، چھوٹی صنعتوں سے لیکر بڑے بڑے فیکٹری پلانوں تک میں حکومت قرض دیتی ہے اور غیر مسلم اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور اقتصادی میدان میں ترقی کر رہے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے اہم مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اگر مسلمان بینک کے ترقیاتی منصوبوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو سود کی لعنت اس کے لئے رکاوٹ کا باعث بنتی ہے، اور اگر اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی اقتصادی ومعاشی زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے، ان ہی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پیش کردہ سوالات کا نمبر وار جواب تحریر کیا جا رہا ہے:

۱- الف: ربوا کی تعریف:

اموال ربویہ معصوم متقوم واجب الضمان میں عقد معاوضہ کیا جائے اور کسی ایک جانب زیادتی ہو تو اس کو ربوا کہتے ہیں، اور بعض علماء نے یہ تعریف کی ہے کہ وہ حقیقی یا حکمی زیادتی جو معاوضات میں کسی عوض کے بغیر مشروط ہو، مثلاً چاندی کا ایک روپیہ دے کر اس کے عوض میں چاندی کے دو روپے لئے جائیں تو اس میں حقیقی زیادتی پائی جاتی ہے اور چاندی کے عوض چاندی برابر مگر ادھار فروخت کی جائے تو اس میں حکمی زیادتی پائی جاتی ہے اور قرض انتہاء کے لحاظ سے معاوضہ ہے، لہذا اس میں نفع لینا حرام ہے اور ہدیہ وغیرہ میں معاوضہ وغیرہ کا ذکر نہیں ہوتا، اس لئے وہاں زیادتی حلال ہے اور بغیر شرط کے کچھ لیا یا دیا جائے، اس کا ربوا سے کوئی تعلق نہیں وہ احسان وتبرع ہے۔

ب- ربوا کا دائرہ:

یوں تو منصوص طریقہ پر چھ چیزوں کے ہم جنس لین دین کے بارے میں کمی زیادتی یا ادھار معاملہ ہونے پر حدیث میں صراحت کے ساتھ حکم لگایا گیا ہے (الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل يداً بيد)۔

سونا سونے کے بدلہ میں چاندی چاندی کے بدلے میں، گیہوں گیہوں کے بدلہ میں جو جو کے بدلہ میں چھوہارا چھوہارے کے بدلہ میں، نمک نمک کے بدلہ میں لیا دیا جائے تو دونوں طرف برابر ہونا ضروری ہے اور ہاتھ در ہاتھ یعنی نقد معاملہ ہونا ضروری ہے کسی ایک طرف کمی یا زیادتی ہوگئی یا ادھار معاملہ کرلیا تو یہ دونوں صورتیں ربوا کی ہوجائیں گی۔

جس نے زیادہ دیا یا زیادہ مانگا اس نے سود کھایا۔ اور اس میں زیادہ لینے والا اور دینے والا دونوں سود کے گناہ میں برابر شریک ہوں گے۔ الآخذ والمعطى فيه سواء۔

لیکن ائمہ مجتہدین نے اشیاء مذکورہ سے علت کا استنباط کر کے دوسری اشیاء میں بھی

ربوا کا حکم جاری فرمایا ہے، شافعیہ نے کھائی جانے والی چیزوں میں طعم اور نقود میں ثمینت کو علت قرار دیا ہے، مالکیہ نے قوت اور اڈّخار کو علت مانا ہے، حنفیہ کے نزدیک قدر اور جنس علت ہے، قدر سے مراد وہ چیزیں ہیں جو کیل کر کے یا وزن کر کے بکتی ہیں، یعنی خرید و فروخت میں دونوں جانب کیلی یا دونوں جانب وزنی ہوں یا دونوں طرف جنس بھی ایک ہو یعنی ایک طرف گیہوں ہوں تو دوسری طرف بھی گیہوں ہوں، پس جس وقت قدر اور جنس ہر دو میں اتحاد ہوگا تو برابری اور نقد ہونا ضروری ہے، ورنہ سود ہو جائے گا۔

اگر بدلین کے درمیان قدر اور جنس میں اتحاد نہیں مثلاً صرف قدر میں اتحاد ہو لیکن جنس دونوں کی مختلف ہوں، جیسے جو کی بیع گیہوں کے ساتھ کہ یہ دونوں کیلی ہیں مگر جنس میں اختلاف ہے یا صرف جنس میں اتحاد ہو اور وہ دونوں قدرتی نہ ہوں جیسے کپڑے کی بیع کپڑے کے ساتھ تو ان دونوں صورتوں میں نقد معاملہ کرنا کمی بیشی کے ساتھ جائز لیکن ادھار نا جائز اور ربوا ہے ''**فاذا اختلفت الاجناس فبیعوا کیف شئتم اذا کان یدا بید**''۔

اور جہاں قدر اور جنس میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ پائی جائے جیسے کپڑا چائے کے ساتھ فروخت کیا تو وہاں ربوا کی کوئی صورت نہیں پائی جائے گی، کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا اور ادھار بیچنا دونوں طرح درست ہے۔

علاوہ ازیں ربوا کا دائرہ کچھ اور بھی پھیلا ہوا ہے، مثلاً قرضدار اپنے قرض خواہ کو کچھ ماہانہ یا روزانہ (علاوہ ادائیگی قرض) یا کوئی مقدار شرط کے مطابق دے، یا اس شرط پر سو روپے قرض دے کہ میں ۱۱۰ (ایک سو دس) روپئے وصول کروں گا تو یہ بھی ''**کل قرض جر نفعاً فھو ربوا**'' کے تحت ربوا ہوگا، اسی طرح مرتہن اگر راہن سے کچھ پائے یا شئی مرہون سے فائدہ اٹھائے تو یہ بھی ربوا ہے، نیز ایک شریک (پارٹنر) دوسرے شریک کا نفع مقرر کر دے اور تمام فوائد اور نقصانات کا خود مستحق بن جائے تو یہ صورت بھی ربوا میں داخل ہوگی، بیوع فاسدہ میں بھی ربوا کی صورت پائی جاتی ہے، مقروض اگر قرض کے دباؤ میں کوئی ہدیہ پیش کرے یا کوئی منفعت کی چیز پیش کرے تو اس کا قبول کرنا بھی ربوا میں شامل ہے۔

۲ – دار الحرب میں سودی معاملات:

یہ مسئلہ ہمارے ائمہ حنفیہ کے درمیان مختلف فیہ ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں کافروں سے جو معاہد نہ ہوں اور اس حربی سے جو مسلمان ہو کر دار الحرب میں رہتا ہو اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہ کرے ایسے لوگوں سے سود لینا ان کی رضا مندی سے بغیر کسی عذر اور خیانت کے مباح ہے، نیز اس کے علاوہ تمام عقود فاسدہ اور قمار کے ذریعہ حاصل شدہ مال بھی لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن مال کی اباحت سے عقود فاسدہ و باطلہ وقمار کا معاملہ کرنے کی اباحت ثابت نہیں بلکہ اس عقد کے باعث وہ گنہگار ہوگا۔

"المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون" (شامی)۔

چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، ذخیرہ اندوزی، قمار بازی وغیرہ کا معاملہ کرنا معصیت سے خالی نہیں لیکن اگر ایسا کرلیا تو حاصل شدہ رقم مباح رہے گی۔

اور علامہ شامی نے کافی کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ اگر دار الحرب میں حربیوں کے ہاتھ ایک درہم دے کر دو درہم کے عوض نقد ہو یا ادھار جس طرح بھی بیع کی، خمر، خنزیر یا میتہ کے عوض بیع کی تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ دار الحرب میں مسلمان کے لئے حربیوں کا مال ان کی رضا سے لینا درست ہے (ہدایہ ۲/ ۸۶، شامی ۳/ ۳۵۴ باب المستامن، شرح السیر الکبیر ۳/ ۱۱۲، ۲۲۶، البنایہ شرح الہدایہ للعینی/ ۷۵)۔

لیکن امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ یہ فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں کسی مسلم اصلی سے یا ذمی سے یا اس حربی سے (جو اسلام لا کر ہجرت کے بعد دار الحرب کی طرف لوٹ گیا ہو) سود لینا یا کسی کو سود دینا بالاتفاق حرام ہے، لقوله تعالى: "يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"۔ دوسری آیت میں ہے: "وما آتیتم من ربا لیربو فی اموال الناس الخ" تیسری آیت میں ہے: "ولا تمنن تستکثر" چوتھی آیت میں ہے: "واحل اللہ البیع و حرم الربوا"۔ یہ قرآنی آیات قطعی اور عام ہیں جو ہر زمان و مکان کے لئے ہیں۔

سود کی حرمت چونکہ نص قطعی سے ثابت ہے احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ اور جو شخص سود سے احتراز نہ کرے اس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان و اشتہار ہے، **فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ**۔ علاوہ ازیں امام اعظم ابوحنیفہؒ نے **لا تاکلوا الربوا** والی آیت کو قرآن کی سب سے زیادہ خوفناک آیت فرمایا ہے، جیسا کہ صاحب مدارک التنزیل علامہ نسفیؒ نے لکھا ہے: **کان ابو حنیفة رضی اللہ عنہ یقول ھی اخوف آیة فی القرآن حیث وعد اللہ المؤمنین بالنار المعدة للکافرین ان لم یتقوہ فی اجتناب محارمہ** (مدارک التنزیل ج ۱ ص ۱۴۱) سود کھانے والے، کھلانے والے، سودی کھاتہ لکھنے والے، اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت آئی ہے، ان کا حشر آسیبی اور پاگلوں کی طرح بتایا گیا ہے، ان وجوہ کی بنا پر احتیاط اسی میں ہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جائے اور حضرات طرفین کے قول پر مطلقاً سود لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ نیز جب کفار بنی اسرائیل کے لئے **وأخذھم الربوا وقد نھوا عنہ** کہہ کر ممانعت کی گئی اور نجران کے کفار کے ساتھ **مالم یحدثوا حدثا او یاکلوا الربوا** کی شرط لگا کر صلح کی گئی تو مسلمانوں کے لئے سود لینا کیونکر حلال ہوسکتا ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مفتی کفایت اللہؒ نے بھی دار الحرب میں کافر حربی غیر معاہد سے سود لینے کی اباحت کا قول لکھنے کے بعد عام طور پر سود لینے کے جواز کا فتوی دینے سے منع فرمایا ہے۔

باقی رہا دار الحرب میں سود دینے کا مسئلہ تو سود دینا نہ تو حضرات طرفین کے یہاں جائز ہے، نہ حضرت امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے، بلکہ سب ہی ائمہ کرام کے نزدیک بالاتفاق سود دینا ناجائز اور حرام ہے، جیسا کہ منحۃ الخالق (۱۲۶/۶) کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

دار الحرب اور دار الاسلام:

وہ ملک جس میں امام المسلمین کا حکم جاری ونافذ ہو اور اسی کی قوت قہریہ کے تحت ملکی

نظام چلتا ہو تو اس ملک کو دارالاسلام کہا جائے گا۔ اور اگر اس میں کافروں کے بڑوں کا حکم جاری ہو اور اقتدار اعلیٰ کافر کو حاصل ہو اور اسی کی قوت قہریہ کے تحت ملک کا نظام چلتا ہو تو وہ ملک دارالحرب ہے۔

اور جامع الرموز میں ہے کہ دارالحرب وہ کہلاتا ہے جس میں مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں ئی ئی **فالظاهر ان الا باحة تفيد نيل المسلم الزيادة وقد الزم أصحاب الدرس أن مرادهم من حل الربوا والقمار ما إذا حصلت الزيادة للمسلم نظرا إلى العلة وإن كان إطلاق الجواب خلافه**" (منحۃ الخالق ۶/ ۱۲۶، شامی)۔

خواہ اس میں مسلمان ذمی پہلے امام کے ساتھ مامون ہوں یا نہ ہوں۔ خواہ اسلام کے بعض شعائر ادا ہو رہے ہوں یا نہ ادا ہو رہے ہوں۔ اسی طرح کفر کے شعائر علانیہ ادا کئے جا رہے ہوں یا نہ ادا کئے جا رہے ہوں (فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۲/ ۵۸۴)۔

بہرحال کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار محض غلبہ وشوکت اور نظام احکام پر ہے، اگر وہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے تو وہ دارالاسلام ہے اور کفار ومشرکین کا غلبہ ہے تو وہ دارالحرب ہے، اگر کسی جگہ مسلمان بھی رہتے ہوں لیکن انہیں اقتدار اعلیٰ اور غلبہ وشوکت حاصل نہ ہو تو اسے دارالاسلام نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ جرمنی، فرانس، روس اور چین کو بھی دارالاسلام کہا جائے گا، اسی طرح جمعہ وعیدین کفار ومشرکین کی اجازت سے ادا کئے جانے پر بھی اسے دارالاسلام نہیں کہیں گے جس طرح دارالاسلام میں ذمی کفار اپنی تمام رسوم آزادی سے ادا کریں تو اسے دارالحرب نہیں کہیں گے، دارالحرب میں اگر حقیقۃً مسلمانوں کی جان و مال اور دین محفوظ ہو تو وہ دارالحرب ہوتے ہوئے دارالامان کہا جا سکتا ہے۔ دارالحرب والوں سے صلح و مسالمت شرعاً جائز ہے اور مسالمت کی صورت میں امن قائم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس بنیاد پر اسے دارالامان کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت:

مذکورہ بالا تعریف کی بنیاد پر بہت سے علماء کرام اور مشائخ عظام نے انگریزی دور میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے، جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، حضرت مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا غلام دستگیر قصوریؒ، حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ وغیرہم یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اسلامی احکام بطور غلبہ یہاں جاری نہیں ہیں بلکہ محکومانہ اور عاجزانہ اسلامی احکام پر عمل ہو رہا ہے۔ یہاں اقتدار اعلیٰ نصاری کو حاصل ہے اور دارالحرب کے جس قدر شرائط فقہاء نے بیان کئے ہیں وہ سب یہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں عدل وانصاف، جان و مال کا تحفظ اور مذہبی آزادی نہیں ہے، کفر کو شان وشوکت اور غلبہ حاصل ہے۔ اسلام کا پرچم سرنگوں اور کفر کا پرچم بلند ہے، جب انگریزی دور کے ہندوستان کو ان حضرات نے دارالحرب قرار دیا تو آج کا موجودہ ہندوستان انگریزی دور کے مقابلہ میں بد سے بدتر ہے، دوڈھائی ہزار فرقہ وارانہ فسادات اور حکومت کا ایک فریق بن کر مسلمانوں کی نسل کشی اس کی بین دلیل ہے، قدم قدم پر بے جا تعصب اور اہانت وتذلیل کا برتاؤ بھی واضح مثال ہے، یہ بدرجہ اولیٰ ان حضرات کے یہاں دارالحرب کہلانے کا مستحق ہے۔

علمائے کرام کا دوسرا طبقہ وہ ہے جنہوں نے انگریزی دور میں ہندوستان کی حیثیت دارالاسلام کی قرار دی ہے، جیسے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی وغیرہم۔ یہ حضرات اکابر یہ دلیل پیش فرماتے ہیں کہ ہندوستان انگریزوں کی عملداری سے پہلے متفق علیہ طور پر دارالاسلام رہا ہے یعنی ساڑھے چھ سو سال تک یہاں مسلمانوں کی حکومت اور انہیں اقتدار اعلیٰ حاصل رہا ہے، غیر مسلم یہاں ذمی کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اب دارالاسلام کن چیزوں سے دارالحرب ہوتا ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب وہاں حسب ذیل تین چیزیں پائی جائیں تو دارالاسلام پر

دارالحرب کا اطلاق ہوگا ورنہ وہ دارالاسلام ہی رہے گا۔

۱- اہل شرک کے احکام اس طرح جاری ہوں کہ اسلام کے احکام میں سے کوئی حکم وہاں باقی نہ رہے۔

۲- اس کے متصل (پڑوسی ملک) دارالحرب ہو۔

۳- وہاں کوئی مسلمان یا ذمی امان اول کے ساتھ باقی نہ رہے۔

حضرات صاحبین کے نزدیک فقط کفر کے احکام کے ظہور وشیوع سے وہ دارالحرب بن جاتا ہے، اور علامہ استروشی نے اپنی فصول میں ابوالبشر سے نقل کیا ہے کہ دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہ ہوگا جب تک کہ وہ سب امور باطل نہ ہوجائیں جن کی جہت سے وہ دارالاسلام ہوا تھا اور علامہ اسبیجانی نے اپنی مبسوط میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور امام ناصر الدین نے منشور میں لکھا ہے کہ دارالاسلام چونکہ احکام اسلام کے جاری ہونے کے سبب سے دارالاسلام ہوا ہے۔ اس لئے جب تک اسلام کے متعلقات میں سے کوئی چیز باقی رہے گی جانب اسلام کو ترجیح دی جائے گی (کذافی حاشیۃ الطحطاوی)۔ رہا اتصال کا مسئلہ تو ہندوستان کو بعض جانب سے دارالحرب کے ساتھ اتصال ہے اور بعض جانب سے دارالاسلام کے ساتھ اتصال ہے۔ غرض مکمل اتصال اس کو دارالحرب کے ساتھ نہیں ہے۔ اور یہاں جس طرح کفر کے احکام جاری ہیں۔ اسلام کے احکام روزہ، نماز، زکوۃ، حج، قربانی، جمعہ وعیدین، مدارس ومساجد کی تعمیر، دینی جلسے وغیرہ امور بھی جاری ہیں اور ان امور کے جاری ہونے سے اسے دارالاسلام کا ہی حکم دیا جائے گا "کما فی الدر المختار و دار الحرب یصیر دار الإسلام باجراء أحکام أھل الاسلام فیھا کجمعة و عیدان بقی فیھا کافر اصلی و ان لم یتصل بدار الاسلام"۔

مجموعۃ الفتاوی (۲۴۶/۱) میں ہے:

"لیکن بلاد ہند جو قبضہ نصاریٰ میں ہے دارالحرب نہیں ہے، ان میں کافر سے سود لینا جائز نہیں ہے نی نی۔

اوراسی کتاب کے(جلد ۲ صفحہ ۱۷۰) میں ہے:

''ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے، چنانچہ ان عبارات فقہیہ سے واضح ہوتا ہے، الی قولہ پس یہ بلاد (ہند) دارالحرب نہ ہوں گے نہ بمذہب امام نہ بمذہب صاحبین نی نی۔

اوراسی کتاب کے ج ۲ ص ۲۴۵ میں ہے:

''والصحيح انه (أي ملك الانجليز) دار الاسلام ولم يصر دار الحرب إلى الآن''۔

حضرت مولانا عبدالباریؒ نے اپنی تائید میں نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی کی عبارت ''مجموعہ رسائل ہجرت وقربانی گاؤ''صفحہ ۳۳ میں اس طرح نقل فرمائی ہے:

''ہندوستان عموماً وریاست اسلامیہ خصوصاً نزد امام اعظم دارالحرب الی قولہ فی الحال مختار وفتوی مشاہیر فقہاء حنفیہ ہند مثل علماء دہلی ورام پور وبھوپال ہمیں است کہ مملکت ہند خصوصاً ریاسات اسلامیہ آن دارالاسلام است نہ دارالحرب۔ بعض معاصرین نوشتہ اند **الاحتياط ان نجعل هذه البلاد دار الاسلام وإن كانت السلاطين في الظاهر هؤلاء الشياطين**''۔

بعض علماء محققین کی یہ تحقیق ہے کہ ہندوستان من کل الوجوہ نہ دارالحرب ہے نہ دارالاسلام بلکہ بین بین ہے، جیسا کہ حبشہ تھا، کیونکہ اگر دارالحرب ہوتا تو وہاں جانے کا نام ہجرت نہ ہوتا۔ اور اگر دارالاسلام ہوتا تو وہاں سے آنے کا نام ہجرت نہ ہوتا، دونوں حیثیتوں سے دونوں ہجرتیں صحیح قرار دی گئی ہیں اور اس قسم کے لوگ اصحاب الہجرتین کہلاتے ہیں۔

مگر یہ قول زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حبشہ دارالحرب ہو اور امن کی وجہ سے وہاں ہجرت ہوئی ہو پھر وہاں سے مدینہ دارالاسلام کی طرف ہجرت ہوئی، اس لئے انہیں ذو الہجرتین کہا گیا۔

غرض ان حضرات اکابر کے قول کے مطابق موجودہ ہندوستان بھی دارالاسلام ہے

کیونکہ اسلامی احکام اب بھی بہت سے جاری ہیں۔

بینک سے سودی رقم لینے کا شرعی حکم:

پہلے۔ ۲ میں ''دارالحرب میں سودی معاملات'' کے عنوان کے تحت مفصل بحث آچکی ہے۔

جوعلماء ومشائخ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بینک سے سود لینے کی گنجائش ہوگی اور جو اکابر اسے دارالاسلام مانتے ہیں ان کے نزدیک بینک سے سود لینا ناجائز وحرام ہوگا، اور اختلاف کی صورت میں احتیاط کرنا یقیناً اولی اور بہتر ہے۔

سرکاری بینکوں میں اور ان بینکوں میں جن کے مالک غیر مسلم ہوں روپئے جمع کرنا جائز نہیں، وہ لوگ اس روپئے سے مالی استفادہ کرتے ہیں اور اس کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کی تخریب پر خرچ کرتے ہیں، نیز ان کے سارے کاروبار سودی لین دین پر چلتے ہیں، لہذا ان بینکوں میں روپئے جمع کرنا اعانت معصیت ہے لیکن آج کے دور میں جب کہ بڑی رقموں کا گھر پر رکھنا خطرہ سے خالی نہیں، انتہائی مجبوری کی حالت میں الضرورات تبیح المحظورات کے تحت بغرض حفاظت بینک میں جمع کرنے کی گنجائش دی گئی ہے، لیکن جمع کرنے کے بعد اس کا سود نہ لینا اور بینکوں میں چھوڑ دینا بھی جائز نہیں۔ بعض اکابر کا خیال ہے کہ بینک سے ملی ہوئی سودی رقوم کو مسلمانوں کے یا عام پبلک کے اجتماعی مقاصد اور رفاہی امور میں صرف کر دینا چاہئے، جیسے سڑک، پل، مسافر خانہ وغیرہ کی تعمیر میں صرف کر دیا جائے، اور یہ حضرات عالمگیری (۲/۲۱۰) کے اس جزئیہ سے استدلال فرماتے ہیں:

''وما أوجف المسلمون عليه من أموال أهل الحرب بغير قتال يصرف فی مصالح المسلمين ونحو ذلک'' (ردالمحتار ۳/۵۳۳و شرح السیر الکبیر ۱۴/۱۷۸، ۲۲۴)۔

جب کہ دوسرے علماء واکابر رفاہ عام میں یا مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ

کرنے کو نا جائز قرار دیتے ہیں، وہ حضرات فقہاء کے اس اصول کو سامنے رکھتے ہیں کہ بینک سے ملی ہوئی رقم سود، حرام اور مال خبیث ہے، اور مالِ خبیث میں پہلا درجہ یہ ہے کہ جہاں سے مال خبیث حاصل ہوا ہے اگر مالک یا اس کا وارث موجود ہے تو اس کی طرف واپس کر دیا جائے ورنہ پھر واجب التصدق ہے، یعنی بلا نیت ثواب اس کے وبال سے بچنے کے لئے انتہائی غریب مفلوک الحال یا مقروض پریشان حال کو بلا کسی عوض دے دیا جائے، لہذا اس کا اولین مصرف یہ ہے کہ اگر ہمارے اوپر سرکار کی طرف سے کوئی غیر شرعی ٹیکس مثلاً سیل ٹیکس، انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، چنگی ٹیکس، کسٹم ٹیکس، موت ٹیکس، پیدائش ٹیکس وغیرہ لاگو ہو یا گورنمنٹ کے سود کی ادائیگی ذمہ میں ہو تو اس میں دے دیا جائے تاکہ حکومت کے ٹریزری (خزانہ) میں پہنچ جائے اور مالِ حرام جہاں سے آیا تھا وہیں چلا جائے، اور اگر کوئی ایسی صورت نہیں تو پھر فقراء و مساکین پر بلا نیتِ ثواب تصدق کر دی جائے۔

"کما فی الفتاوی البزازیة فیرد علی أربابها إن علموا وإلا تصدق به علی الفقراء" (فتاوی بزازیہ علی ہامش الھندیہ/ ۳۵۵)۔

بینک کو سود دینا:

پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ دار الحرب میں کافر حربی کو سود دینا بالاتفاق سب ہی ائمہ کرام کے نزدیک ناجائز وحرام ہے، جیسا کہ منحۃ الخالق (۱۲۶/۶) کی عبارت میں بطور حوالہ آچکی ہے، یہی حکم بینک کو بھی سود دینے کا ہوگا۔ البتہ اگر بینک کے واسطہ کے بغیر تجارت دشوار ہو جائے اور سرکاری قانونی مجبوریوں میں پھنس جائے اور بغیر سودی قرض لئے کوئی کاروبار کرنا یا کاشت کرنا مشکل ہو جائے جیسا کہ ہندوستان کا حال ہے تو شرعی ضرورت ومجبوری کے تحت مثل رشوت دینے کے اس کی بھی گنجائش ہوگی۔

ترقیاتی اسکیموں کے لئے سودی قرض لینا:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمان کی ترقی اور کامیابی قرآن اور حدیث کے احکام کی پابندی اور حرام اور لعنت کے کاموں سے اجتناب میں ہے، حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر مال جمع کرنے اور تجارت کو فروغ دینے میں ہرگز مسلمان کی کامیابی اور ترقی نہیں ہے، اگر سودی کاروبار سے غیرقومیں اقتصادی میدان میں ترقی کررہی ہے اوران کی دیکھ دیکھی مسلمان بھی ان ہی روش پر چلنے لگیں تو علماء ربانیین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کو اس کے مہلک نتائج سے آگاہ کریں، بلا کسی تذبذب کے صاف طور پر بتائیں کہ سودی کاروبار کے ذریعہ مسلمان کبھی ترقی نہیں کرسکتا ہے، حدیث پاک میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے:

"إن الربوا وإن كثر فإن عاقبته تصير إلى قل"۔ سود بظاہر زیادہ مقدار میں نظر آتا ہے لیکن اس کا انجام کمی اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح سودی کاروبار سے مال بھی محفوظ نہیں رہ سکتا ہے، کیونکہ ارشاد ربانی ہے: يمحق الله الربوا ويربي الصدقات۔ اللہ تعالی سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ آج کے بگڑے ہوئے معاشرے میں اگر دوسری قوموں کی ترقیات سے متاثر ہو کر مسلمان کے لئے مطلقاً حرام کی راہیں کھول دی گئیں تو ہمارا انجام نہایت خطرناک ہوگا۔ علمائے بنی اسرائیل کی طرح ہم لعنت کے مستحق ہوں گے اور ملّتِ اسلامیہ کو سخت ترین دھکا لگے گا اور بڑے خسارہ کا سامنا کرنا ہوگا، اس سیل رواں میں اگر ہم سب ہی بہہ پڑیں تو قہر خداوندی کے مستحق اور اس کی نصرت وحمایت اور نماز و دعا کی قبولیت سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے نصوص قرآنی اور احادیث نبویہ کی روشنی میں سودی کاروبار کو مسلمان کے مال کی حفاظت یا اس کی ترقی کا ذریعہ تجویز کرنا اور محض سرمایہ دار بننے اور اقتصادی میدان میں ترقی کرنے کے لئے سودی لین دین کی اجازت دینا قطعاً جائز نہیں بلکہ یہ تو قرآن و حدیث کا مقابلہ کرنے کے مترادف ہوگا۔

ہاں فقہائے کرام نے ان مسلمانوں کے لئے جو واقعی غریب اور محتاج ہیں جن کا کام قرض لئے بغیر نہیں چل سکتا اور بغیر سود کے کہیں سے اسے قرض نہ لینے کی صورت میں اس کی

جان وعزّت یا اس کے بال بچّوں کی جان کی ضیاع اور بے عزتی کا قوی اندیشہ ہےتو شدید ضرورت شرعی اور انتہائی کسمپرسی اور مجبوری کی حالت میں جزوی طور پر ایسے شخص کے لئے سود پر قرض لینے کی گنجائش دی ہے،لیکن مارکیٹ میں غیر مسلموں کے دوش بدوش چلنے یا سرمایہ دار بننے کی غرض سے، نیز اسراف، ناز ونعمت حاصل ہونے،خوشحالی،ترفہ اور جاہ طلبی کی نیت سے،اور دولت وثروت کی ریس کھیلنے کے ارادہ سے ہرگز جائز نہیں، چنانچہ الاشباہ والنظائر میں فن اوّل کے پانچویں قاعدہ میں ہے: ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''اسی طرح کا مضمون قنیہ،بغیہ اور حموی میں بھی ہے۔

علاوہ ازیں ایک دوسری صورت فقہاء نے یہ بھی لکھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان مستامن دارالحرب میں آئے اور یہاں آکر کسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے اور وہ اپنی ضرورت کے لئے دارالحرب میں سودی لین دین کا معاملہ کرے تو اس کے لئے شرعی اسباب کے پیش نظر بعض قول پر گنجائش نکل سکتی ہے،لیکن اس سے تجاوز کرکے ہر ایک کے لئے عام ضابطہ بنالینا، اور تمام مسلمانوں کے لئے جواز کی راہ نکال لینا قطعاً درست نہیں، یہ جادۂ حق کو چھوڑ کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے کے مرادف ہوگا،ارشاد ربانی ہے:

''هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ''(سورۃ انعام ۱۵۴:)۔

اور ایک دوسری جگہ ہے:

''وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ''(سورۃ بقرہ ۱۶۸:)۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت بینک کے واسطہ سے جو قرض دیتی ہے تو اپنے دیئے ہوئے سرمایہ پر کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے۔مثلاً کسی کو پچاس ہزار قرض دے اور اس میں پانچ ہزار کی چھوٹ دے دی یعنی معاف کردیا صرف پینتالیس ہزار اصل رقم قرار دے کر قسط وار معہ سود وصول کرتی ہے پس اگر کل ادائیگی معہ سود مجموعہ پچاس ہزار کے اندر یا مساوی ہے تو سود کا

☆مہتمم مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور

نہ ہونا بالکل ظاہر اور یقینی ہے، سود اور ربوا کی تعریف یہاں صادق نہیں آتی، اور سود دینے کا وجود بھی یہاں نہیں ہے۔

مال کی برآمد میں سود لینا:

حتی الامکان مسلمان کو ایسی تجارت نہ کرنی چاہئے جس میں سود دینا یا لینا پڑے، کیونکہ سودی کاروبار بڑا خطرناک ہے، عام طور پر لوگ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور افلاس کا بہانہ لیتے ہیں؛ حالانکہ جب ربوا کی حرمت کی آیت نازل ہوئی ہے اس وقت مسلمانوں میں افلاس آج سے کہیں زیادہ تھا، لیکن اس کے باوجود قرآن کا اٹل حکم نازل ہو گیا کہ سب چھوڑ دو ورنہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اشتہار جنگ ہے، جب متعاقدین کی کفر کی حالت کا سود وصول کرنا جائز نہیں رکھا گیا تو پھر اسلام کی حالت میں سودی معاملہ کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے، البتہ شرعی ضرورتیں اور قانونی مجبوریاں اس سے مستثنی ہوں گی۔

سرکاری بینک اور شخصی بینک:

جہاں تک سود کی رقم لینے کا تعلق ہے تو سرکاری بینک ہو یا شخصی مگر غیر مسلم مالک ہو، یا مسلم اور غیر مسلم کا مشترک ہو، ان تینوں قسم کے بینکوں میں سود کی رقم کو چھوڑ دینا اور وصول نہ کرنا ہرگز جائز نہیں ورنہ یہ لوگ وہ رقم مسلم دشمنی، مسلم تخریب کاری کے امور میں خرچ کر دیتے ہیں اور اگر شخصی بینک مگر مسلم مالک ہو یا مسلم مملکت ہو تو وہاں سود وصول نہ کرنا اور بینک میں چھوڑ دینا ضروری ہے۔

سرمایہ کار کمپنی سے سرمایہ حاصل کرنا:

مروجہ طریقہ کار میں بہر حال سود دینا ہوتا ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، کیونکہ اصل رقم کی قسط وار ادائیگی سود کے ساتھ شرعاً ناجائز وحرام ہے، البتہ اس کے جواز کی یہ صورت نکل سکتی ہے کہ ٹرک یا ٹریکٹر وغیرہ جو کچھ بھی لینا ہے کمپنی معہ سود پورے پیسے حساب لگا کر خریدار کو ایک ہی مرتبہ بتا دے، یعنی پوری مجموعی رقم کو ثمن قرار دے اور اس کی ادائیگی کی قسط مقرر کر دے تو بیع کا یہ طریقۂ کار شرعاً درست ہوگا۔

دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت

مولانا اعجاز احمد اعظمی ☆

ربوا کی تعریف فقہاء نے ان الفاظ سے کی ہے:

الربوا فی الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض فی معاوضة مال بمال (ہدایہ ۶۱/۳)۔

ربوا شریعت کے نزدیک وہ فاضل مال ہے، جس کا معاوضۃ المال بالمال میں کوئی عوض نہ ہو۔

اس تعریف کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے کہ (۱) کسی نے اضافہ کی شرط کے ساتھ قرض کا معاملہ کیا ہو، اور اس پر بھی ہے کہ (۲) کسی مثلی چیز کا تبادلہ اسی کی ہم جنس سے اضافہ کی شرط کے ساتھ کیا ہو، پہلی صورت کو فقہاء ''ربوا النسیئہ'' اور دوسری کو ''ربوا الفضل'' کہتے ہیں۔

ربوا کی یہ تعریف امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف چند ضمنی قیود کے ساتھ علی الاطلاق تسلیم کرتے ہیں کہ معاوضہ مالیہ جہاں کہیں ہو، جب اسکا کوئی ایک فریق مسلمان ہو، اس میں اضافہ کی شرط سے ربوا کا تحقق ہو جائے گا، لیکن امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس میں ایک اور شرط کا اعتبار کیا گیا ہے، وہ یہ کہ دونوں فریق کا مال ''مال معصوم'' ہونا چاہئے۔ اگر کسی ایک کا مال معصوم نہیں ہے تو اس میں ربوا کا وجود نہ ہوگا۔ گو صورۃً ربوا محسوس ہو، امام علاء الدین ابوبکر بن سعود کاسانی اپنی مشہور تالیف بدائع الصنائع میں

تحریر فرماتے ہیں:

”وأما شرائط جر يان الربا فمنها أن يكون البدلان معصومين فان كان أحدهما غير معصوم لا يتحقق الربا عند نا وعند أبى يوسف هذا ليس بشرط“(۵/۱۹۲)۔

ربوا کے تحقق کے لئے چند شرطیں ہیں، ایک شرط یہ ہے کہ بدلین معصوم ہوں اگر کوئی ایک بدل معصوم نہ ہوتو ربوا کا تحقق نہ ہوگا، ہمارے نزدیک اور امام ابو یوسف کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ربوا کی شرعی حقیقت علی الاطلاق ہر اس معاوضہ مالیہ میں جس کے اندر اضافہ خالی عن العوض کی شرط لگائی گئی ہو، نہیں پائی جاتی، اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔ ان شرائط کے بغیر گو کہ صورۃً ربوا معلوم ہو، مگر شریعت کی نظر میں اسے ربوا نہیں سمجھا جائے گا، بدائع نے اس کے لئے چند شرطیں ذکر کی ہیں، پہلی شرط وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ بدلین کا معصوم ہونا ضروری ہے، معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال شرعاً کسی کی ملک ہو اور اس پر دوسرے کو دست اندازی کی اجازت نہ ہو۔

حربی کا مال:

فقہاء لکھتے ہیں کہ حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا، صاحب بدائع لکھتے ہیں، اور تمام ہی فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ:

”ان مال الحربی لیس بمعصوم بل هو مباح فی نفسه“۔

حربی کا مال معصوم نہیں ہے، بلکہ وہ فی نفسہ مباح ہے۔

حربی کے مال کے معصوم نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے مال غنیمت کو اہل اسلام کے حق میں حلال قرار دیا ہے، اور مال غنیمت اہل حرب کا وہ مال ہے جو ان سے جنگ میں حاصل کیا گیا ہو، اگر وہ مباح نہ ہوتا تو اس پر ملکیت بھی ثابت نہ ہوتی۔

اموال میں اباحت:

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اموال میں اصل اباحت ہے، گو کہ بعض لوگوں نے توقف کو ترجیح دی ہے، یعنی انھیں حرام یا حلال کچھ نہ کہا جائے جب تک کوئی دلیل شرعی حلت وحرمت کی نہ مل جائے۔ لیکن علامہ شامی نے امام ابن ہمام کی کتاب التحریر سے نقل کیا ہے کہ:

"المختار الاباحة عند جمهور الحنفية والشافعية وفی شرح اصول البزدوی"۔

عام حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مختار اباحت ہے اور علامہ اکمل کی شرح اصول بزدوی میں ہے کہ ہمارے اور شافعیہ کے اکثر اصحاب نے فرمایا ہے کہ جن چیزوں کی علت و حرمت شریعت میں وارد ہوسکتی ہے، وہ ورود شریعت سے پہلے اباحت پر ہیں۔

"للعلامة اکمل قال أكثر اصحابنا وأكثر أصحاب الشافعي أن الاشياء التي يجوز أن يرد الشرع بإباحتها وحرمتها قبل وروده على الاباحة" (۱۶۱/۴)۔

غرض اموال میں اباحت اصل ہے، جبتک شریعت انہیں کسی خاص فرد یا جماعت کے ساتھ مختص کر کے دوسروں کے لئے نا قابل دست اندازی نہ قرار دیدے، البتہ جب اس پر کسی کا شرعاً قبضہ اور ملکیت ثابت ہوجائے تب وہ مال معصوم اور محظور بن گیا۔

عصمت کی بنیاد:

اب اس پر غور کرنا ہے کہ مال میں عصمت اور احراز کب اور کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی تصریحات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احراز کا تعلق کسی کے قبضے میں آجانے سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق دارالاسلام میں آجانے سے ہے، شرح سیر کبیر میں امام سرخسی تحریر فرماتے ہیں:

"وفقهه في هذا كله أن العصمة المقومة انما تثبت بالاحراز باليد لا بالدين،

وتمام الإحراز باليد إنما يكون بمنعة المسلمين أو بدارهم و بدون هذه العصمة لا يخرج المال من أن يكون محلا للاغتنام"(۱۱۳۴/۴)۔

ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ "عصمت مقومہ" احراز بالید سے ثابت ہوتی ہے احراز بالدین سے نہیں، اور احراز بالید کی تکمیل یا تو عسکر اسلام سے ہوگی یا دارالاسلام سے، اور اس عصمت کے بغیر مال، محل غنیمت ہونے سے محفوظ نہ ہوگا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"**وإنما تثبت العصمة فی حق الأحكام بالإحراز والإحراز بالدار لا بالدين**"(مبسوط ۵۸/۱۴)۔

عصمت احکام کے حق میں عصمت احراز سے ثابت ہوتی ہے، اور احراز کا تعلق دار سے ہے، دین سے نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال دارالحرب میں مال غنیمت نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی اصلی اباحت پر ہے، جو اہل اسلام کے لئے مال غنیمت بن سکتا ہے، اور معلوم ہے کہ مال غنیمت بنص قرآنی حلال وطیب ہے۔

"**فكلوا مما غنمتم حلالا طيباً**"۔

پس جو کچھ ملا اسے کھاؤ کہ وہ حلال وطیب ہے۔

واضح رہے کہ یہ مسئلہ یعنی یہ کہ مال حربی دارالحرب میں معصوم نہیں ہوتا، مختلف فیہ نہیں ہے متفق علیہ ہے، ورنہ اگر وہ مال معصوم ہوتو مال غنیمت بننے کا محل نہیں ہوسکتا ہے، اسی لئے فقہاء نے صراحت فرمائی ہے کہ مسلم مستامن یا معاہد کے لئے حربی کا مال دھوکہ، خیانت اور چوری سے لینا تو جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ امان اور عہد کی خلاف ورزی ہے، اور یہ درست نہیں، ورنہ اس کا مال فی نفسہ مباح ہے کسی اور ذریعے سے جس میں اس کی رضا پائی جائے، اس کا لینا درست ہے، اسی طرح مسلم غیر مستامن اور غیر معاہد کے لئے حربی کا مال کسی بھی طرح حاصل کرنا درست ہے، خواہ اس کی رضا ہو یا نہ ہو، چنانچہ شرح سیر کبیر میں ہے کہ:

اگر کوئی مسلمان اہل حرب کا قیدی تھا اور کسی طرح سے وہاں سے بچ کر کچھ مال لیکر بھاگ نکلا اور دارالاسلام میں آ گیا، تو جو کچھ وہ اپنے ساتھ لایا ہے وہ سب اسی کا ہے، کیونکہ وہ ان میں مستامن نہ تھا، بلکہ وہ مجبور مقہور تھا، اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ انہیں قتل بھی کرسکتا تھا اور مال بھی لے سکتا تھا۔ پس جب کچھ مال لیکر آ گیا تو اس کے لئے وہ جائز ہے (شرح سیر کبیر ۴/۱۱۲۲)۔

حربی کے مال کا حصول:

اگر اہل حرب سے کوئی مصالحت اور معاہدہ ہو، یا کوئی فرد خاص دارالحرب میں امان لے کر گیا ہوتو اس صورت میں ان سے غدر یا خیانت یا چوری تو حرام ہے مگر ان کی رضامندی سے کوئی مال لے لینا جائز ہے، خواہ اس کی تحصیل کا طریقہ کچھ بھی ہو، کیونکہ اس جگہ تملیک مال میں طریقہ تحصیل مؤثر نہیں ہے، بلکہ مال مباح پر قبضہ مؤثر ہے، اگر اس موقع پر طریق تحصیل عقود فاسدہ ہوں، تو وہ کالعدم ہیں شرح کبیر میں ہے:

"قد بينا ان للمستامن فی دار الحرب أن ياخذ مالهم بأی وجه يقدر عليه بعد أن يتحرز عن الغدر وليس له ان يدلس لهم العيب فيما يبيعه منهم مما يجوز مثله فی دار الاسلام ولا يجوز لان فيه معنى الغدر" (۴/۱۴۸۶)۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ دارالحرب میں مستامن کے لئے درست ہے کہ ان کے مال کو جس طرح پر ممکن ہو لے سکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ غدر نہ ہو، تاہم اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے مال کے عیب کو ان سے چھپا کر بیچے کیونکہ اس میں غدر کا معنی پایا جاتا ہے۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

اگر دارالحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کر رکھی ہو، اور وہاں کوئی مسلمان داخل ہوا اور انکے ہاتھ ایک درہم کو دو درہم کے عوض فروخت کیا تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، کیونکہ مصالحت کی وجہ سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن گیا۔ اور مسلمانوں پر ان کا مال ان

کی رضامندی کے بغیر لینا حرام ہے، کیونکہ اس میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، لیکن ان کی رضا مندی اس معاملہ سے حاصل کرلی ہو تو خلاف ورزی کا معنی باقی نہیں رہا، پس جو کچھ وہ حاصل کرے گا حلال ہے (۴؍ ۱۴۹۳)۔

مبسوط (۱۴؍ ۵۷) میں ہے:

مال حربی مباح ہے، لیکن مسلمان نے ان کی امان حاصل کرکے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ ان کے ساتھ خیانت نہ کرے گا، اور نہ ان کی رضا کے بغیر کوئی چیز لے گا، پس وہ ان اسباب (عقود فاسدہ) کے ذریعے غدر سے احتراز کررہا ہے، پھر اسے مال کی ملکیت جو حاصل ہورہی ہے وہ قبضہ سے ہے، ان اسباب سے نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ مسلمان کے فعل کو اچھے محمل پر رکھنا چاہئے اور بہتر محمل وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے ارشاد کی روشنی میں حربی سے جو مال بصورت عقد ربوا حاصل کیا گیا ہے، گو وہ بظاہر ربوا ہے مگر درحقیقت وہ مال مباح پر اس کے مال کی رضامندی سے قبضہ ہے، ایسی صورت میں وہ لینے والے کے لئے بالکل جائز ہے، اس قبضہ اور ملکیت میں عقد ربوا موثر نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ وہ بظاہر ربوا ہے، حقیقت ربوا سے اس کا کوئی علاقہ نہیں، علامہ کاسانی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

طرفین کی دلیل یہ ہے کہ حربی کا مال معصوم نہیں ہے بلکہ وہ فی نفسہ مباح ہے، مگر مسلم مستامن اس کی رضامندی کے بغیر اس کا مالک نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس میں دھوکہ اور خیانت ہے، جب اس نے اس کی رضامندی اور پسندیدگی حاصل کرلی تو یہ بات زائل ہوگئی، اب اس کا لینا مال مباح پر تسلط حاصل کرنا ہے جو مشروع ہے اور مفید ملک ہے، جیسے لکڑی اور گھاس کا حاصل کرنا، اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ معاملہ تملک نہیں ہے، بلکہ شرط تملک کی تحصیل ہے اور وہ رضامندی ہے، کیونکہ حربی کی ملکیت اس کے بغیر زائل نہ ہوگی اور جب تک اس کی ملکیت اس کے بغیر زائل نہ ہو مسلمان کا لینا ملکیت نہ پیدا کرے گا، پھر جب حربی کی ملکیت زائل ہوگئی، تو مسلم کے لئے قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہوگئی، اور یہ ملکیت قبضہ سے ہے، نہ کہ عقد

سے، پس ربوا کا تحقق نہیں ہوا کیونکہ ربوا اس فضل (اضافہ) کو کہتے ہیں جو عقد کے نتیجے میں حاصل ہوا ہو۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دارالحرب میں ربوا کی حلت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ربوا خواہ کہیں ہو، حرام ہے، اورنص قطعی کی رو سے حرام ہے، اس میں نہ کسی کا اختلاف ہے اور نہ ہوسکتا ہے، کیونکہ نصوص صریحہ سے اس کی حرمت ثابت ہے، اختلاف جو کچھ ہے اس میں ہے کہ ربوا کا مصداق کیا ہے؟ جو کچھ ربوا کے دائرہ میں آئے گا وہ حرام ہے، خواہ وہ دارالاسلام میں ہو، یا دارالحرب میں، اور جو ربوا کے دائرہ سے خارج ہے اسے حرام کہنے کی کوئی وجہ نہیں الا یہ کہ کوئی اور وجہ حرمت پائی جائے۔

ائمہ کے درمیان ایسا اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ میں نہیں ہے، ربوا کی دوسری قسم جس کو فقہاء ربواالفضل سے تعبیر کرتے ہیں، جس کا تذکرہ اس حدیث میں ہے کہ:

"عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء، يدا بيد فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد

(رواہ الستۃ الا البخاری، فتح القدیر ۶/ ۱۴۷)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گیہوں گیہوں کے عوض، جو، جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض، نمک نمک کے عوض برابر اور نقد نقد بیچو، ہاں جب اصناف بدل جائیں تو جس طرح چاہو بیچو، مگر نقد ہو۔

"ربواالفضل" کے سلسلے میں ان چھ چیزوں کی تصریح احادیث میں وارد ہے، ان کے علاوہ اور چیزوں میں بھی ربوا ہوسکتا ہے یا نہیں، تو مجتہدین اس پر متفق ہیں کہ اور چیزوں میں بھی ربوا کا تحقق ہوسکتا ہے، لیکن اس کے لئے معیار اور بنیاد کیا ہے، اس میں ائمہ کا اختلاف ہے، حنفیہ نے قدر وجنس کو معیار مانا، شافعیہ نے طعم وثمینت کو جنس کے اتحاد کے ساتھ علت قرار

دیا، مالکیہ نے اقتیات وادخار کو علت مانا، چونکہ ان حضرات کے درمیان استخراج علت میں اختلاف ہوا، اس لئے ربوا کے مصداق میں بھی اختلاف ہوا۔ چنانچہ اگر لوہا، لوہے کے عوض بیچا جائے تو امام صاحب اس میں کمی بیشی کو جائز نہیں قرار دیں گے کہ ربوا ہوجائے گا، اور امام شافعیؒ کم وبیش کو جائز کہیں گے کیونکہ اس میں نہ طعم ہے اور نہ ثمنیت، اسی طرح اور بھی بہت سی چیزوں میں اختلاف پیدا ہوگا، بلکہ ظاہر یہ کے نزدیک تو ان چھ چیزوں کے علاوہ کسی چیز میں ربوا کا تحقق ہے ہی نہیں، اس لئے ان کے ماسوا ان کے نزدیک ہر چیز میں کم وبیش کے ساتھ مبادلہ جائز ہے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ لوہے میں امام شافعیؒ کے نزدیک ربوا حلال ہے، یا ان چھ چیزوں کے علاوہ میں ظاہر یہ کے نزدیک سود جائز ہے؟ ہرگز نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان چیزوں میں ان کے نزدیک ربوا کا تحقق ہوتا ہی نہیں، حالانکہ بظاہر ربوا معلوم ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح امام صاحب کے نزدیک دارالحرب میں حربی اور مسلم کے درمیان سود کا تحقق ہوتا ہی نہیں، یہ نہیں کہ دارالحرب میں سود جائز ہے، یہ بات قطعاً نہیں ہے، اسی بات کی تعبیر حضرت مکحول کی حدیث مرسل میں کی گئی ہے:

"عن مکحول ان رسول اللہ ﷺ قال :لا ربا بین اھل الحرب واظنہ قال : وبین اھل الاسلام اخرجہ البیھقی عن طریق ابی یوسف عن بعض المشیخۃ عن مکحول" (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۳۳)۔

حضرت مکحول (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اہل حرب کے درمیان اور میرا گمان ہے کہ فرمایا: اور اہل اسلام کے درمیان ربوا نہیں ہے۔

حضرت مکحول کی یہ روایت سابقہ استدلال کی تائید اور مسئلہ کی نوعیت کو واضح کرتی ہے، براہ راست اس سے استدلال خدشہ سے خالی نہیں ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب بدائع الصنائع نے اس روایت کو استدلال میں نہیں پیش کیا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا معاملہ:

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں صراحت موجود ہے کہ وہ مسلمان ہونے اور سود کی تحریم کے باوجود اہل مکہ سے سودی نوعیت کا کاروبار کرتے تھے، نیز طائف کے بعض قبائل سے بھی ان کا اس نوعیت کا معاملہ تھا، اور معلوم ہے کہ یہ دونوں جگہیں دار الحرب تھیں، فتح مکہ کے بعد جب مکہ شریف دار الاسلام بن گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تمام سود منسوخ کر دئے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اہل حرب سے دار الحرب میں ربا کی نوعیت کا معاملہ کرنا درست ہے (تفصیل شرح سیر کبیر ۴/۸۸ ۱۴۱۴ اور اعلاء السنن ۱۴/ ۳۴۳ ج ۱۴ میں مذکور ہے)۔

حاصل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ دار الحرب میں سود جائز ہے، سود تو کسی حال میں جائز نہیں ہے، اصل صورت حال یہ ہے کہ دار الحرب میں جو مال حربی سے لیا جاتا ہے، اس پر شرعاً سود کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ کا تعلق اجتہاد سے ہے، نصوص قطعیہ میں اس کی صراحت نہیں۔ حدیث مکحول اور حربی کے مال کی شرعی حیثیت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ مال مباح ہے، جو محل ربوا نہیں ہے، پس اس میں ربوا کی گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں ایک قید کا جائزہ:

بعض اکابر علماء نے لکھا ہے کہ دار الحرب میں حربی سے، اس بظاہر سودی معاملہ کا جواز، صرف اس مسلمان کے لئے ہے جو دار الاسلام کا باشندہ ہو اور امان لے کر دار الحرب میں آیا ہو۔ خود دار الحرب کے باشندہ کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے، لیکن اس قسم کی کوئی تصریح کتب فقہ میں نظر سے نہیں گذری، نہ ان حضرات نے اس کا کوئی حوالہ دیا، صرف اتنی بات ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اور کتب فقہ میں صراحۃً مسلم مستامن کا ذکر ہے، جو

دارالاسلام سے آیا ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا کوئی مسلمان جو دارالاسلام سے نہ آیا ہو، بلکہ خود دارالحرب کا باشندہ ہو، اس حکم سے خارج ہوگا۔ لیکن گذارش ہے کہ کہیں بھی مفہوم مخالف کا اعتبار اس وقت ہوگا، جب کہ اس کے خلاف کی صراحت نہ ہو، اور اگر کسی جگہ اس مفہوم مخالف کا خلاف صراحۃً موجود ہو تو پھر مفہوم مخالف کا اعتبار کسی کے نزدیک کہیں نہ ہوگا، ہم جب اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو حضرت عباسؓ کا معاملہ سامنے آتا ہے کہ وہ مکہ کے ہی باشندے تھے، اور وہیں رہ کر ربوی نوعیت کا معاملہ کرتے تھے، نیز حدیث مکحول کا اطلاق بھی یہی چاہتا ہے کہ اس میں مسلم دارالحرب اور مسلم مستامن کے درمیان فرق نہ ہو، البتہ یہ بات بالاتفاق ہے کہ مسلم کا مسلم سے سود لینا اور دینا دارالحرب میں جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے مابین وہ سود ہی ہوگا۔

کافر حربی کو سود دینا:

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کافر حربی سے دارالحرب میں سود کے نام پر لی ہوئی رقم تو حلال ہے، کیونکہ اس پر شرعاً سود کا اطلاق نہیں ہوتا تو کیا انہیں سود دینا بھی جائز ہوگا؟ اور اسی سلسلے میں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ سود دینے اور سود لینے میں یکساں حرمت اور معصیت ہے یا کچھ فرق بھی ہے؟ اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ قاعدہ یاد کرلینا چاہئے کہ جس چیز کی حرمت براہ راست قرآن کریم سے ثابت ہو، اور جس چیز کی حرمت خبر واحد سے ثابت ہو، فقہاء دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں، کیونکہ قرآن قطعی الثبوت ہے، اور حدیث ظنی الثبوت، قرآن کا منکر کافر ہوگا، اور حدیث کا منکر کافر نہیں ہے۔

اسی طرح دونوں کے آثار میں بھی فرق ہوگا، ایک کی معصیت بڑھی ہوگی، اور دوسرے کی معصیت اس کے مقابلے میں ہلکی ہوگی، ایک میں اباحت کی کوئی گنجائش نہ ہوگی بجز حالت اضطرار کے، اور دوسرے میں حالت اضطرار سے کم پر بھی گنجائش مل سکتی ہے، بہر حال دونوں حرمتوں میں فرق ہوگا۔ اب غور کرنا چاہئے کہ سود کی تحریم جن آیتوں میں بیان کی گئی ہے، ان کا

تعلق سود لینے سے ہے یا دینے سے، ارشاد باری تعالی ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَأْکُلُوْنَ الرِّبَا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ" (سورۂ بقرہ۲۷۵:)۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت کے دن) جب کھڑے ہوں گے تو اس طرح جیسے کوئی ایسا شخص جس کو شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا" (سورۂ بقرہ۲۷۸:)۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو ربوا باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبَا وَ یُرْبِی الصَّدَقَاتِ" (سورۂ بقرہ۲۷۶:)۔

اللہ تعالی ربا کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھوتری بخشتا ہے۔

اور فرمایا:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَۃً" (سورۂ آل عمران ۱۳۰:)۔

اے ایمان والو! دگنا تگنا کر کے ربوا نہ کھاؤ۔

اور ارشاد ہے:

"وَ أَخْذِھِمُ الرِّبَا وَ قَدْ نُھُوْا عَنْہُ" (سورۂ نساء۱۶۱:)۔

اور ان کے ربوا لینے کی وجہ سے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

ان سب آیات میں سود لینے اور کھانے کا تذکرہ ہے، دینے کے باب میں آیات خاموش ہیں، البتہ ایک جگہ مطلق ربوا کو حرام کہا گیا ہے، ارشاد ہے:

"وَ أَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا" (سورۂ بقرہ۲۷۵:)۔

اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام کیا ہے۔

لیکن اس میں غور بھی کرنے سے اصالۃً سود لینے ہی کی حرمت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ معنی مصدری میں ہے، یعنی زیادہ کرنا، اور ظاہر ہے کہ زیادہ کرنے کی شرط آخذ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، غرض سود دینے کے سلسلے میں قرآن ساکت ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ لینا اس وقت تک نہ پایا جائے گا جب تک دینے کا وجود نہ ہوگا، تاہم دینے میں مجبوری بھی ہوسکتی ہے، غالباً اسی لئے قرآن میں اس سے تعرض نہیں ہوا، البتہ حدیث نے اس کی شرح کردی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''لعن اللہ آکل الربوا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ و قال ھم سواء''۔

اللہ نے سود کھانے اور کھلانے والے، کاتب اور شاہد سب پر لعنت کی ہے (مسلم شریف)۔

دلائل شرعیہ سے سود لینے اور دینے کی حرمت ثابت ہے، مگر دونوں میں فرق ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ ایک حرمت قرآن سے ثابت ہے، اور ایک کی حدیث سے ''**ھم سواء**'' کی شرح میں ملا علی قاری صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں:

''**ھم سواء فی اصل الاثم و ان کانوا مختلفین فی قدرہ**'' (مرقاۃ ۳؍۳۰۷)۔

یہ سب برابر ہیں یعنی اصل معصیت میں اگرچہ اس کی مقدار میں فرق ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے فتاویٰ میں تحریر ہے کہ:

تحقیق یہ ہے کہ سود دینا بالتبع حرام ہے کیونکہ وہ کسی کا مال تو لیتا نہیں بلکہ خود اپنا مال دیتا ہے، اور اپنا مال دوسرے کو دینا، خواہ اس میں اپنا نقصان ہی ہو بالخصوص دفع حاجت اور دفع ظلم کے لئے بالکل مباح ہے، پس سود دینے میں حرمت کی وجہ یہی دو چیزیں ہیں، ایک یہ کہ غیر کو حرام کھلانا لازم آتا ہے جیسے قاضی یا حاکم کو رشوت دینا، دوسرے یہ کہ دارالاسلام میں سودی معاملہ کی ترویج کا سبب بنتا ہے، اسی بنا پر حالت اضطرار میں دارالاسلام میں بھی سود دینے کو

جائز قرار دیتے ہیں، غرض سود لینے اور سود دینے میں فرق ہے، گو کہ اصل گناہ میں دونوں شریک ہیں (فتاوی عزیزیہ ا/۴۰)۔

اب اس مسئلہ پر غور کیجئے کہ دارالحرب میں حربی سے ربوا کے نام پر مال لینا اگر جائز ہے تو دینے کا حکم کیا ہے؟ حدیث مکحول پر نظر کرنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سود دینے کی بھی گنجائش ہے، لیکن اگر اس کی ابتدائی بنیاد یعنی مال حربی کی اباحت پر غور کیا جائے تو صرف سودی نوعیت کا اضافہ لینے کی گنجائش نکلتی ہے، دینے کی نہیں، کیونکہ حربی کا مال مباح ہے، مسلمان کا نہیں۔ چنانچہ صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں کہ:

یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس دلیل کا تقاضہ ہے کہ جب اضافہ مسلمان کو حاصل ہو رہا ہو، اس وقت یہ عقدر ربوا جائز ہو، جبکہ (لا ربوا بین الحربی المسلم میں) ربوا کا لفظ عام ہے، وہ اس صورت کو بھی شامل ہے جبکہ دو درہم مسلمان کی جانب سے ہوں، اور اس کو بھی جبکہ وہ دونوں کافر کی جانب سے ہوں، اسی طرح قمار میں بھی شرط کا مال کافر کو بھی حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ اس کی جیت ہو جائے، اور اباحت والی دلیل اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ اضافہ مسلمان کو حاصل ہو، اور ہمارے علماء نے درس میں اس کا التزام کیا ہے کہ ربوا اور قمار کی حلت سے وہی صورت مراد ہے جبکہ اضافہ مسلمان کو حاصل ہو، جیسا کہ علت کا تقاضا ہے، اگرچہ جواب کا اطلاق اس کے خلاف ہے (۱۷۸/۶)۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا فتویٰ:

شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا ہے کہ اہل حرب کو سود دینا درست ہے یا نہیں؟

شاہ صاحب نے جواب تحریر فرمایا:

کتب فقہ کی عبارتیں عام واقع ہوئی ہیں، دینے اور لینے دونوں کو شامل ہیں مثلاً ”**لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب**“ اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے ایک

رسالہ میں سود دینے کی توجیہ لکھی ہے فقیر کو اس وقت یاد نہیں ہے، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ اہل حرب سے سود لینا اس وجہ سے حلال ہے کہ مال حربی ہے، اگر اس کے ضمن میں نقض عہد نہ ہو، اور حربی جب خود بخود دیتا ہے تو بلاشبہ حلال ہے، اور اہل حرب کو سود دینا اس وجہ سے حلال ہے کہ مسلمانوں کو حرام کھلانا درست نہیں ہے، اور اہل حرب تو حرام خور ہیں ہی، اگر کوئی چیز انہیں بطریق سود دی گئی تو بیش بریں نیست کہ حرام کھائے گا۔ رہا یہ کہ ذمیوں کو سود دینا کیوں جائز نہیں تو اگر چہ وہ حرام خور ہیں لیکن انہیں سود دینے سے دارالاسلام میں سودی معاملہ کی ترویج ہوگی، جو جائز نہیں، اور دارالحرب میں یہ دونوں علتیں مفقود ہیں، پس مباح ہے، اور تحقیق یہ ہے کہ سود دینا (اصالۃً نہیں) تبعاً حرام ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:

لیکن مسلمان کو چاہئے کہ حربی کو سود دینے میں احتیاط کرے، بے ضرورت نہ دے۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور استفتاء اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا جواب نقل کر دیا جائے، جو ایک اشکال کے سلسلے میں کیا گیا ہے:

پورب کے بعض امامیہ علماء نے انگریزوں سے اخذ ربوا کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ فتاوی میں میں نے دیکھا ہے کہ اگر کفار دارالاسلام پر تسلط حاصل کرلیں جب بھی وہ دارالحرب نہیں ہوتا، اور ایک اختلافی روایات کی بنیاد پر تحصیل نفع کی خاطر عمل کرنا اور دوسری نصوص جو کفار سے موالات کے عدم جواز کے سلسلے میں وارد ہیں، اعراض کرنا اور ان کے ساتھ مصاحبت وموافقت کرنا وہی حکم رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ’’افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض‘‘ علاوہ ازیں اخذ ربوا کا دروازہ کھل جائے گا تو پھر اس میں تساہل واقع ہوگا رفتہ رفتہ لوگ کفار ہند سے بلکہ خود مسلمان کے درمیان سودی معاملہ کا رواج ہوجائے گا۔

یہ اشکال جیسے اس وقت تھا آج بھی ہے، بلکہ آج تو یہ مسئلہ زیادہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے، تاہم شاہ صاحب نے اس کا جواب عنایت فرمایا ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

اہل حرب سے اخذ ربوا کے باب میں جو مفاسد تحریر کئے گئے معلوم ہوئے ۔ یہاں اس معاملہ کی اصلی اباحت مبحوث عنہ ہے، معہذا اکثر مفاسد جو یہاں لکھے گئے وہ اس لئے قابل قبول نہیں کہ کفار کے ساتھ جہاد اس سے زیادہ مفاسد کو متضمن ہے، مثلاً قتل رجال، غارت گری اموال، گرفتاری اولاد، تخریب عمارات، اور احراق اشجار وزراعات وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ عمل مسلمانوں کے ساتھ انتہائی قبیح ہے (اور جہاد میں مسلمان ان امور کا نشانہ بنتے ہیں) اس معاملہ کا دوسرے مفاسد کو متضمن ہونا دوسری چیز ہے، اس میں کلام نہیں ہے، بلکہ اس تقدیر پر گفتگو ہے کہ مفاسد سے خالی ہو، ورنہ مباحات بلکہ مستحبات تک مفاسد کے تضمن کی وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں، چہ جائے کہ یہ مسئلہ جو کہ متفق علیہ بھی نہیں ہے علماء احناف کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ جو لکھا کہ دارالاسلام کبھی دارالحرب نہیں بنتا مرجوح ہے، واضح یہ ہے کہ دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے۔

دیگر ائمہ کا مسلک:

اب تک کی گفتگو امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ کے مسلک کی روشنی میں تھی ۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر ائمہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے مسلک کا بھی مطالعہ کرلیا جائے، کتب حنفیہ میں امام ابو یوسفؒ کا مسلک ذکر کیا ہے، اور یہی مسلک تینوں ائمہ کا ہے، ان کے نزیک دارالحرب میں حربی سے سود لینا، سود ہی ہے اس لئے جائز نہیں ہے، ان کے مسلک کا حاصل یہ ہے کہ حربی کا مال گو کہ مباح ہے، مگر چونکہ مسلمان کے حق میں عقد ربوا حرام ہے خواہ کہیں بھی ہو، اور کسی کے ساتھ ہو، مانا کہ دارالحرب میں حربی سے ربوی معاملہ کے ذریعے حاصل کیا ہوا مال اس کی رضامندی سے لیا گیا ہو مگر دیکھنا چاہئے کہ

یہ تحصیل مال عقد ربا کی وجہ سے ہے، کھلی بات ہے کہ کافر حربی اپنا مال جو مسلمان کے حوالے کر رہا ہے، وہ اس لئے کر رہا ہے کہ دونوں کے درمیان لین دین کا ایک معاملہ ہو رہا ہے، وہ اسی لین دین پر رضامند ہے، اس کی رضا اس کے علاوہ اور کسی بنیاد پر نہیں، کیا وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا مال مسلمان کے لئے مباح ہے، اور وہ اسے لے سکتا ہے! جب یہ بات نہیں ہے تو یہ تاویل کہ مسلمان اس کی رضا مندی سے مال مباح پر قبضہ کر رہا ہے تاویل بعید ہے، وہ اس تحصیل میں موثر اور عامل نہیں ہے، موثر عقد ربوا ہی ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ مبسوط میں ہے:

"والمعنی فیه ان المسلم من اهل دار الاسلام فهو ممنوع من الربا بحکم الاسلام ولا یجوز ان یحمل فعله علی اخذ مال الکافر بطیبة نفسه لانه قد اخذ بحکم العقد ولان الکافر غیر راض باخذ هذا المال منه الا بطریق العقد منه ولو جاز هذا فی دار الحرب لجاز فی دار الاسلام بین المسلمین علی ان یجعل الدرهم بالدرهم والدرهم الآخر هبة" (۱۴/۵۷)۔

وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام کا مسلمان ربوا سے ممنوع ہے بحکم اسلام، اور یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے اس معاملہ کو اس پر محمول کیا جائے کہ اس نے کافر کا مال اس کی رضا سے لیا ہے، کیونکہ اس نے یہ بحکم عقد لیا ہے، اور اس لئے کہ کافر کی رضا اس مال کے دینے پر بحکم عقد ہوئی ہے، اور اگر یہ دارالحرب میں جائز ہو، تو اس جیسا معاملہ دارالاسلام میں بھی جائز ہونا چاہئے کہ ایک درہم ایک درہم کے عوض میں ہو، اور دوسرا درہم ہبہ سمجھ لیا جائے۔

اس مسلک کے لحاظ سے دارالحرب میں ربوا کا معاملہ کرنا ناجائز ہے، جیسے دارالاسلام میں، اس سے مال کی حیثیت ونوعیت کے فرق سے کوئی اختلاف نہیں واقع ہوتا، عقد ربوا علی الاطلاق حرام ہے۔

دلیل کے لحاظ سے طرفین (امام صاحب وامام محمد) کا مسلک قوی ہے، اور اجراء عمل کے لحاظ سے امام ابویوسف کا مسلک احوط ہے کہ اس سے بہت سے مفاسد سے حفاظت رہتی ہے۔

۱- ہندوستان کی شرعی حیثیت؟ دارالحرب یا دارالاسلام:

اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں:

۱- دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کیا ہے؟ کیا دارالاسلام کبھی دارالحرب بن سکتا ہے، اگر بن سکتا ہے تو کب؟

۲- ہندوستان اپنے موجودہ نظام حکومت کے لحاظ سے جہاں حکومت کی تشکیل میں کافر اور مسلمان دونوں دخیل ہیں اور جہاں دستوری اعتبار سے دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں، کیا دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تحریر فرماتے ہیں کہ:

جاننا چاہئے کہ کسی شہر اور ملک کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے کا مدار غلبہ کفار پر ہے اور بس، اس لئے ہر وہ جگہ جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت ہو وہ دارالاسلام کہی جائے گی۔ جامع الرموز کتاب الجہاد (جلد ۴) میں ہے: دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کے حاکم کا فرمان جاری ہو اور دارالحرب وہ ہے جس میں کافروں کے سردار کا حکم چلتا ہو، ایسا ہی کافی میں ہے، اور زاہدی میں ذکر کیا ہے کہ جس جگہ مسلمانوں کا غلبہ ہو وہ دارالاسلام ہے، اور جس جگہ کفار سے مسلمان خائف ہوں وہ دارالحرب ہے۔

یہ اور اس طرح کی عبارات کتب فقہ میں مذکور ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ دارالاسلام ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہاں مسلمانوں کا حاکم ہو، اس کا غلبہ واقتدار ہو، اور مسلمان اپنے احکام کو بطور اقتدار کے ادا کرتے ہوں، اس کے برخلاف جہاں کفار کا غلبہ ہو، ان کے احکام بے دغدغہ چلتے ہوں، اور مسلمان اپنے احکام ان کی رواداری، بے تعصبی یا ان کی اجازت سے ادا کرتے ہوں وہ جگہ دارالکفر یا دارالحرب ہے، کسی جگہ صرف مسلمانوں کے آباد ہونے سے مسئلہ میں کوئی تفاوت نہیں آتا۔

دارالاسلام کب دارالحرب بنتا ہے؟

کسی بھی دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہاں اسلام کے احکام بطور غلبہ کے جاری ہوجائیں۔

”لا خلاف بين اصحابنا فى ان دار الكفر تصير دار الاسلام بظهور احكام الاسلام فيها“(بدائع ۷/ ۱۳۰)۔

ہمارے علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دارالکفر اس وقت دارالاسلام بن جاتا ہے جب اس میں اسلام کے احکام کا غلبہ ہوجائے۔

لیکن یہ کہ دارالحرب دارالاسلام کب بنتا ہے، اس میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ دارالاسلام تین شرطوں سے دارالکفر بنتا ہے۔ایک احکام کفر کا غلبہ، دوسرے یہ کہ کسی دارالکفر سے متصل ہو، تیسرے یہ کہ اس میں کوئی مسلمان یا ذمی سابقہ امان کی بنیاد پر نہ ہو یعنی مسلمانوں کے امان کی بنیاد پر۔

لیکن امام ابویوسف اور امام محمد فرماتے ہیں:

”انها تصير دار الكفر بظهور احكام الكفر فيها“(حوالہ بالا)۔

دارالاسلام، کفر کے احکام کے غلبہ کے بعد دارالکفر بن جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دارالاسلام پر جب کفار کا ایسا غلبہ ہوجائے کہ وہاں سے اسلام کا غلبہ زائل ہوجائے تو وہ ملک دارالحرب ہوگیا، اور اگر کفار کا غلبہ تو ہوا، مگر بعض حیثیات سے اس میں اسلام کا غلبہ باقی ہے تو اس کو اب بھی دارالاسلام کہا جائے گا، اتنی بات پر سب کا اتفاق ہے، البتہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ غلبہ اسلام کے بالکل زائل ہوجانے کی علامت کیا ہے، تو صاحبین نے یہ فرمایا کہ جب احکام کفر علی الاعلان جاری ہوگئے، اور اسلام کے احکام مغلوب

ہو گئے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کا غلبہ ختم ہو گیا، لیکن امام صاحب اس کے ساتھ مزید دو باتیں اور فرماتے ہیں، ایک یہ کہ دار الحرب سے اس کی سرحد متصل ہو، کیونکہ اگر اس سے دار الاسلام کی سرحد متصل ہوگی تو وہاں سے ہر وقت امداد کی گنجائش ہوگی، اور یہ توقع قوی ہوگی کہ مسلمانوں کا پھر غلبہ ہو جائے، اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص ذمی یا مسلمان سابقہ امان کے ساتھ باقی نہ ہو، کیونکہ مسلمانوں کے سابقہ دئے ہوئے امان کی بنیاد پر اگر کوئی ہوگا تو اس کا صاف مطلب ہوگا کہ ابھی کسی قدر غلبہ مسلمانوں کا باقی ہے، حاصل ان دونوں شرطوں کا وہی ہے کہ غلبہ اسلام بالکل ختم ہو چکا ہو۔

مولانا گنگوہی جامع الرموز سے نقل فرماتے ہیں:

دوسرے اس کا دار الحرب کے ساتھ ایسا متصل ہونا کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں سے درمیان میں حائل نہ رہے، جس سے مسلمانوں کو مدد پہنچ سکے، دوسری بات یہ کہ دار الحرب کے ساتھ متصل ہونے کی جو شرط امام صاحب نے لگائی ہے اس کا مطلب بھی وہی غلبہ وقوت ہے کیونکہ دار الحرب کے ساتھ متصل ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو مدد نہیں پہنچ سکتی بخلاف اس صورت کے کہ دار الحرب سے انقطاع ہو تو مسلمانوں کو استخلاص دار الاسلام میں مدد کے پہنچنے کا زیادہ احتمال ہے، اس لئے ابھی تک اسلام کی قوت باقی سمجھی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر طرح اسلام کا غلبہ کسی ملک سے ختم ہو جائے تو وہ دار الکفر بن گیا اور امام صاحب نے جو شرطیں متعین کی ہیں وہ اسی کی علامات ہیں، امام صاحب اور صاحبین کا مقصود ایک ہی ہے یعنی مسلمانوں کے غلبہ وقوت کا وجود اگر چہ بعض وجوہ سے ہو، اس کے دار الکفر بننے سے مانع ہے، لیکن علماء اسلام میں سے کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی ان کی صریح اجازت سے، یا انکی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک دار الاسلام ہو جائے گا، حاشا وکلا، کیونکہ یہ خیال تفقہ سے بالکل دور ہے (ملخصا از تالیفات رشیدیہ فیصلہ اعلام فی دار الحرب ودار الاسلام)۔

ہندوستان کی موجودہ حالت:

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ تو یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ ملک از ابتداء تا انتہاء دارالکفر تھا، مسلمان جن جن علاقوں کو فتح کرکے اپنی حکومت قائم کرتے گئے وہ دارالاسلام بنتے گئے تاہم پورا ملک (جس کا اطلاق ۱۹۴۷ء سے پہلے موجودہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پر ہوتا تھا) مکمل مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا، کتنے رجواڑے اور ریاستیں ایسی تھیں جو غیر مسلم حکمرانوں کے زیر نگیں تھیں، وہ کبھی مصالحت کر کے مسلمان بادشاہوں سے اپنی ریاست بچائے رہتے تھے، اور کبھی موقع پاتے تو جنگ وجدال بھی کرتے، اس وقت پورا ملک ایک اکائی نہ تھا، مختلف ریاستیں تھیں، کچھ ہندو ریاستیں اور کچھ مسلمان ریاستیں، مغل دور حکومت میں بعض ریاستیں باجگذار تھیں اور بعض خود مختار، اس قسم کی ہندو ریاستیں تو دارالاسلام بن نہیں سکیں، ہاں جہاں تک مسلمانوں کی حکومت تھی وہ حصہ دارالاسلام تھا۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی مغل حکومت کا سقوط ہوا اس کے بعد پورے ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا، البتہ کچھ رجواڑے اور کچھ مسلم ریاستیں بھوپال، رام پور، حیدرآباد، ٹونک، بھاولپور وغیرہ مشہور ریاستیں تھیں، اس دور میں جہاں جہاں انگریزوں کا قہراً تسلط ہوا، ان کے سلسلے میں علماء کا اختلاف تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اس شہر میں امام المسلمین کا حکم قطعاً نہیں چلتا اور روساء نصاری کا حکم بے دغدغہ جاری ہے، اور احکام کفر کے اجراء سے مراد یہ ہے کہ ملک داری، رعایا کے انتظامات، محصول وخراج کی وصولی، اموال تجارت پر ٹیکس، چوروں ڈاکوؤں کی سزا دہی، مقدمات کے فیصلوں اور جرائم کی سزا میں کفار بطور خود حاکم ہوں، اگر اسلام کے بعض احکام مثلاً جمعہ وعیدین اور اذان اور

گائے کے ذبیحے سے تعرض نہ کریں تو کیا ہوا۔ان چیزوں کی اصل الاصول تو ان کے نزدیک محض بے حیثیت ہے کیونکہ مساجد کو بے تکلف گرادیتے ہیں، اور کسی مسلمان یا ذمی کی مجال نہیں ہے ان کی اجازت کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف میں آسکے، وہ اپنی منفعت کے واسطے آنے والوں اور مسافر و تاجر کی مخالفت نہیں کرتے، دوسرے اکابر مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کے حکم کے بغیر ان شہروں میں قدم نہیں رکھ سکتے، اس شہر (دہلی) سے کلکتہ تک نصاریٰ کی علمداری ہے، ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنو، رامپور میں اپنے احکام کو اس لئے جاری نہیں کیا کہ وہاں کے والیان نے ان سے صلح اور ان کی اطاعت کر رکھی ہے۔

یہ بات ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے لکھی گئی ہے، جبکہ مغلوں کا نام بھی باقی تھا، لال قلعہ کے دائرہ میں ہی سہی ان کی حکومت کا چراغ جل رہا تھا، پھر سن مذکور کے بعد تو حالت اور دگرگوں ہوگئی، حضرت مولانا گنگوہی ان لوگوں میں ہیں جو ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بنفس نفیس شریک تھے، اس وقت کے اور اس کے بعد کے حالات کے وہ صرف عینی نہیں بلکہ براہ راست انقلاب وتداول ایام کا تجربہ رکھتے تھے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) محقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کرلیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس غلبہ وقوت کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی ادنی کلکٹر یہ حکم کردے کہ مساجد میں جماعت نہ ادا کرو تو کسی امیر وغریب کی مجال نہیں کہ ادا کرسکے، اور یہ جو کچھ ادائے جمعہ وعیدین اور عمل (بعض) قواعد فقہیہ پر ہو رہا ہے محض ان کے قانون کی وجہ سے ہے کہ انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ ہر شخص اپنے مذہب میں آزاد ہے، سرکار کو اس سے کوئی مزاحمت نہیں۔

اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا، اب اس کا کہیں نام ونشان نہیں، کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا تھا آج بھی ہم اسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں، بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے، اور اسی نصاری

کے دیئے ہوئے امن کے ذریعہ تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔

رہا اتصال بدارالحرب سو یہ ممالک واقالیم عظیمہ کے لئے شرط نہیں ہے، بلکہ گاؤں اور شہر وغیرہ کے لئے شرط ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہنچنا آسان ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں؟ حاشا وکلا۔ بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے، بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامان کی ضرورت ہے۔

بہر حال تسلط کفار کا ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا تسلط کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا، اور شعائر اسلامیہ جو مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں، وہ محض ان کی اجازت سے ہیں، ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز کوئی رعایا نہیں، ہندوؤں کو بھی ایک درجہ رسوخ حکومت میں حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں، البتہ ریاست ٹونک اور رامپور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوب کفار ہونے کے اپنے احکام کو جاری رکھتے ہیں، ان کو دارالاسلام کہا جاتا ہے (تالیفات رشیدیہ/ ۶۶۸)۔

جو صورت حال انگریزی دور حکومت میں تھی، اگر اس وقت ہندوستان دارالحرب تھا، تو اب ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی ہے، جس کی بنیاد پر اسے دارالاسلام قرار دیا جا سکے (بلکہ پہلے جو اسلامی ریاستیں کسی حیثیت سے اپنا وجود بچا کر دارالاسلام قائم کئے ہوئے تھیں، اب وہ سب فنا ہو چکی ہیں) پہلے انگریزوں کو غلبہ حاصل تھا اب اکثریت کو قوت حاصل ہے، اقلیت کا کام صرف اس قدر ہے کہ کسی پلڑے میں اپنا وزن ڈال کر اسے ذرا وزنی بنا دے، اور اس کے عوض میں کچھ دستوری حقوق سے مستفید ہو لے، مسلمان جو کچھ اسلامی احکام پر عمل کر لیتے ہیں وہ بر بنائے غلبہ وقوت نہیں ہے، بلکہ ملک کا دستور سیکولر ہے، اس میں ہر اقلیت کو تحفظ دیا گیا ہے، اسی تحفظ سے اہل اسلام استفادہ کرتے ہیں، یہی وجہ تحفظ ہے جسے فقہاء امان سے تعبیر کرتے ہیں، ایسا تحفظ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو بھی ملتا ہے، اس صورت حال میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا متعین

ہے۔

پھر دارالحرب یادارالکفر کی دوقسمیں ہیں، ایک تو وہ جو بالفعل اہل اسلام سے برسر پیکار ہو یا آمادہ جنگ ہو، دوسرے وہ جس کی مسلمانوں سے صلح ہو، اور مسلمان وہاں ان کے امان کے تحت رہتے یا آتے جاتے ہوں، اس دوسری قسم کو دارالموادعۃ کہہ سکتے ہیں لیکن وہ بھی دارالحرب ہی ہے۔علامہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں:

"ولو ان اهل دار من اهل دارالحرب وادعوا اهل الاسلام فدخل اليهم مسلم و بايعهم الدرهم بالدرهمين لم يكن بذالک باس لان بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام" (۱۴۹۳/۴)۔

اگر کسی دارالحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کرلی، پھر وہاں کوئی مسلمان گیااوران سے ایک درہم کے عوض دو درہم کی بیع کی تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مصالحت سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن جاتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان مسلمانوں کے حق میں دارالحرب کی دوسری قسم بنتا ہے، یہاں کے غیر مسلموں سے غدر، خیانت اور سرقہ تو جائز نہیں، لیکن ان کی رضامندی سے ان کے اموال کو عقود فاسدہ (جن میں ربوی معاملات بھی داخل ہیں) کے تحت حاصل کرنا امام صاحب اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔

اس تفصیلی گفتگو کے بعد سوالنامہ میں درج سوالوں کے جواب طرفین کے قول کی روشنی میں تحریر کئے جاتے ہیں:

۱— ربوا کی شرعی حقیقت، اوراس کا دائرہ بیان کیا جاچکا۔

۲— دارالحرب میں غیر مسلم حربی سے عقود فاسدہ جن میں ربوی معامات بھی داخل ہیں، درست ہیں، اوران کے ذریعہ حاصل کیا ہوا مال درحقیقت ایک مباح مال پر بغیر غدر وخیانت اور بغیر غصب وسرقہ کے قبضہ ہے، اوراس سے ملکیت جائز ہوجاتی ہے، عقود فاسدہ بظاہر نظر ہیں،

فی الحقیقت موثر نہیں ہیں۔

۳— دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف اور شرائط کی تفصیل بیان ہو چکی ، ہندوستان بحالت موجودہ دارالحرب بمعنی دارالموادعۃ ہے۔

۴— بینکوں کی نوعیت کیا ہے؟ اوران میں جمع شدہ رقم کی حیثیت کیا ہے؟ ان دوسوالوں کی تعیین کے بعد جواب دیا جاسکتا ہے۔

(الف) اگر بینک سرکاری ہے، اور جو رقم اس میں جمع کی گئی ہے وہ قرض ہے، رقم جمع کرنے والے کی اس بینک کے کاروبار میں شرکت نہیں ہے، تو اس کی اضافہ کی ہوئی رقم پر سود کا اطلاق نہ ہوگا۔

(ب) اسی صورت حال میں اگر رقم جمع کرنے والے کی بینک کے کاروبار میں شرعاً شرکت ہے، مثلاً یہ کہ وہ نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہے، تو چونکہ ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے اور وکیل کا عمل موکل کا عمل متصور ہوتا ہے، تو بینک جو سودی کاروبار بلا امتیاز مسلم وغیر مسلم سب کے ساتھ کر رہا ہے، اس کی اس میں عملاً شرکت ہوگی، اس صورت میں بینک میں اس طرح کی رقم جمع کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی سود وصول کرنا جائز ہے۔

(ج) بینک اگر غیر سرکاری ہے، اور اس میں کلاً یا جزئً مسلمان شریک ہیں، تو اس سے سود لینا ناجائز ہے اور اگر اس میں سب غیر مسلم اور رقم جمع کرنے والے کی شرکت نہ ہو تو جائز ورنہ ناجائز۔

۵— سود لینا اور دینا دونوں گناہ ہے لیکن دونوں میں فرق ہے، غیر اسلامی ملک مثلاً ہندوستان میں مواقع حاجت پر سود دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

٦— حتی الامکان دارالحرب میں بھی سودی قرضوں سے بچنا چاہئے، خود مسلمانوں کے باہمی سودی قرضے تو بالکل ناجائز ہیں الا فی حالۃ الاضطرار، غیر مسلم فرد یا کمپنی، یا سرکاری بینک سے حاجت شدیدہ کے موقع پر سودی قرضہ لیا جاسکتا ہے۔

۷— حکومت اگر کسی قرض پر چھوٹ دیتی ہو، اور سود بھی عائد کرتی ہو، تو اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی یا اس سے زیادہ ہو تو بالکل درست ہے، اور کم بھی ہو تب بھی گنجائش ہے۔

۹— غیر ممالک سے تجارت کرنے کی صورت میں سود کا مسئلہ ایک مجبوری ہے، وہ جائز ہے۔

۱۰— گذر چکا ہے۔

۱۱— کچھ افراد یا کمپنیاں جو سرمایہ کاری کرتی ہیں، اگر وہ غیر مسلم ہیں، تو ان سے معاملہ کرنا جائز ہے، ورنہ نہیں۔

یہ سارے جوابات امام صاحب اور امام محمد علیہما الرحمۃ کے قول کی روشنی میں تحریر کئے گئے ہیں، اور اس میں بھی وہ تشریح قبول کی گئی ہے جو شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے کی ہے۔

لیکن مسلمانوں کی غفلت اور دین سے دوری کا جو حال ہے، عجب نہیں کہ اس طرح کے مسائل سے ان میں جراءت بڑھ جائے گی، اور وہ صریح ناجائز اور حرام معاملات کے مرتکب ہو جائیں، اس لئے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کر لینا چاہئے۔

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف کے قول کی روشنی میں، سوال میں مذکور ۸ کو مستثنیٰ کر کے کوئی معاملہ صحیح نہیں ہوگا، ۸ میں چونکہ چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہے، اس لئے اصل قرض کی ادائیگی ہوگی وہ بہر حال جائز ہے، البتہ اس میں مزید یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ بینکوں میں جمع شدہ رقم کا سود نکال کر غرباء ومساکین کو بلا ثواب تقسیم کر دیا جائے۔

ضمیمہ سوالنامہ: ۲

جناب سید امین الحسن صاحب رضوی نے ضمیمہ سوالنامہ ۲ میں چند صورت مسائل لکھ کر

جو سوالات اٹھائے ہیں ان میں سوال نمبر ۱ اور سوال نمبر ۴ میں شرعاً سود کا اطلاق نہیں ہوتا۔

۱— قانون اراضی کے مسئلے میں ظاہر ہے کہ مالک زمین نے نہ کوئی قیمت ابھی وصول کی ہے نہ گورنمنٹ کو کوئی قرض دیا ہے، گورنمنٹ نے اس کی زمین کی جو قیمت متعین کی ہے، اس پر اسے اعتراض ہے، وہ اس کی چارہ جوئی عدالت میں کرتا ہے، قاضی دوبارہ اس کی قیمت متعین کرتا ہے، اور ایک خاص مقدار پر بنام سود کچھ اضافہ کر کے فیصلہ کرتا ہے، یہ ساری رقم قیمت میں محسوب ہوگی، ربوا کا اطلاق یہاں سرے سے نہیں ہے کہ عدم جواز کا سوال پیدا ہو۔

۴— فوجی کے مسئلے کا بھی یہی حال ہے، اس کو جتنی رقم ملنی چاہئے تھی نہیں ملی، اس نے عدالت سے رجوع کیا، عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا، اور ساتھ کچھ اور رقم بھی بنام سود دلوائی یہ خالص تبرع ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

۲— فلاحی ریاست کے تصور کے تحت حکومت جو قرض تقسیم کرتی ہے، یہ بلاشبہ سودی قرض ہے، اس سود کا نام اگر بدل دیا جائے تو اس کی حقیقت نہیں بدل جائے گی، جیسے مذکورہ بالا دونوں مسائل میں ایک خاص رقم کو سود کہہ دینے سے وہ سود نہیں ہوجاتی، اس قرض کا حکم اصل مقالہ میں بیان کیا جاچکا ہے۔

۳— انڈین آئیل کارپوریشن کی جو صورت رضوی صاحب نے ذکر کی ہے، وہ کسی قدر مبہم ہے، تاہم اس کی صورت نہ مضاربت کی بنتی ہے اور نہ شرکت کی، کیونکہ بظاہر تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالکان حصص اپنی متعین سود کی رقم بہر حال پاجاتے ہیں، خواہ کارپوریشن کو نفع ہو یا نقصان۔ ان کی شرکت نفع نقصان کسی میں نہیں، فرض کیجئے کارپوریشن کو نفع اس کے اندازہ سے زیادہ ہوا جب بھی وہ اتنا ہی سود دے گا جتنا طے ہو چکا ہے، یا نفع اندازہ سے کم ہوا جب بھی اسی مقدار میں سود ادا کریگا، اس میں بیش وکم نہ ہوگا، اگر یہی صورت حال ہے تو حصص کی فروخت محض نام ہی نام ہے، درحقیقت یہ قرض ہے، جو مالکان حصص نے دئے ہیں، اور اسی قرض پر

سود وصول ہورہا ہے، اسے حاصل کرنا طرفین کے نزدیک درست ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک نہیں۔

☆☆☆

مسئلہ سود

مولانا شمس پیرزادہؒ، ممبئی

۱۔ ربا کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا دائرہ کیا ہے؟

قرآن کریم سے ربا کی حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ قرض اور ادھار لین دین کی صورت میں زر اصل (راس المال) پر ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر اضافہ ہے جو صریح ظلم ہے اور اس کی حرمت اتنی شدید ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کے خلاف جو ربا سے باز آنا نہیں چاہتے اعلان جنگ کیا گیا ہے۔

"فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" (سورۂ بقرہ ۲۷۹)۔

قرآن نے ربا کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے، اس لئے مہاجنی سود (USUARY)) اور تجارتی سود جس کا ذریعہ بنک ہیں دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور بنک کے سود کو قرآن کے حرام ٹھہرائے ہوئے ربا سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بنک کا سود جب زر اصل پر مدت کے مقابلہ میں اضافہ ہے تو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین ربا قرار پایا۔ شرح کے کم زیادہ ہونے سے اس کی خباثت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

رہا ربا کا دائرہ تو قرآن نے ربا النسیۃ کو حرام قرار دیا ہے لیکن حدیث نے ذریعہ کے طور پر ربا الفضل کو بھی حرام ٹھہرایا ہے۔ بخاری کی حدیث ہے:

"الذهب بالذهب ربا لاهاء وهاء والبر بالبر ربا الا هاء وهاء والشعير

بالشعیر ربا الا هاء وهاء والتمر والتمر ربا الا هاء وهاء"۔

دوسری حدیث میں ہے:

"لا تبیعوا الذهب بالذهب الا سواء والفضة بالفضة الا سواء بسواء وبیعوا الذهب بالفضة والفضة بالذهب کیف شئتم" (بخاری کتاب البیوع)۔

ربا کی یہ حقیقت فقہاء کے اقوال اور علماء کی آراء سے بھی واضح ہے، علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"وفی الشریعة الربا هو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع لما بینا ان البیع الحلال مقابلة مال متقوم بمال متقوم فالفضل الخالی عن العوض اذا دخل فی البیع کان ضد ما یقتضیه البیع فکان حراما شرعاً واشتراطه فی البیع مفسد للبیع کاشتراط الخمر وغیرها" (المبسوط للسرخسی ۱۲/۱۰۹)۔

علامہ جصاصؒ فرماتے ہیں:

"واسم الربا فی الشرع یعتوره معان، احدها الربا الذی کان علیه اهل الجاهلیة، والثانی التفاضل فی الجنس الواحد من المکیل والموزون علی قول اصحابنا ---------- الثالث النساء وهو علی ضرورة منها فی الجنس الواحد من کل شئی لا یجوز بیع بعضه ببعض نساء سواء کان من المکیل او من الموزون او من غیره" (احکام القرآن للجصاص ۱/۵۵۲)۔

الفقہ علی المذاہب الاربعۃ میں ربا کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

"اما فی اصطلاح الفقهاء :فهو زیادة احد البدلین المتجانسین من غیر ان یقابل هذه الزیادة عوض" (الفقہ علی المذہب الاربعۃ ۲/۲۴۵)۔

علی الطنطاوی فرماتے ہیں:

"فزیادة مال الانسان بمرور الزمان من غیر عمل منه هو الربا" (فتاوی علی الطنطاوی / ۱۳۳)۔

سید سابقؒ فرماتے ہیں:

"الربا فی اللغة: الزیادة، و المقصود به ھھنا :الزیادة علی رأس المال قلت او کثرت" (فقہ السنہ ۳/۱۳۱)۔

دار الافتاء ریاض کے رکن عبداللہ بن سلیمان بن منیع فرماتے ہیں:

"فالربا بعبارة مختصرة ھو الزیادة فی غیر مقابلة عوض غیر مشروع او کما قال شیخ الاسلام ابن تیمیة رحمہ اللہ فی مجموع فتاواہ وحرم الربا لانہ متضمن للظلم فانہ اخذ فضل بلا مقابل لہ۔ فکل معاملة استھدفت ھذہ الزیادة مباشرة و کانت وسیلة الیھا فھی معاملة ربویة وبالتالی فھی محرمة لان زیادة احد العوضین علی الآخر فی غیر مقابلة مشروعة تعتبر من اکل اموال الناس بالباطل" (الورق النقدی / ۱۳۲)۔

اور فاضل مؤلف کرنسی نوٹ میں ربا کے جاری ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فانی اری ان ا لورق النقدی ثمن قائم بذاتہ لہ حکم النقدین الذھب والفضة فی جریان الربا بنوعیہ فیہ" (الورق النقدی / ۱۴۹)۔

اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

اور اصلاح شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے:

"الربا فی اللغة الزیادة والربا فی الآیة کل زیادة لا یقابلھا عوض" (احکام القرآن ابن العربی)۔

ربا کی حقیقت جو نزول قرآن سے پہلے بھی سمجھی جاتی تھی یہ تھی کہ قرض دے کر اس پر نفع لیا جائے نی نی (جواہر الفقہ ۳/۳۲)۔

ربا کی وضاحت انگریزی میں سعودی عرب مونیٹری ایجنسی کے ایکونومک ایڈوائزر جناب ایم عمر چھاپرا صاحب نے اپنی کتاب "ٹوورڈز اے جسٹ مونیٹر سیسٹم" میں اس طرح کی ہے:

"Raba literally means increase addition, expansion or growth. It is however, not every increase or growth which has been prohibited by Islam in the sharia'h riba technically refers to the premium, that must be paid by the borrower to the lender alongwith the principal amount as a condition for the loan or for an extension in its maturity in this sense, riba has the same meaning and import as (Jurists) without any exception. The term riba is however used in the Sharia'h in two senses. The first is riba al-nasi'ah and the second is riba al- fadl:

(Towards a just monetry System by M. Umer Chapra Published by The Islamic Foundation 223 London Road, Leicester, U.K. page 56)

دراصل ربا کی شرعی حقیقت کے بارے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہں ہے اور اس کے وسیع دائرہ میں ہر قسم کا سود شامل ہے خواہ اس کا تعلق اس قرض سے ہو جو شخصی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دیا گیا ہو یا جو پیداواری اور تجارتی مقاصد کے لئے دیا گیا ہو، قرض لینے والا فرد ہو یا ادارہ، حکومت، شرح کم ہو یا زیادہ اور سود مہاجنی ہو یا بنک کا، اور بنک پرائیویٹ ہو یا سرکاری، نیز سود دینے والا غیر مسلم ہو یا مسلم، اس سے سود کی حرمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہر حال میں یہ ربا ہی رہتا ہے۔

کیا دارالحرب میں سودی معاملات حقیقۃً سود قرار نہیں دیئے جاسکتے:

دارالحرب میں سودی معاملات کے جواز کے لئے قرآن وسنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، قرآن نے بغیر کسی استثناء کے ربا کو حرام ٹھہرایا ہے جس کا ہر مسلمان پابند ہے خواہ وہ دارالاسلام میں رہتا ہو یا دارالحرب میں اور خواہ مسلمان سے معاملہ ہو یا غیر مسلم سے۔ یہود البتہ اس بات کے قائل تھے کہ غیر قوموں سے سود لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ بائبل میں ہے:

"تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا تا کہ

(استثناء:۲:۲۳)۔

اور قرآن ان کی امیوں کے معاملہ میں بدمعاملگی پر گرفت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ذٰلِکَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيْلٌ" (آل عمران:۷۵)۔

اسی طرح حدیث میں بھی ربا کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جو دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان ربا کو جائز قرار دیتی ہو۔

جمہور فقہاء بھی دارالحرب میں سود کو جائز قرار نہیں دیتے، البتہ بعض حنفیہ جواز کے قائل ہیں (دیکھئے: المبسوط للسرخسی ۱۰/ ۹۵ اور ۱۴/ ۵۶)۔

علامہ سرخسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالحرب میں سود کے جواز کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا استدلال نہایت کمزور ہے، اور ایک مرسل روایت کا انہوں نے سہارا لیا ہے جب کہ امام ابو یوسف اور امام شافعی عدم جواز کے قائل ہیں۔ مکحول کی جس روایت کو جواز کی تائید میں پیش کیا گیا ہے اس کا صحیح احادیث کی معروف کتابوں میں کہیں وجود نہیں ہے۔ ایک مرسل اور غریب روایت کو جو قرآن وسنت کے واضح تصدیق کے بالکل خلاف ہو استدلال میں پیش کرنا بہت عجیب ہے۔ ایک شدید حرمت والی چیز کو ایسی کمزور روایت کی بنا پر ہرگز حلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن تعجب ہے کہ ہدایہ میں اس کو بالکل جائز قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو: ہدایہ ۳/ ۵۳)۔

ہدایہ کی دلیل سے تو دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان قمار، لاٹری اور دوسرے بیوع فاسدہ کے لئے بھی جواز کی صورت نکل آتی ہے، اور جب مسلمان ایک حربی کے ہاتھ مردار اور خون فروخت کرے گا تو اخلاقی لحاظ سے اسے کس سطح پر اترآنا ہوگا، اور اس کے کیا اثرات غیر مسلموں پر مرتب ہوں گے؟ کیا یہ باتیں اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں۔ فقہاء کے ان شاذ اقوال کی تردید ابن قدامہ نے بڑی خوبی سے کی ہے (دیکھئے: المغنی ۴/ ۴۵)۔

رہی یہ بات کہ اموال اہل حرب معصوم نہیں ہیں تو یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ قرآن نے جہاد کے موقع پر مال غنیمت اور فئے کو جائز ٹھہرایا

ہے، اور یہ مال مجاہدین حکومت کی تحویل میں دیتے ہیں جس کی تقسیم شرعی ضابطہ کے مطابق عمل میں آتی ہے، لیکن حربی سے سود لے کر ایک مسلمان اپنی جیب گرم کرتا ہے، نیز وہ حصولِ مال کا ایک فاسد اور حرام طریقہ اختیار کرتا ہے جبکہ مالِ غنیمت معروف اور جائز طریقہ پر حاصل کیا جاتا ہے۔

حدیث سے بھی ثابت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے سود کے بقایاجات کو ساقط قرار دیا۔ اگر حربی سے سود لینا جائز ہوتو لوگوں کو اجازت دی جاتی کہ وہ اپنے سودی بقایاجات وصول کرلیں۔

ان حقائق کے پیش نظر دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان ربا کے جواز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، اور چونکہ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس لئے اس کی سختی کے ساتھ تردید ہونی چاہئے اور اتنے اہم مسئلہ میں جس میں قرآن وسنت ناطق ہیں کسی امام اور کسی فقیہ کے قول کو جب کہ وہ نصوص صریحہ سے متصادم ہو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہئے۔

۳— کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟

دارالاسلام اور دارالحرب قرآن وسنت کی اصطلاحات نہیں بلکہ فقہاء کی اصطلاحات ہیں۔ انہوں نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر جس ملک میں اسلام کے احکام جاری تھے اس کو دارالاسلام قرار دیا اور جس ملک کا اقتدار کافروں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے اسلام کے احکام جاری نہیں ہوسکتے تھے اور جو دارالاسلام سے برسرجنگ ہوتا تھا دارالحرب قرار دیا۔ البتہ اس وقت بھی بعض ایسے ممالک پر جو دارالحرب کے دائرہ میں آتے تھے مگر دارالاسلام کی حکومت سے صلح اور موادعت کے تعلقات ہونے کی بنا پر دارالحرب کے تمام احکام منطبق نہیں کئے گئے۔

علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

”لانهم اهل الحرب وان كانوا موادعين۔ الا ترى انهم بعد مضى المدة

یعودون حربا للمسلمین"(المغنی ١٠/٨٩)۔

اور مغنی میں حربی تاجروں سے تعرض نہ کرنے کی استثنائی صورت بیان ہوئی ہے:

"**و اذا دخل حربی فی دار الاسلام بغیر امان نظرت فان کان معه متاع یبیعه فی دار الاسلام وقد جرت العادة بدخولهم الینا تجارا بغیر امان لم یعرض لهم**"(المغنی ٨/٤٠٣)۔

دارالحرب کا اطلاق اپنے معنی کے لحاظ سے ایسے ممالک ہی پر ہونا چاہئے جو دارالاسلام سے برسر جنگ ہوں۔ رہے دوسرے غیر اسلامی ممالک تو ان کے لئے دارالکفر کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے مگر فقہی کتب میں خاصا الجھاؤ پایا جاتا ہے اور دارالاسلام اور دارالکفر کی کوئی جامع ومانع تعریف نہیں ملتی۔

رہا موجودہ ہندوستان تو وہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہے جس کی غالب اکثریت غیر مسلم ہے اور اقتدار اصلاً اسی کے ہاتھ میں ہے، اس لئے وہ دارلاسلام نہیں ہے مگر چونکہ مسلمانوں کو نہ صرف مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی ایک حد تک آزادی حاصل ہے بلکہ دستور کی رو سے وہ اقتدار میں بھی شریک ہیں اور عملاً ان کی حیثیت شریکِ اقتدار اور شریک حکومت کی ہے، مزید برآں یہ مسلمانوں کی کثیر آبادی والا ملک ہے جو دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے اور یہاں مسلمان ایک ہزار سال تک حکومت بھی کر چکے ہیں نیز ان کے بے شمار دینی شعائر بھی موجود ہیں، اس لئے اس پر دارالحرب کا اطلاق نہیں ہوسکتا لہذا ہمیں حالات، دینی مقاصد، ملّی ضرورتوں اور اجتماعی مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے شرعی احکام کے انطباق کے سلسلہ میں قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی اور مختلف مسائل میں اجتہاد بھی کرنا ہوگا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام ایک طویل عرصہ اپنے ملک میں دعوتی کشمکش میں گذارتے رہے ہیں اور شدید مخالفت اور عناد کے باوجود انہوں نے اور ان کے ساتھی اہل ایمان نے کافروں کی جان ومال سے کوئی تعرض نہیں کیا، اور یوسف علیہ السلام

کی مثال تو بہت واضح ہے، وہ جب مصر کے مختار بن گئے تو اس ملک کی پوزیشن نہ دارالاسلام کی تھی اور نہ دارالحرب کی۔ دارالاسلام کی اس لئے نہیں کہ بادشاہ کا قانون وہاں جاری تھا، اور دارالحرب اس لئے نہیں کہ بادشاہ نے اللہ کے رسول کو اپنے ملک کا مختار بنا دیا۔معلوم ہوا کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان کی بھی بعض صورتیں ممکن ہیں۔

۴- بنک سے ملنے والا سود شرعاً کیا حکم رکھتا ہے اور لینے کے بعد اسے کس مصرف میں صرف کیا جائے؟

بنکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ سود سود ہے اور اس کا لینا خواہ وہ کسی غرض سے ہو جائز نہیں۔ بنک میں رقوم جمع کرنے کے لئے دو قسم کے کھاتے کھولے جاتے ہیں۔ ایک کرنٹ اکاؤنٹ (CURRENT ACCOUNT) دوسرا سیونگ اکاؤنٹ (SAVING ACCOUNT) کرنٹ اکاونٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک کوئی سود نہیں دیتا اس لئے اسی کو ترجیح دی جانی چاہئے۔ سیونگ اکانٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک سود دیتا ہے۔ یہ سود اگر بنک ہی کو چھوڑ دینا ممکن ہو تو یہی صورت اختیار کی جانی چاہئے، کیونکہ سود کھاتہ دار کی اپنی رقم نہیں ہے وہ صرف رآس المال لینے کا حق دار ہے، لہذا اس بات کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں کہ بنک اس سود کی رقم کو کس مصرف میں لاتا ہے لیکن اگر سود وصول کرنا ہی پڑا تو پھر اس کا مصرف وہی ہے جو صدقہ کا مصرف ہے یعنی فقراء کی اعانت۔

سرکاری بنکوں اور غیر سرکاری بنکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر سرکاری بینکوں کے سود کو جائز قرار دیا جائے تو سرکاری لاٹری کو بھی جائز قرار دینا پڑے گا۔اس سلسلہ میں یہ دلیل کوئی دلیل نہیں کہ حکومت عوام کی ہے، اس لئے سرکاری بنکیں زر اصل پر جو کچھ زائد رقم دیں وہ سود نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا عطیہ ہے، لیکن اسلام میں مال دینے کا طریقہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اگر مال پاکیزہ طریقہ سے دیا جائے تو وہ جائز بھی ہے اور اس کے اخلاقی

اثرات بھی اچھے ہوتے ہیں، اور اگر وہی مال ناپاک طریقہ سے دیا جائے تو ناجائز بھی ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی برے مرتب ہوتے ہیں، سود کے طور پر دی جانے والی رقم بہر حال جائز نہیں ہوسکتی خواہ باپ بیٹے کو دے، شوہر بیوی کو دے یا حکومت اپنے شہریوں کو دے۔

پرائیویٹ بنکوں کے سود کے بارے میں دارالحرب کا سہارا لینا بھی صحیح نہیں، اوپر دلائل کے ساتھ اس کی تردید کی جاچکی ہے، مزید برآں ان بنکوں کے شیر ہولڈر مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوتے ہیں، اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ سود غیر مسلموں کی جیبوں سے آتا ہے بلکہ دونوں کی جیبوں سے آتا ہے اس لئے معاملہ کی نوعیت مسلم اور ''حربی نی نی کے درمیان نہیں بلکہ مسلم اور مسلم کے درمیان بھی ہے۔

۵- سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

سود کا لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی حرام، اور لینے اور دینے والے دونوں گناہ میں شریک ہیں، اس کے باوجود سود لینے اور دینے میں یہ بنیادی فرق ہے کہ سود لینا بجائے خود (بالذات) حرام ہے لیکن سود دینے کی حرمت سد ذریعہ کے طور پر ہے، قرآن نے سود کا لینا حرام ٹھہرایا جو اصلاً حرام ہے اور حدیث نے سد ذریعہ کے طور پر سود کا دینا بھی حرام ٹھہرایا، اسی بنا پر ربا الفضل کو بھی حرام قرار دیا، اور جو چیز سد ذریعہ کے طور پر حرام ہو وہ بعض صورتوں میں رفع حرج کی غرض سے جائز ہوسکتی ہے۔ علامہ رشید رضا نے اپنے فتاویٰ میں علامہ ابن قیم کی کتاب ''اِعلام الموقعین نی نی کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

''واما ربا الفضل فابيح ماتدعو اليه الحاجة كالعرايا۔۔۔۔ فان ما حرم سدا للذريعة اخف مما حرم تحريم المقاصد''۔

اس کے بعد اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ رشید رضا فرماتے ہیں:

☆ شیخ الجامعہ اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی بہار۔

"یوضحه ان تحریم ربا الفضل انما کان سدا للذریعة کما تقدم بیانه وما حرم سدا للذریعة ابیح للمصلحة الراجحة کما ابیحت العرایا من ربا الفضل" (فتاویٰ الامام محمد رشید رضا، ۲/۵۲۹–۵۳)۔

غیر اسلامی ملک میں پورا نظامِ معیشت سود کی بنیاد پر چلتا ہے، اس لئے سود دینے کی واقعی مجبوریاں ہوسکتیں ہیں اور یہ مجبوریاں جب عام طور سے پیش آرہی ہوں تو مسئلہ افراد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا ہوجاتا ہے، اس لئے ان مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سود دینے کی حد تک واقعی مجبوریوں کا لحاظ کرنا ہوگا۔

۶ – کیا سودی قرضے لینے کی کسی حال میں شرعاً گنجائش ہے؟

سوال نمبر ۵ کے جواب میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں سودی قرضے لینے کی شرعاً گنجائش ہے، اصولی طور پر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ رفع حرج کے لئے سودی قرضے حاصل کرنے کا جواز ہے لیکن یہ افراد کا کام ہے کہ وہ اپنے حالات کا صحیح جائزہ لیں اور اصول کا استعمال وہیں کریں جہاں ناگزیر ہو۔ واقعی مجبوریوں کی ایک مثال تو یہ ہے کہ موجودہ حالات میں بڑے شہروں میں رہائشی مکانوں کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ ایک کمرہ حاصل کرنے کے لئے لاکھوں روپئے پگڑی دینا پڑتی ہے۔ دوسری طرف حکومت کا ہاؤسنگ بورڈ مکانات تعمیر کر کے آسان قسطوں پر جن میں سود شامل ہوتا ہے قرعہ اندازی کے ذریعہ درخواست دہندگان کو مکانات الاٹ کرتا ہے۔ اب جس کے پاس پگڑی دینے کے لئے یا نیا فلیٹ خریدنے کے لئے لاکھوں روپیہ موجود نہیں ہے وہ کیا کرے؟ کیا وہ اپنے بال بچوں کو فٹ پاتھ پر ڈال دے؟ یہ اتنا بڑا حرج ہے کہ اس کو رفع کرنے کے لئے قسطوں پر ملنے والے مکان یا اس کے لئے سودی قرض لینے کو جائز کہے بغیر چارہ کار نہیں۔

اسی طرح بے روزگار کو بنک آٹو رکشا قسطوں میں ادائیگی کی شرط پر دلواتا ہے جس میں سود شامل ہوتا ہے۔ مفلوک الحال لوگ متبادل صورت نہ ہونے کی بنا پر اگر اس اسکیم سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو انہیں اس کی اجازت ہونی چاہئے۔

اسی طرح چھوٹے موٹے کارخانہ داروں کو بھی بعض صورتوں میں بنک سے سودی قرض حاصل کرنے کی واقعی مجبوری ہوسکتی ہے مثلاً یہ کہ اگر وہ بنک سے قرض نہ لیں تو کارخانہ بند کر دینا پڑے اور مزدور بے کار ہو کر رہ جائیں۔

۷ – حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت دئے جانے والے سودی قرضے:

حکومت ترقیاتی اسکیموں کے لئے جو سودی قرضے دیتی ہے اس کا حکم عام سودی قرضوں ہی کی طرح ہے، اس کا لینا واقعی مجبوری یعنی حرج کو دور کرنے کی حد تک جائز ہے۔

۸۔اگر حکومت کسی قرض پر چھوٹ بھی دیتی ہو اور سود بھی عائد کرتی ہو تو ایسے قرض کا حکم:

اگر حکومت کسی قرض پر کوئی چھوٹ (SUBSIDY) بھی دیتی ہو اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہو تو چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہونے کی صورت میں اس قرض کا لینا جائز ہوگا کیونکہ اس صورت میں درحقیقت کوئی سود دینا نہیں پڑتا بشرطیکہ قرض پر عائد ہونے والے سود کے چھوٹ کے مساوی ہونے کی مدت کے اندر اسے لوٹا دیا جائے، اس قسم کے قرضے کم آمدنی والوں کو بمبئی میں بھی حکومت سرکاری بنکوں کے ذریعہ جاری کرتی رہی ہے مگر کچھ عملی دشواریوں کی وجہ سے اس کا خاطر خواہ فائدہ مستحقین کو نہیں پہنچا۔

۹۔غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں جو سود لینا اور دینا پڑتا ہے اس کا شرعی حکم:

غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں اگر سود ادا کرنا پڑتا ہے تو یہ بھی واقعی مجبوری کی تعریف میں آتا ہے۔ضمناً شامل ہونے والی اس غیر شرعی چیز کی بنا پر تجارت کو معطل نہیں قرار دیا جا سکتا، جس طرح پاسپورٹ کے لئے فوٹو کے لازمی ہونے کی بنا پر سفرِ حج اور دوسرے جائز اور ضروری اسفار کو ناجائز نہیں قرار دیا جا سکتا اگرچہ سفر کرنے والا فوٹو کی حرمت کا قائل ہو۔

رہا بیرونی ممالک سے تجارت کی صورت میں سود کا ملنا تو اگر اسے وصول کرنا ہی پڑا ہو تو اس کو ذاتی استعمال میں نہیں لانا چاہئے بلکہ صدقے کے مصرف میں لانا چاہئے یعنی فقراء ومساکین کو دینا چاہئے۔تقرب کی نیت سے نہیں بلکہ حرام مال سے بری الذمہ ہونے کی غرض سے۔

۱۰- پرائیویٹ بنک اور سرکاری بنک کیا دونوں کا حکم قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں یکساں ہے؟

پرائیویٹ بنک جس کے مالک افراد ہوتے ہیں اور سرکاری بنک جو حکومت کی ملکیت ہیں دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ قرض لے کر ان کو سود ادا کر دیا جائے، سود سود ہے خواہ افراد کو ادا کیا جائے یا حکومت کو، اصل میں سودی قرض ایک عقد فاسد ہے اور عقد فاسد کسی فرد کے ساتھ کیا جائے یا حکومت کے ساتھ اس کی حرمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ رہی مجبوری کی صورت تو اس کا ذکر اوپر ہوا۔

۱۱- پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے تجارت کی ترقی کے لئے سود کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرنا:

سرمایہ کاری کی پرائیویٹ کمپنیاں ہوں یا سرکاری بنک، صنعت و تجارت کی محض ترقی کے لئے سود کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرنے کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ اولاً یہ صورت نہ اضطرار کی ہے اور نہ حاجت کی۔ ثانیاً سودی سرمایہ میں خیر و برکت نہیں ہوتی (مجبوری کی صورت میں جو سودی قرضے لینا پڑتے ہیں وہ چونکہ کراہت کے ساتھ لئے جاتے ہیں اس لئے ان کا معاملہ مختلف ہے) ثالثاً سود دینے کی حرمت کا احساس مٹتا چلا جاتا ہے اور رابعاً سرمایہ کاری چھوٹے تاجروں کے بجائے بڑے بڑے تاجروں کی طرف ہوتی ہے۔ دولت سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں کھیلنے لگتی ہے اور وہ پوری معیشت پر چھا جاتے ہیں، بڑھتی ہوئی گرانی کا بھی بہت بڑا سبب سودی سرمایہ ہے۔ جو بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کو محض اپنا کاروبار پھیلانے کے لئے دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

مسئلہ ربوا

مولانا زبیر احمد قاسمی ☆

۱ــ "قال النبی ﷺ الذھب بالذھب و الفضة بالفضة۔۔۔۔۔۔ مثلاً بمثل سواء بسواء یداً بید اخرج مسلم ایضاً و زادہ بعد قولہ "یداً بید" فمن زاد فقد اربی و فی روایة و الفضل ربوا"۔

ان جیسی مشہور روایتوں کی روشنی میں فقہاء کرام ربوا کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"ھو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالیة عن عوض شرط فیہ" ہدایہ ثالث وغیرہ۔

اس کے ساتھ تحقق ربوا کی کچھ شرطوں کا بیان کرتے ہیں، فقہ حنفی کے مطابق ان شرطوں کا لحاظ کرتے ہوئے ربوا کی جامع تعریف یوں کی جاسکتی ہے "متحد الجنس والقدر نی مالِ معصوم کا ہر وہ قدر زائد جو کسی عقد معاوضہ میں مشروط طور پر خالی عن العوض ہو عاقدین میں کسی کا حق تسلیم کرلیا جائے وہ ربوا شرعی اور حرام قطعی ہے، مسلمانوں کے حق میں اس کی حرمت کا دائرہ ہر زمان اور ہر مکان کو محیط ہے، کیونکہ قرآن کی متعدد محکم نص قطعی کے اطلاق وعموم کا تقاضہ یہی ہے۔

۲ــ دارالاسلام کے ساتھ جس دارالکفر کی جنگ ومحاربت اور چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہو یا متوقع ہو ایسے دارالحرب کے حربی کافر چونکہ غدراً قہر بقدر استطاعت ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کے

مال لوٹنے اور لینے میں کوئی باک نہیں رکھتے اور موقعہ ملنے پر مسلمانوں کے جان و مال کو برباد کرتے ہیں یا اس طرح کے خطرات مظنون ہوتے ہیں اس لئے ہمارے خیال میں آیت قرآنی:

"فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ" اور **"ان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به"**۔

پر نظر رکھ کر اگر کوئی مسلمان بلا امن حاصل کئے چوری چھپے کسی طرح دار الحرب چلا جائے اور بشمول ربا وکسی بھی عقد فاسد حتیٰ کہ سرقہ وغصب کے ذریعہ حربی کا مال حاصل کر کے دار الاسلام تک بچا کر لے آئے تو درحقیقت بلا غدر ایک مباح الاصل غیر مضمون اور غیر معصوم مال پر یک گونہ استیلاء ہو جائے گا اور بطریق فئے جائز کہا جا سکتا ہے، اور ہماری سمجھ کے مطابق صرف یہی وہ ایک صورت ہے جس میں بظاہر معاملہ ربوا، عقود فاسدہ یا سرقہ وغصب ہونے کے باوجود درحقیقت مال ماخوذ کے غیر معصوم، غیر متقوم غیر مضمون اور مباح الاصل ہونے کی بنیاد پر اسے شرعاً ربوا وغیرہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس کے علاوہ کسی بھی صورت میں حربی کا مال بشمول ربوا کسی بھی عقد حرام کے ذریعہ لینا جائز نہیں، سلف وخلف جمہور علماء وفقہاء کی یہی رائے ہے اور دلائل کے اعتبار سے اقرب الی الصواب بھی یہی ہے۔ حنفیہ میں سے حضرت امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

"لا یجوز للمسلم فی دار الحرب الا ما یجوز له فی دار الاسلام" (بدائع الصنائع ۷/۱۳۲)۔

صرف اس ایک حدیث: **"لا ربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب"** سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے جسے علامہ ابن ہمام **"هذا الحدیث غریب"** اور امام شافعیؒ **"هذا الحدیث لیس بثابت ولا حجة"** (فتح القدیر ج ۶ ص ۱۷۸) فرماتے ہیں، پھر حرف نفی **"لا"** کے للنہی اور للنفی دونوں ہونے کا احتمال ہے اور **"اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال"** مشہور قاعدہ ہے۔ اسی طرح **"سیغلبون فی بضع سنین"** کی قرآنی پیشین گوئی پر حضرت ابوبکر

صدیقؓ کے شرط لگانے اور قمار کے واقعہ سے یا حضرت عباسؓ کے معاملہ ربوا سے بھی استدلال مجروح ومخدوش ہی ہے، باخبر حضرات ان سے متعلقہ بحثوں، تاویلات وتوجیہات اور اس کے اندر مخفی احتمالات جو ناشی عن دلیل ہیں اس سے ناواقف ہرگز نہ ہوں گے، ان محتمل دلائل کو حدیث وقرآن کے محکم نصوص کے سامنے لانا بہرحال حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے، قرآن نے ''واخذهم الربا وقد نهوا عنه'' میں اہل کتاب کو اپنے ہی دار میں جو دارالاسلام یقیناً نہیں تھا اخذ ربوا کی بنیاد پر مستحق عذاب کہا ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے نصاریٰ نجران کو متنبہ کیا تھا ''من اربی فلیس منا'' اور مجوس ہجر کو دھمکایا تھا ''اما ان تدعوا الربوا او تاذنوا بحرب من الله ورسوله'' کیا ایسی محکم اور شدید وعید کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لئے کبھی اور کہیں بھی حلت ربوا کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

سارے ائمہ کا اتفاق اور امت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی حربی کافر دارالاسلام میں امن حاصل کر کے داخل ہو تو اس کی جان اور مال معصوم ہوجاتا ہے، چنانچہ اگر وہ اپنی رضامندی سے بھی مسلمان کے ساتھ عقد فاسد کرے تب بھی مسلمانوں کے لئے عقد فاسد کے ذریعہ اس کافر کا مال حاصل کرنا جائز نہیں کہ یہ غدر ہے، خلاف امن ہے، لیکن جب ایک مسلمان حربی سے امن حاصل کر کے دارالحرب جاتا ہے تو حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک حربیوں کا مال اصلاً مباح اور غیر مضمون اور غیر معصوم ہی رہتا ہے، اس لئے غدر کے بغیر ہر طرح اس کا مال حاصل کرنا جائز رہے گا، کیا حربی جو مسلمان کو امن دیتا ہے تو وہ اس تصویر ویقین کے ساتھ دیتا ہے کہ اس عقد استیمان کے بعد بھی مسلمان ہمارے مال کو مباح وغیر معصوم سمجھ کر برباد کرے گا اور کرسکتا ہے ہمیں اس سے ہمہ وقت ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہئے، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس یقین واعتماد کے ساتھ مطمئن ہوکر اسے امن دیتا ہے کہ جب تک یہ ہمارے یہاں رہے گا ہماری جان ومال سے ہمارے غفلت کی حالت میں بھی تعرض نہیں کرے گا بلکہ احترام کرے گا، ہمیں کسی طرح کا نقصان پہنچانے کی کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا، جذبۂ عداوت نہیں بلکہ خیر

خواہانہ جذبہ کے ساتھ رہے گا اور وہ مسلمان امن حاصل کر کے حربیوں کے اس اعتماد ویقین کی گویا تصدیق کرتا ہے، اس کے باوجود اگر یہ مسلمان مستامن عقد حرام کے ذریعہ بظاہر حربیوں کی رضا مندی سے اس کے مال کا نقصان کر رہا ہے تو اسے درحقیقت خلاف عہد اور غدر کیوں نہیں کہا جائے گا۔

فقہاء لکھتے ہیں: ''الکفار مخاطبون بالحرمات'' (بدائع ۷/ ۱۳۲) تو اگر حربی کافر اپنی جہالت اور سفاہت سے اس عقد حرام پر راضی ہو جائے تو کیا مسلمان کے لئے کسی کی جہالت وسفاہت سے غلط فائدہ اٹھانا اور نقصان پہنچانا ظلم وغدر نہیں کہا جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی مستامن کے مال وجان کی عصمت اور اس سے تعرض کرنے کی حرمت میں دار کو دخل نہیں، بلکہ عقد امن کو دخل ہے چنانچہ حربی بلا امن حاصل کئے اگر دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس کی جان اور مال غیر معصوم اور مباح ہی رہتا ہے اور عقد امن کے بعد جانی و مالی عصمت طرفین کے لئے حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے حربی مستامن دارالاسلام میں آئے یا مسلم مستامن دارالحرب میں جائے ہر جگہ دونوں کو ایک دوسرے کے جان ومال سے تعرض کرنا جائز نہیں اور غدر کہا جاتا ہے۔

اب بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حربی مستامن جب دارالاسلام میں آتا ہے تو اس کی رضامندی کے باوجود عقد حرام کے ذریعہ اس کے مال حاصل کرنے کو تعرض حرام اور غدر کہہ دیا جاتا ہے، گویا رضا حربی نے اس عقد حرام کو تعرض ممنوع اور غدر ہونے سے نہیں نکالا، لیکن جب مسلم مستامن دارالحرب جاتا ہے اور حربی کی رضامندی سے عقد حرام کے ذریعہ اس کا مال حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ غدر نہیں گویا رضاء حربی دارالحرب میں اس عقد حرام کو تعرض ممنوع اور غدر ہونے سے نکال دیتی ہے، اس فرق کی کوئی معقول وجہ نہیں جبکہ رضاء حربی دونوں جگہ موجود ہے اور عقد امن جس سے عصمت اور تعرض کی حرمت طرفین کے لئے پیدا ہوتی ہے وہ بھی دونوں شکلوں میں پایا جاتا ہے۔

اس لئے میرا خیال یہی ہے کہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسف اور دیگر ائمہ کی رائے ہی کو قبول کر لینا چاہئے اور دارالحرب دارالاسلام کی تفریق کئے بغیر علی الاطلاق ربوا شرعی کو حرام قرار دیا جائے، البتہ دیانت قضا کے حکم مختلفہ کی روشنی میں ہوسکتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے قول کو باب قضا میں داخل کیا جائے اور کہا جائے کہ اگر کوئی مسئلہ مستامن دارالحرب میں جا کر برضاء حربی بشمول ربوا عقود فاسدہ کے ذریعہ مال حاصل کرے گا تو اسے قاضی شریعت فاسق و فاجر مان کو مردود الشہادۃ نہیں کہے گا، اس پر ضمان اتلاف اور مال کی واپسی کا فیصلہ نہیں کرے گا لیکن دیانۃً ازروئے فتویٰ کسی مسلمان کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

۳— یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ''الکفر ملة واحدة''اس لئے پوری دنیا مذہب وملت کے اعتبار سے دو ہی قوم اور دو ہی جماعتوں میں منقسم ہوسکتی ہے، مسلم، کافر، اور فقہاء لکھتے ہیں:

''لان البقعة متنسب الینا اوالیهم باعتبار القوة والغلبة'' (المبسوط للسرخسی ۳۳/۱۰)اس لئے دار کی بنیادی طور پر تو دو ہی قسمیں نکل سکتی ہیں ''دارالاسلام، دارالکفر ثانی جس کو ایک حدیث میں ''ارض عدو ثانی سے تعبیر کیا گیا ہے:

''لاتسافروا بالقرآن الی ارض العدو'' (فتح القدیر ۳۰۰/۵)۔

مبسوط کی مذکورہ عبارت سے دونوں داروں کی یہ تعریف واضح ہو رہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کو قوت وغلبہ حاصل ہو وہ دارالاسلام ورنہ دارالکفر کہا جائے گا، اب اس کے بعد دارالاسلام کے ساتھ صلح وامن کے معاہدہ ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے اس دار کفر کو کبھی دارالحرب تو کبھی دارالامن یا دارالعہد والصلح کہا جاتا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر نزیہ حماد استاد جامعہ ام القری مکہ مکرمہ اپنی تالیف ''احکام التعامل بالربا بین المسلمین وغیرالمسلمین''، میں علامہ ابن قیم کی مشہور تصنیف ''احکام اہل الذمۃ (۴۷۵/۲) کے حوالہ سے دارالکفر کی یہ تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی اگر ہم کلام فقہاء میں دارالحرب کی خصوصیات اور اس کے بنیادی اوصاف کا تتبع کریں گے تو دیکھیں گے کہ جب کسی دار میں دو وصف کا اجتماع ہوتا ہے تب ہی فقہاء اسے دارالحرب کہتے ہیں، ایک احکام کفر وشرک کا شیوع وظہور اور غلبہ وتسلط ہونا دوسرے بحالت موجودہ یا آئندہ دارالاسلام کے ساتھ اس کی جنگ کا متوقع ہونا۔

چند صفحات کے بعد اسی احکام اہل الذمّہ (۲/۴۷۵) کے حوالہ سے علامہ قیم کا قول نقل کرتے ہیں:

''الکفار اما اهل الحرب و اما اهل عهد، و اهل العهد ثلاثة او صاف، اهل ذمة و اهل هدنة و اهل امان، وقد عقد الفقهاء لكل صنف بابا فقالوا باب الهدنة، باب الامان، باب عقد الذمة، ولفظ الذمة والعهد يتناول هولاء كلهم فى الاصل وكذلك لفظ الصلح''۔

اس کے بعد علامہ ابن قیم ذمہ وصلح کے معنی بیان کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں:

''اهل الهدنة فانهم صالحوا المسلمين على ان يكونوا فى دارهم سواء كان الصلح على مال او غير مال لا تجرى عليهم احكام الاسلام كما تجرى على اهل الذمة لكن عليهم الكف عن محاربة المسلمين وهولاء يسمون اهل العهد واهل الصلح واهل الهدنة''۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ کفار یا تو محارب ہوں گے یا معاہد۔ پھر اگر یہ عہد دارالاسلام کی شہریت مستقل قیام اور اداء جزیہ پر ہو تو ذمی ورنہ مستامن کہلائیں گے، لیکن اگر اپنے دارالکفر میں ہوتے ہوئے باہمی امن وآشتی اور ایک دوسرے سے عدم تعرض کا معاہدہ ہو تو اہل ہدنہ، اہل صلح اور اہل امن کہلائیں گے جس پر ذمیوں کی طرح احکامِ اسلام کا اجراء تو نہیں ہوگا مگر ان پر مسلمانوں کے ساتھ محاربہ وتعرض سے باز رہنا لازم رہے گا۔

اس تفصیل کا حاصل یہی نکلا کہ بنیادی طور پر ''دار'' کی دو قسموں میں منحصر ہے، البتہ

دارالکفر کی دومختلف حیثیتوں کے سبب ذیلی طور پر دوقسمیں بن جاتی ہیں، ایک دارالحرب اور دوسری دارالصلح والعہد یا دارالامن کی، اور ظاہر ہے کہ دارالحرب کے حربیوں کی جان یا اس کا مال فی نفسہ مباح غیر مضمون ہوگا، اس سے تعرض کرنا ممنوع نہیں ہوگا، لیکن دارالامن دارالعہد والصلح کے کفار کی جان یا مال سے تعرض کرنا معاہدہ کے بعد مستلزم غدر وخیانت ہونے کے سبب شرعاً ممنوع رہے گا۔ اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ معاہدہ کے نتیجہ میں جان و مال کی عصمت اور تعرض کی حرمت طرفین کے لئے ثابت ہوتی ہے، یہاں یہ بحث تقریباً غیر متعلق ہے کہ کوئی دارالحرب، دارالاسلام، یا کوئی دارالاسلام، دارالحرب کب بن جاتا ہے اور اس کے کیا شرائط ہیں، تاہم کوئی حرج نہیں اگر مختصراً اتنا کہہ دیا جائے کہ حضرات صاحبینؒ کے نزدیک کسی دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے صرف اتنا ضروری اور کافی ہے کہ قہراً فتح کے بعد وہاں مسلمانوں کو ایسا غلبہ وتسلط اور قوت حاصل ہوجائے کہ احکام اسلام جاری ہوجائیں اس کے اجراء میں کفار کی طرف سے کوئی رکاوٹ ممکن نہ ہو، لیکن امام ابوحنیفہؒ تین شرطوں کے ساتھ مشروط کرتے ہیں اجراء احکام شرعیہ، اس دار کے مقیم مسلمانوں کے لئے ثبوت امن اور اس کا دارالاسلام سے اتصال (دیکھئے: فتح القدیر ۵/ ۳۴۲ اور مبسوط ۱۰/ ۱۹)۔

بعینہ اسی طرح کا اختلاف رائے ''کسی دارالاسلام کا دارالحرب بننے کے متعلق ہے۔

صاحبین صرف احکام شرک کے غلبہ وظہور کے بعد دارالاسلام کا دارالحرب بن جانا تسلیم کر لیتے ہیں، مگر امام ابوحنیفہؒ بدلی ہوئی شکل میں انہیں تین شرطوں کے ساتھ مشروط کرتے ہیں کہ دارلاسلام پر جب کفار کو فتح حاصل ہوجائے اور یہ مفتوحہ دار میں کوئی مسلم یا ذمی اپنے ایمان یا امن کے ساتھ مامون نہ ہوں اور احکام کفر وشرک کا غلبہ وظہور ہوجائے تب وہ دارالحرب قرار دیا جائے گا۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اختلاف دراصل کوئی اساسی اور بنیادی نہیں ہے، اتنی بات تینوں حضرات کے درمیان تقریباً متفق علیہ ہے کہ دار کی تبدیلی کا اصل مدار قہر قوت اور

غلبہ وتسلط کی تبدیلی ہے، اب اس کے بعد حضرات صاحبین حکمِ اسلامی، یا حکم کفر وشرک کے اجراء اور ظہور وشیوع کو قوت وشوکت اور غلبہ وتسلط کی تبدیلی کی دلیل تسلیم کر لیتے ہیں، مگر امام ابوحنیفہؒ قہر تام اور محکم و پائدار غلبہ وتسلط پر اسے موقوف رکھتے ہیں، اور چونکہ غلبہ وتسلط کا احکام اور قوت وشوکت میں تمامیت کی شان ان تین شرطوں کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے محض اجراء احکام شرع یا احکامِ کفر سے دار کی تبدیلی کے قائل نہیں (اس کی تفصیل کے لئے علامہ سرخسی کی بحث المبسوط ۱۰؍۱۱۴ میں دیکھئے)۔

لیکن ان بحثوں سے قطع نظر موجودہ ہندوستان کو بہر حال دارالحرب نہیں کہا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ ایک دار کفر ہے، اور جمہوریت دستوری یا قانونی طور پر تمام شہریوں کے لئے مختلف انداز کی ضمانت ومعاہدہ کی بنیاد پر اسے دارالامن، دارالعہد والصلح کہا جائے گا جس کے احکام کی طرف مختصراً اشارہ اوپر گذر چکا ہے۔

۴— جن بنکوں کا نظام سود لینے دینے پر مبنی ہو ان میں بغرض انتفاع رقم جمع کرنا ہی جائز نہیں کہ یہ مال غیر کے اکل باطل اور تعاون فی الاثم والعدوان کو مستلزم ہے ہاں ضیاع مال کے خطرات اور سرقہ وغصب وغیرہ کے متوقع ضرر کو دفع کرنے کی نیت سے ان بنکوں میں روپئے جمع کرنا ضرورتاً جائز کہا جا سکتا ہے، اس کے بعد اس پر ملنے والے سود کو لینا بنیادی طور پر صحیح نہیں، اگر کسی قومی اور دینی مصالح کی بنیاد پر لے لیا جائے تو بلا نیت ثواب غرباء ومساکین پر واجب التصدق ہوگا کہ کسی طرح مال حرام سے ذمہ فارغ ہو جائے۔

۵— سود کا لینا تو حرام لعینہ ہے اور دینا حرام لغیرہ، جس کا ارتکاب بوقت حاجت شرعی جائز ہو جاتا ہے، فقہ کا مشہور جزئیہ "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" اس کی دلیل ہے، باقی رہا حاجت شرعیہ کی شکل میں مجبوریوں کے تحقق کا سوال تو یہ اسلامی غیر اسلامی ہر دو ملکوں میں بھی ہو سکتا ہے اور دونوں کا حکم یکساں ہی ہوگا۔

۶ـــ شریعت اسلامیہ میں حاجت اس صورت حال کو کہا جاتا ہے جس میں قدرتی طور پر اتفاقاً ذہنی وجسمانی اذیت سے سابقہ پڑ جائے یا مال قلیل کے ضیاع کا خطرہ لاحق ہو جائے، ایسی صورت میں حرام لغیرہٖ کے ارتکاب کی شرعاً اجازت مل جاتی ہے اور اسی حرام لغیرہٖ کا ایک فرد سود دینا بھی ہے۔

درمختار میں ضرورت وحاجت، حرج ومشقت وغیرہ اعذار کی تفصیل اور اس کا حکم دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے معاش کی تنگی اور حقوق لازمہ کی ادائیگی پر بظاہر اسباب عدم قدرت کے سبب ذہنی وجسمانی اذیت وتکلیف سے دو چار ہو یا اپنے مال کی حفاظت کے لئے مثلاً مزید کچھ مال کی ضرورت محسوس ہو اور کسی دوسرے بے غبار جائز طریقے سے فی الحال مال حاصل کر کے ضیاع کے خطرہ میں آئے ہوئے مال کی حفاظت کا کوئی راستہ نہ ہو تو ایسی صورت میں یقینا سودی قرض لینا جائز کہا جائے گا۔

۷ـــ بے شک قانونی طور پر ترقیاتی منصوبوں کے لئے قرضوں کی مختص رقم سے استفادہ کا حق عام ہندوستانیوں کی طرح ہر مسلمان کو حاصل ہے، اور ایسی صورت میں بظاہر اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت کی طرح سود دینے کا بھی جواز محسوس ہوتا ہے مگر قابلِ غور یہ نکتہ ہے کہ شریعتِ اسلام مال ودولت کی کثرت اور معاشرتی طور پر مفروضہ ترقیات اور رہن سہن کی اونچی سطح اور اسے بلند سے بلند تر کرنے کی فکر وخواہش کو کس نظر سے دیکھتی ہے اور اس کی کس حد تک حوصلہ افزائی کرتی ہے، اس کے ساتھ حکومت کے خزانے میں طیب وخبیث کے امتیاز کے بغیر کیسے کیسے مال جمع ہوا کرتے ہیں یہ بھی پیش نظر رہے، کیا ایسی صورت میں محض تجارت وصنعت وحرفت کی ترقی کے لئے جو کوئی شرعی حاجت نہیں ایک حرام لغیرہ کے ارتکاب اور سودی قرضہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشہور قول **"دعوا الربا والريبة"** کی روشنی میں اس کا بھی حال عام سودی قرضوں کی طرح ہوگا اور اسے جائز نہیں کہا جا سکتا، ہاں بوقت حاجت دفع حاجت کی حد تک تعمیر مکان کے لئے استقراض بالربح کا استثناء کیا

جاسکتا ہے۔

۸— ہاں یہ شکل جوایک ہی معاملہ قرض سے متعلق ہے جس میں چھوٹ دینے اورسود لینے کا تناسب مساوی ہوتا ہے اور محض صورتاً زمانی طور پر چھوٹ دینے اور سود لینے میں تقدم وتاخر ہوتا ہے لیکن حقیقتاً انجام ونتیجہ کے اعتبار سے مستقرض یا مقرض کسی کے پاس کوئی قدر زائد خالی از عوض ہو کر نہیں رہ پاتا، یقینا جائز ہونا چاہئے کہ ’’الفضل ربوانی‘‘ کا تحقق نہیں ہوا۔

۹— یہاں دوصورتیں ہیں: ایک تجارت کی محض ترقی کے لئے سودی قرض لینے کی، اس کا حکم جواب ے کے ضمن میں معلوم ہو گیا کہ صحیح نہیں، دوسری صورت ہے اپنی ترقی یافتہ تجارت کا کوئی کاروبار درآمد برآمد کی شکل میں غیر ممالک کے ساتھ کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ کاروبار تو ممنوع نہیں ’’فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ‘‘ سے اس کی اجازت مل رہی ہے، اب اگر ان غیر ممالک سے تجارت کے دوران کسی بین الاقوامی تجارتی ضابطہ کے تحت سود دینا پڑے تو اپنے مال کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس کاروبار کے اندر بھی تو ترقی تجارت ہے اور محض ترقی تجارت کے لئے سود دینے کو پہلے ناجائز کہا جا چکا ہے، فقہ کے مشہور قاعدہ ’’کم من شئی یثبت ضمناً لا یثبت قصداً‘‘ سے اس شبہ کا دفع ہوسکتا ہے، بہر حال یہ شق تو ہمارے خیال میں جائز ہونی چاہئے، لیکن دوسری شق جس میں سود ملتا ہے تو وہ سود لینا صحیح نہیں بقدر سود حاصل شدہ رقم کو واجب التصدق کہا جائیگا۔

۱۰— بینک کے مالک افراد واشخاص ہوں یا حکومت، کسی بھی بینک سے بلا حاجت شرعیہ سودی قرض لینا جائز نہیں کہا جاسکتا۔

۱۱— سوال میں درج ذیل تفصیل کے مطابق اپنی صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے بلا حاجت شرعیہ پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے بھی سودی قرض لینا جائز نہیں کہا جاسکتا۔

ہاں اگر وہ سرمایہ کار بذات خود مثلاً ٹرک وغیرہ خریدے اور اصل قیمت پر حساب کے

مطابق ممکنہ سود کی رقم کو اصل قیمت میں ضم کر کے مجموعہ کے بدلے وہ ٹرک کسی خواہش مند کے حوالہ کرے اور پھر کل رقم قسط وار وصول کرے تو یہ صورت ایک جواز ہو سکتی ہے۔

ضمیمہ سوال ۲ کی جوابات:

جناب سید امین الحسن رضوی نے جن چند مثالوں کے ذریعہ یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ ان صورتوں کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جانا چاہئے کہ آیا واقعۃً یہ صورتیں شرعی نقطۂ نظر سے بھی بابِ ربوا میں داخل ہیں یا نہیں؟

۱ — اوران صورتوں کی جو تفصیلات پیش کی ہیں ان کی روشنی میں گو بعض صورتیں جزوی طور پر شرعاً باب ربوا سے خارج قرار دی جا سکتی ہے تاہم ان صورتوں کو کلی انداز سے علی الاطلاق جائز کہنا بھی مشکل ہے، مثلاً:

مثال اول: حصول اراضی کے ملکی قانون کے تحت حکومت کبھی جائیداد غیر منقولہ پر مفاد عام کے تحت قبضہ کرتی ہے تو اس کی قیمت مالک جائیداد کو دینے کی عملاً دو صورتیں ہوتی ہیں۔

پہلی وہ صورت جس میں افسر متعلقہ اپنے طور پر کچھ اصولوں کی روشنی میں جائیداد کی قیمت متعین کرتے ہیں اور مالک کی رضا مندی کی پرواہ کئے بغیر اس متعینہ قیمت کی ادائیگی کر کے جائیدا پر قابض ہو جاتے ہیں، اس کے بعد مالک جائیداس شرح ثمن سے غیر مطمئن ہونے پر عدالت سے رجوع کرتا ہے، اور عموماً دو تین سالوں کے بعد عدالت سابقہ متعینہ ثمن میں مزید اضافہ کا فیصلہ کرتی ہے اور حکومت پر لازم کرتی ہے کہ وہ اس قدر اضافہ شدہ ثمن کی مزید ادائیگی کرے اور ساتھ ہی مقدمہ کے سپرد عدالت ہونے کے بعد سے فیصلہ عدالت تک اور فیصلہ کے بعد اگر اضافہ شدہ رقم کی ادائیگی میں حکومت تاخیر کرے گی تو اضافہ شدہ ثمن کی ادائیگی ہونے تک جتنی مدت گذر چکی ہے یا گذرے گی اس عوض فیصد اتنا سالانہ شرح کے مطابق سود بھی ادا

کرے۔

اب غور طلب بات یہی ہے کہ کیا بنام سود دی جانے والی یہ رقم شرعاً سود کہلا سکتی ہے ؟ تو میرا خیال یہ ہے کہ جب شرعی طور پر اپنی جگہ یہ بات طے شدہ اور متفقہ ہے کہ کسی مقروض یا مدیون سے اجل و میعاد کے عوض نفع اور دین و قرض سے کسی قدر زائد کا حاصل کرنا جسے ''ربا جاہلیہ ن' اور ربا القرآن'' کہا جاتا ہے وہ باجماع امّت سود اور حرام ہے اس میں کبھی کسی کا کوئی اختلاف نہیں، ہم کسی کو قرض دیں یا عقد مبادلہ کریں اور طے شدہ ثمن بذمہ مشتری دین رہ جائے دونوں صورتوں میں اس قرض اور دین سے زائد لینا ہمارے لئے جائز نہیں، سود حرام کہلائے گا۔

اب غور کریں کہ اس مثال کی مذکورہ بالا پہلی صورت میں دو حالتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، ایک فیصلہ عدالت سے پہلے کی دوسری فیصلہ کے بعد کی، اور دونوں کا حکم مختلف ہو سکتا ہے۔

قبل فیصلہ فریق واحد یعنی مالک کے عدم تراضی کے سبب اس کے اور حکومت کے درمیان گویا جائیداد کی بیع تام ہی نہیں ہوئی اور نہ کوئی ثمن برضاء طرفین متعین ہو سکا، نتیجۃً حکومت کے ذمہ جائیداد کی ثمن واجب الاداہی نہ بن سکی، اور حکومت مالک جائیداد کی درحقیقت مدیون بھی نہ ہو سکی، نہ مالک جائیداد بائع ہوا نہ حکومت مشتری، ہاں عدالت جس دن فیصلہ کرتی ہے اور ثمن میں اضافہ کر کے قیمت متعین کرتی ہے اس دن وہ جائیداد مبیع ہوتی ہے، مالک بائع بنتا ہے اور حکومت مشتری، اور آج اس کی قیمت و ثمن حکومت کے ذمہ بطور دین لازم ہوتی ہے، اس طرح مقدمہ سپرد عدالت ہونے سے فیصلہ ہونے کی میعاد تک جو رقم بنام میعاد و اجل کے عوض دینے کا حکم ہوتا ہے اسے شرعاً سود کہنا مشکل ہے کیونکہ فیصلہ سے پہلے کوئی عقد مداینہ نہیں کوئی دائن ہے نہ کوئی مدیون، بلکہ اس پوری رقم کو جائیداد کی مکمل ثمن و قیمت قرار دیا جا سکتا ہے اور مالک کے لئے لینا اس کا جائز ہو سکتا ہے۔

☆ جامعہ دار السلام، عمر آباد، تمل ناڈو

لیکن دوسری حالت فیصلہ کے بعد والی، اس میں ظاہر ہے کہ فیصلہ عدالت کے بعد حکومت مدیون ہو چکی اس کے بعد اضافہ شدہ ثمن کی ادائیگی میں اگر تاخیر ہوئی اور اس مدت تاخیر کے لئے بنام سود رقم دلائی گئی تو وہ رقم ایک مدیون سے بعوض میعاد واجل مقدار دین سے زائد لینا دینا یقینا ہوگا اور شرعی نقطۂ نظر سے بھی اس اضافی رقم کو لازماً سود اور حرام کہنا ہوگا۔

اسی طرح مثال کی دوسری صورت جس میں حکومت کسی جائیداد پر فوری قبضہ کر لیتی ہے اور دو تین سالوں کے بعد اس کی ثمن کا تعین ہوتا ہے، یہاں بھی قبل تعین ثمن بیع و شراء کا تحقق نہیں کوئی دین کسی کا کسی کے ذمہ نہیں۔ اگر مالک جائیداد اس متعین کردہ شرح قیمت کو اپنی جائیداد کی مناسب قیمت تسلیم کرے تو بعد تسلیم بیع ہوگئی، اب جو بھی رقم بنامِ ثمن یا قبل تسلیم گذری مدت کے عوض بنام سود دی جائے گی اسے اصل ثمن قرار دے کر لے سکتا ہے، یہاں سود کا شرعاً تحقق نہیں ہوگا، کیونکہ بنام سود ملنے والی رقم کو کسی مدیون سے بعوض میعاد لینا دینا نہیں کہا جا سکتا، یہاں تسلیم سے پہلے نہ کسی عقد مداینہ کا وجود تھا نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی مدیون، لیکن اگر مالک اس متعینہ ثمن کو تسلیم نہ کر کے عدالت سے رجوع کرے تو پھر جائیداد پر قبضہ کے دن سے فیصلہ عدالت تک کے تمام میعاد کے عوض بنام سود دی جانے والی رقم کو اصل قیمت میں ضم کیا جا سکتا ہے اور اس کا لینا سود کا لینا نہیں کہا جائے گا کیونکہ فیصلہ عدالت کے پہلے نہ دین ہے نہ کوئی مدیون، مالک جائیداد نے افسران متعلقہ کی کچھ مدت کے بعد متعین کردہ ثمن کو جب تسلیم نہیں کیا تو بیع تام نہ ہو سکی اور ثمن حکومت کے ذمہ دین نہ بن سکا ہاں۔ فیصلہ کے بعد حکومت مدیون بن جائے گی اس لئے فیصلہ کے بعد والی مدت کے عوض بنام سود دی جانے والی رقم پھر یقینا ایک مدیون سے زائد از دین بعوض میعاد واجل لینا کہلائے گا جو شرعاً سود اور حرام ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ مثال دو صورتوں میں من وجہ حد جواز میں آسکتی ہے مگر من وجہ باب ربوا میں داخل ہے، یہ صحیح ہے کہ اس مثال میں کسی قرض کا عنصر موجود نہیں، مگر دین کا عنصر پایا جاتا ہے، اور سود شرعاً قرض و دین دونوں میں متحقق ہوا کرتا ہے، بنام سود والی رقم کو حق انتفاع

سے محروم رہنے کا معاوضہ بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ منافع ہمارے یہاں غیر مضمون ہیں جن کے اتلاف پر ہمارے یہاں حرجانہ وتاوان دلانا صحیح نہیں۔

اس لئے ہمارا خیال ہے کہ علی الاطلاق اس صورت کو بھی جائز نہیں کہا جائے، شخصی وانفرادی طور پر اگر کوئی کسی مسلک کے مطابق اتلاف منافع کا سبب ضمان سمجھ کر یہ رقم لے لے تو یہ اس کا ذاتی عمل ہوگا جو ممکن ہے کسی فتویٰ کے مطابق جائز بن جائے۔

مثال دوم: کاشتکاروں کو زرعی ترقیاتی قرضے دئے جاتے ہیں اور اس قرض پر میعاد واجل کے عوض زائد رقم بعنوان سود وصول کی جاتی ہے اس اضافی رقم کو انتظامی مصارف قرار دے کر بابِ ربوا سے خارج کرنا بھی ممکن نہیں، یہ بھی شرعاً سود حرام ہی ہے، صرف نام بدل دینے سے شئی کی حقیقت نہیں بدل جاتی ہر درخواست گذار اور مدیون سے حاصل کردہ اضافی رقم کو ''انتظامی مصارف نی نی اس وقت کہنا ہوگا جبکہ اسکی مقدار متعین ہوتی اور قرض کی مقدار کم ہوتی یا زیادہ پھر بالاقساط ادائیگی قرض کی مدت طویل ہوتی یا قصیر، اس اضافی رقم کی مقدار میں کوئی کمی زیادتی نہ ہوتی، لیکن فی الواقع ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ قرض کی مدت اور مقدار ادائیگی کی کمی بیشی سے یہ اضافی رقم بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہے۔ یہ انتظامی مصارف دراصل سرکاری عملوں کی اجرت عمل ہوا کرتی ہے اسے اصولاً متعین ہونا چاہئے۔ یہ کیا کہ اگر کوئی ایک لاکھ قرض لے کر پانچ سال میں بالاقساط ادا کرے تو اس سے محل اضافی رقم مثلاً ایک ہزار لیا جائے، اور دوسرا پچیس ہزار ہی قرض لے لیکن پندرہ سالوں میں بالاقساط ادا کرے تو اس سے مثلاً دو ہزار لیا جائے، ظاہر ہے کہ ایسا یقینا ہوتا ہے جو مدت و میعاد ہی کا عوض ہو سکتا ہے، اجرت عمل کہنا مشکل ہے یہ بھی نتیجۃً مالی استحصال وعدوان ہے، اس لئے ہمارے خیال میں یہ شکل بھی بعوض میعاد مدیون سے زائد از قرض نفع لینا ہے اور یقینا سود ہے۔

مثال سوم: انڈین آئیل کارپوریشن'' جو حکومت اور حصص کے خریدار پبلک کے مشترک سرمایہ سے کاروبار کرتا ہے، لیکن مضاربت کے اصول کے مطابق منافع کو ربع، ثمن یا

فیصدا تنا، کی شکل میں مشاع نہیں رکھتا، بلکہ ایک متعین شرح سے حصص کی مالیت پر بنام سود نفع دینے کا اقرار و معاہدہ کرتا ہے، اگر چہ اختتام سال پر وہ نفع ونقصان کا میزانیہ بھی شائع کرے تب بھی مسلمان کے لئے اسلامی اصول مضاربت کے تحت سرمایہ کاری کرنے کی محض نیت کرنے سے اس کے حصص کی خریداری اور شرعی مضاربت کے اصول کے خلاف کئے جانے والے کسی کاروبار میں شرکت جائز نہیں ہوسکتی، کیونکہ ختم سال پر کارپوریشن کا جب ''بیلنس شیٹ نی نی اس کے سامنے آئے گا اور مثلاً خسارہ کا علم ہوگا اور بالفرض اس خسارہ کو محیط بالمنافع سمجھ کر اپنے حصہ پر معاہدہ کے تحت ملنے والی بعنوان سود متعینہ رقم سے دست بردار ہو جائے تو اپنی رضامندی سے اس کی یہ دست برداری کسی فعل محظور کو بظاہر مستلزم نہ ہونے کے سبب جائز ہی بن جائے، لیکن اگر منافع ہونے کا علم ہوا مگر اس نے محسوس کیا کہ یہ منافع کم ہے اور ہر حصہ دار کو حسب معاہدہ متعینہ رقم بعنوان سود دینے سے کارپوریشن کا نقصان ہوگا، اس لئے ہم اتنا ہی منافع لیں جتنا باعتبار'' حصہ رسدی نی نی اسے ملنا چاہئے، تو سوال یہ ہوگا کہ جب معاہدہ میں کسی'' حصہ رسدی نی نی کا وجود ہی نہیں تو اب یہ شخص منافع میں اپنے حصہ رسدی کا تعین کس حساب سے کرے گا، حسبِ معاہدہ کارپوریشن کو خسارہ ہو یا منافع، پھر منافع کم ہوں یا زیادہ، بہرحال حصص کے خریدار کو ایک متعینہ رقم ملنا طے ہے، اگر یہ بات ہوئی کہ پورے منافع کا ۵۰۔ ایا کسی کو ۱۰۰/۱ تفاوت حصص کے اعتبار سے ملے گا تب تو حصہ رسدی کا حساب ممکن اور آسان تھا لیکن بحالت موجودہ ہماری سمجھ کے مطابق اس حصہ رسدی کا حساب لگانا اور تخمینہ کرنا عالم تصور کی بات ہوسکتی ہے، حقیقت کی دنیا میں اس کا وجود ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ شریعت اسلامیہ کے ضابطہ کے مطابق مضاربت یعنی مثلاً کارپوریشن اس کا ذمہ دار ہوتا ہے، کہ اگر منافع زیادہ ہوں تو اس میں بھی سارے حصہ دار کو بقدر حصص حصہ ملنا چاہئے، جبکہ عملاً ایسا نہیں ہوتا بلکہ کارپوریشن زیادتی منافع کی صورت میں بھی بس وہی متعینہ

رقم حصہ دار کو دے کر بقیہ تمام ہی منافع پر قابض ہوجاتا ہے جو مالی استحصال ہے ظلم وعدوان ہے، اسلام کے اصول عدل کے خلاف ہے، مسلمانوں کا ایسے کاروبار میں شرکت کرنا تعاون فی الاثم والعدوان کی بنیاد پر ہرگز صحیح کہا جاسکتا ہے، محض حسن نیت سے کوئی امرِ محظور جائز نہیں بن سکتا۔

مثال چہارم: کوئی سرکاری یا پرائیویٹ ملازم ریٹائر ہونے یا کسی بنا پر ملازمت سے سبکدوش کئے جانے کے وقت اپنی سابقہ خدمات اور عمدہ کارگذاریوں کے صلہ میں حکومت کے ضابطہ و قانون یا باہمی معاہدہ کے مطابق کچھ رقم خاص کا مستحق ہوتا ہے، لیکن حکومت یا پرائیویٹ ادارہ اپنی غفلت سے اس حق کی ادائیگی میں دیر یا ٹال مٹول کرتا ہے، صاحبِ حق اپنے حق کی وصولیابی کے لئے عدالت سے رجوع کرتا ہے، اور ایک عرصہ کے بعد عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ اتنی رقم بطور واجب الاداء حق اور اتنی رقم گذرے ہوئے میعاد واجل کے عوض بطور سود ادا کیا جائے اور وہ اب ادا کی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ایسی صورت ہے جس میں وہ ملازم حسب قانون و معاہدہ کچھ رقم کا صرف مستحق ہوتا ہے قبضہ میں آئے بغیر اس کا مالک نہیں بنتا۔ اور شرعاً سود اپنی مملوکہ رقم کے ذریعہ بعوض میعاد واجل نفع حاصل کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں نہ قرض کا عنصر ہے نہ دین کا، اور نہ کسی مملوکہ رقم سے بعوض میعاد انتفاع کا۔

اس لئے اس صورت میں تمام ہی ملنے والی رقم کو خواہ بعنوان واجب الادا حق ہو یا بعنوان سود، اپنا حق سمجھ کر لے سکتا ہے شرعاً سود کا تحقق نہیں ہوگا۔

اور اگر آج کے کرنسی کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت واضح اور متفق علیہ ہوجائے، تمام علماء ان نوٹوں کی قدر و قیمت اور مالیت وقوت خرید کے اعتبار کئے جانے کو تسلیم کرلیں تب تو ایسے حقوق و مطالبات جس کی ادائیگی وقت وجوب کے طویل عرصہ کے بعد ہو رہی ہو اور جس مدت کے دوران ان نوٹوں کی قدر و مالیت اور قوت خرید میں محسوس طور پر تفاوت فاحش ہوجاتا ہے بظاہر صورتی زیادتی کے باوجود درحقیقت مساوی ہونے کی بنیاد پر بلا شبہ جائز کہے جاسکتے

ہیں۔

☆☆☆

سود کا مسئلہ

مولانا خلیل الرحمن عمری، ڈاکٹر عبداللہ جولم عمری

فقہ کی اصطلاح میں ربا کی یوں تعریف کی گئی ہے:

"زیادۃ أحد البدلین المتجانسین من غیر ان یقابل ھذہ الزیادۃ عوض " (الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ۲۴۰)۔

ربا کی دو قسمیں ہیں، ربا الدیون اور ربا البیوع۔

علامہ ابن رشد فرماتے ہیں:

"اتفق العلماء علی ان الربا یوجد فی شیئین فی البیع و فیما تقرر فی الذمۃ من بیع أو سلف أو غیر ذلک" (بدایۃ المجتہد ۷/۱۰۶)۔

"اما ربا الدیون وھو المعروف بربا النسیئۃ فھو الماخوذ لأجل تاخیر قضاء دین مستحق إلیٰ أجل جدید، سواء کان الدیون ثمن مبیع أم قرضا" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۲۷۰)۔

ایسی رقم زمانہ جاہلیت میں "ربا نی" کہلاتی تھی: علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

"والربا الذی کانت العرب تعرفه وتفعله، انما کان قرض الدراھم والدنانیر الیٰ أجل بزیادۃ علیٰ مقدار مااستقرض علی ما یتراضون به" (احکام القرآن ۱/۴۶۵)۔

علامہ رازی فرماتے ہیں:

"أما ربا النسئيه فهو الأمر الذی کان مشهور امتعار فا فی الجاهلية، و ذلک انهم کانو ايدفعون المال علیٰ أن ياخذوا کل شهر قدر امعينا ويکون راس المال باقيا، ثم اذا حل الدين طالبوا المديون براس المال فان تعذر عليه الاداء زادوا فی الحق وفی الأجل" (التفسیر الکبیر ۷/۵۸)۔

ربا کی دوسری قسم ربا البیوع کے تعلق سے ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"و أما ربا البيوع فهو علی نوعين: ربا النسيئة، و ربا الفضل، أما ربا النسيئة فی البيوع فهو بيع ربوی بربوی نسئية، و ربا الفضل هو بيع ربوی بمثله مع زيادة فی أحد المثلين" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۶۷۱، نیل الاوطار ۵/۲۰۳-۲۷۵۴)۔

ربا مطلقاً حرام ہے، علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

"والربا بجميع أنواعه حرام بالا تفاق، سوی ما روی من خلاف عن ابن عباس فی ربا الفضل، وقد نقل عنه انه رجع عن قوله" (نیل الأوطار ۵/ ۲۰۳)۔

ربا کی حرمت پر چند آیات وآحادیث:

"اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِیْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (سورۃ بقرہ:۲۷۵)۔

"يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (سورۃ بقرہ:۲۷۸)۔

"عن جابر قال: لعن رسول الله صلی الله علیہ وآلہ وسلم آکل الربا و مؤکله و کاتبه و شاهديه، وقال: (هم سواء)" (رواہ مسلم)۔

"عن أبی سعيد قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل يدا بيد فمن زاد أو استزاد فقد أربی، الآخذ والمعطی فيه سواء" (رواہ احمد والبخاری)۔

☆ سابق ناظم دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد

”عن عمر بن الخطاب قال :قال رسول اللہ ﷺ :الذھب بالورق ربا إلاھاء وھاء، والبر بالبر رباإلاھاء وھاء ، والشعیر بالشعیر رباإلاھاء وھاء، والتمر بالتمر رباإلاھاء وھاء)“(متفق علیہ)۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے اس سے مراد صرف زمانۂ جاہلیت کا ربا ہے، بلکہ زمانہ جاہلیت کے سودی لین دین کو حرام قرار دینے کے ساتھ ساتھ قرآن ان تمام قسم کے لین دین کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔جنہیں احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔کیونکہ ”العبرة لعموم اللفظ لا بخصوص السبب“(دیکھئے: مجلۃ المجمع الفقہی ر ۱۰۵)۔

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ احادیث کی رو سے ربا کا تحقق اصناف ستہ (ذھب، فضہ، بر، شعیر، تمر، ملح،) کی خرید وفروخت میں اس وقت ہوجاتا ہے جب کوئی صنف کسی ہم صنف کے بدلے زیادتی کے ساتھ بیچی جائے یا ادھار بیچی جائے، یا غیر صنف کے بدلے ادھار بیچی جائے۔

البتہ اصناف ستہ کے علاوہ دوسری صنفوں کے اندر تحقق ربا کی بابت اختلاف ہے۔

۱– ربا صرف اصناف مذکورہ میں محصور ہے(ابن حزم)۔

۲– اصناف مذکورہ کے ساتھ وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو اصناف مذکورہ کی علّت میں شریک ہوں(جمہور علماء)۔

پھر جمہور علماء نے تحدید علّتِ کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔

(نقدین میں علت ربا)۔

۱– نقدین (ذھب و فضہ) میں صرف وزنی علّت ہے(ابو حنیفہ واحمد فی احدی الروایتین)۔

۲– نقدین میں ثمینت علّت ہے (مالک، احدی روایۃ، شافعی)۔

اس ددوسرے قول کی تائید علامہ ابن تیمیہ نے بھی کی ہے:

"والاظهر ان العلة في ذلك هي الثمنية لا الوزن" (مجموع الفتاوى ۲۹/ ۴۷۱)۔

بقیہ اصناف منصوصہ (برّ، شعیر، تمر، ملح) کی علت کے سلسلے میں فقہاء کے مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

۱– ان علة ربا الفضل فيها الاقتيات والادخار، وعلة النساء مجرد الطعم لا على وجه التداوي (اى كونه مطعوما لآدمي) وهو قول المالكية۔

۲– ان العلة فيها كونها مطعومة بدون تفريق بين ربا لفضل وربا النسيئة وهذا قول الشافعي في الجديد ورواية عن احمد۔

۳– ان علة ربا الفضل فيها كونها مكيلة مع اتحاد الجنس وعلة ربا النسيئة كونها مكيلة أو متحدة الجنس، وهو راى ابى حنيفة واحمد في رواية۔

علامہ شیخ ابن باز تحریر فرماتے ہیں:

"لا باس بأخذها لصرفها في المشاريع الخيرية كمساعدة الفقراء والغرباء ونحو ذلك لا ليتملكها أو ينتفع بها بل هي في حكم المال الذي يضر تركه بالمسلمين مع كونه من مكسب غير جائز، فصرفه فيما ينفع المسلمين أولىٰ من تركه للكفار يستعينون به على ما حرم الله" (الفتاوى ۱/ ۱۴۹)۔

۵– سود لینے اور دینے میں فرق یہ ہے کہ سود لینے کی مجبوری کبھی نہیں ہوسکتی، بخلاف سود دینے کے کہ انسان سود دینے پر کبھی مجبور ہوسکتا ہے۔

مولانا عروج احمد قادریؒ لکھتے ہیں:

"انسان سود لینے کے لئے مجبور نہیں ہوتا جبکہ سود دینے والا بسا اوقات سود دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں سود دینے کی رخصت ہے، لیکن سود لینے کی رخصت کسی حال میں بھی نہیں ہے، اگر کوئی مسلمان مجبور ہوجائے تو مجبوری کی حالت میں سودی قرض لے سکتا ہے، لیکن مسلمان کو یہ فیصلہ آخرت کے عذاب کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے کہ وہ سودی قرض لینے کے لئے واقعی مجبور ہے یا نہیں؟ (عشر وزکوۃ اور سود کے چند مسائل/ ۱۲۵)۔

۹ — مجبوری کی حالت میں سود دینا جائز ہے۔مجبوری کا فیصلہ ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے خود کرے گا،مثلاً اہل وعیال کے لئے واجب روزی روٹی، یا ایسے مریض کے علاج کے لئے جس کے بچنے کی امید ہو علاج کے بغیر ممکن نہ ہو یا مرض بڑھ جانے کا خدشہ ہو تو ایسا شخص مجبور ہے،اور وہ سودی قرض لے سکتا ہے۔

۱۰ — سودی لین دین کسی حکومت یا فرد کے لئے جائز نہیں ہے،کیونکہ آیت ربا عام ہے، اس لئے دونوں طرح کے بینک سے سود پر قرض لینا جائز نہ ہوگا۔

۱۱ — مذکورہ بیع ممنوع ہے۔حدیث میں آتا ہے :"**لاتبع مالیس عندک**"۔

علامہ محمد رشید رضا فرماتے ہیں:

"**دار الحرب بلاد غیر المسلین وان لم یحاربوا، وکانت القاعدۃ (ان کل من لم یعاھدنا علی السلم یعد محارباً**" (تفسیر المنار ۶/۴۸۹)۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں:

"دستوری قانون کی رو سے اسلام دنیا کو دو حصّوں پر تقسیم کرتا ہے۔ایک دارالاسلام دوسرے دارالکفر ، دارالاسلام وہ علاقہ ہے، جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو، یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کرسکیں۔اس کے مقابلے میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے الخ۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دارالاسلام کا مقابل دارالکفر بمعنی علاقہ غیر یا FOREIGN TERRITORY ہی ہوسکتا ہے۔حرب یا غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں، جو ممالک اسلامی سلطنت سے صلح رکھتے ہوں وہ بھی دارالکفر ہیں الخ۔

پھر مولانا نے دارالکفر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں،اور آخری قسم (محاربین) کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جن سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو، اصلی حربی یہی ہیں، انہیں کے دار کو تعلقات خارجیہ کے قانون میں دارالحرب کہا جاتا ہے''۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دارالکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے وہ عموماً دارالحرب ہی رہتے تھے، اسلئے بعد کے فقہاء نے دارالکفر کو دارالحرب کا ہم معنی سمجھ لیا نی نی۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان دستوری اعتبار سے نہ دارالاسلام ہے اور نہ دارالحرب، کیوں کہ اس میں تو شریعت اسلامی کی تطبیق ہوتی ہے اور نہ ہی دارالاسلام سے برسر پیکار ہے، اس لئے دارالکفر ہے، دارالکفر کی کئی قسمیں ہیں جن میں ایک قسم کی سکولر حکومت بھی ہے۔

بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے وہ حرام ہے، اسے لے کر اپنے کسی مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

اب اسے بینک میں چھوڑ دیا جائے یا کسی دوسرے مصرف میں صرف کیا جائے تو اس سلسلے میں علماء کے دو اقوال ہیں:

۱- بینک ہی میں چھوڑ دیا جائے۔

۲- اسے لے کر فقراء ومساکین کو دیدیا جائے یا کسی رفاہ عام میں خرچ کیا جائے

(دیکھئے علامہ قرضاوی کی فتاوی معاصرہ ۲/۵۲۷)۔

''**ان العلة فيها هي الطعمية مع الكيل او الوزن، اى كونها مطعومة موزونة أو مكيلة وهو قول الشافعي في القديم وأحمد في رواية**'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: الفقہ الإسلامی وادلتہ ۴/۶۶۸، مجلۃ البحوث الإسلامیہ عدد ۱۰/۸۶ عام ۱۴۰۴ھ، وعدد ۱۸ عام ۱۴۰۷ھ)۔

سود دارالحرب میں بھی حرام ہے کیونکہ آیت ربا (**احل الله البيع وحرم الربوا**) اور دوسری آیات واحادیث جو حرمتِ سود پر دال ہیں ان میں زمان ومکان کی قید کے بغیر عموم پایا جاتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"ویحرم الربا فی دارالحرب کتحریمه فی دارالاسلام، وبه قال مالک والاوزاعی وأبو یوسف والشافعی وإسحاق، وقال أبو حنیفة لا یجری الربا بین مسلم وحربی فی دارالحرب"

وعنه (أبی حنیفة) فی مسلمین أسلما فی دارالحرب لا ربا بینهما لما روی مکحول عن النبی ﷺ أنه قال: لا ربا بین المسلمین واهل الحرب فی دارالحرب، ولان أموالهم مباحة، وانما حظرها الامان فی دارالاسلام فما لم یکن کذلک کان مباحا، لنا قول الله (وحرم الربوا) عام، ولأن ما کان محرما فی دارالاسلام کان محرما فی دارالحرب وخبرهم مرسل لا نعرف صحته" (المغنی ۴/۴۵۰)۔

علامہ سید عروج احمد قادری فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک ربا و قمار ہر ملک میں حرام قطعی ہے، وہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام یا کچھ اور، اس مسئلہ میں طرفین کا مسلک نہ صرف نصوص شرعیہ کے خلاف ہے بلکہ خود اصول فقہ حنفی کے مسلمات کے خلاف بھی ہے، اور یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس مسلک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ یا کوئی فتویٰ میرے لئے قابل تسلیم ہو"۔

مزید لکھتے ہیں:

جہاں اجتہادی مسائل واحکام کا تعلق ہے، امام اعظم اور امام محمد بن حسن رحمہا اللہ کا درجہ تو بہت بلند ہے ہم تو علامہ شامی جیسے متاخرین فقہاء کے مجرد اقوال پر بھی عمل کر لیتے ہیں لیکن جہاں نصوص قطعیہ کا معاملہ ہو وہاں بڑے سے بڑے امام کا بھی مجرد قول ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے، یہ کہنا کہ ان کے پاس یقینا کوئی دلیل ہوگی، عقیدت کا غلو یا ائمہ کو معصوم عن الخطاء قرار دینے کے مترادف ہے"۔

دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف میں ڈاکٹر زحیلی لکھتے ہیں:

☆ سابق مفتی، مدنی دارالافتاء، بجنور۔

"دارالحرب :هی البلاد التی لیس للمسلمین علیها ولایة وسلطان, ولا تقام فیها أکثر شعائر الاسلام والحربی من بیننا وبین بلاده عداوة و حرب" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸/۳۹)۔

بنک انٹرسٹ

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

۱— ''ربا نی مالی لین دین میں ایک طرف سے ایسے مشروط اضافہ کا نام ہے کہ دوسرے فریق کی جانب سے اس کا کوئی عوض نہ ہو، ہدایہ میں ہے:

''**هو الفضل المستحق لا حد المتعاقدين فى المعاوضة الخالى عن عوض شرط فيه**''(ہدایہ ۳/۷۸)۔

۲— امام ابوحنیفہ کے نزدیک دارالحرب میں سود لینا درست ہے، اکثر فقہاء اور امام ابویوسف کے نزدیک جائز نہیں، قرآن مجید کے عموم اور احادیث کے عموم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس لئے علماء ہند میں حضرت مولانا تھانویؒ نے حرمت کو ہی ترجیح دیا ہے فرماتے ہیں:

آیت تحریم ربا میں ارشاد ہے:

''**يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰو اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ**'' اور ظاہر ہے کہ اس بقیہ ربوا کا معاملہ جس وقت ہوا ہے لینے والے، دینے والے سب حربی تھے تو تحریم کے بعد اگر حربی سے ایسا معاملہ جائز ہوتا اور وہ رقم حلال ہوتی تو اس کا ترک کرنا کیوں فرض ہوتا، یہ نص قطعی ہے ثبوتہً بھی، دلالتہً بھی، اور طرفین کی دلیل آ خبر واحد ہے یا قیاس جو کہ ظنی ہیں اور قطعی کی تقدیم کا وجوب ظنی پر اجماعی ہے، یہ تو اس دلیل میں ثبوتاً کلام ہے اور دلالۃ یہ احتمال ہے

کہ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں : ''لا ربوا بین المسلم والحربی'' اس میں احتمال ہے کہ یہ نفی نہی کے لئے ہو، جیسا قرآن مجید میں: ''لا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج'' میں بعینہ یہی معنی ہیں، چونکہ حربی کے مال کے غیر معصوم ہونے سے شبہ اس کے جواز کا ہوسکتا تھا، حضور نے اس جواز کی نفی فرمادی ہو چنانچہ کتب فقہیہ میں اس قسم کی عبارت اس معنی میں وارد ہے:

'' ففی الدر المختار عقیب الروایا ت المذکورة :فلو هاجر إلینا ثم عاد إلیهم فلا ربوٰ ا اتفاقاً جوهره، فی رد المحتار أی لا یجوز الربوا معه فهو نفی بمعنی النهی کما فی قوله فلا رفث ولا فسوق فافهم'' جب ابو یوسفؒ کے اس قول کا قوی ہونا ثابت ہو گیا تو اس پر عمل ہوگا (امداد الفتاوی ج ۳/ ۵۷-۱۵۸)۔

۳— دار الحرب کے لئے فقہاء نے تین شرطیں رکھی ہیں: اول یہ کہ احکام شرک وہاں مکمل طور پر نافذ ہو جائیں، دوسرے اس سے متصل کوئی مسلمان ملک موجود نہ ہو، تیسرے مسلمان کو اس حکومت کافرہ کے قیام کے بعد امان اور موجودہ اصطلاح میں شہریت حاصل کرنی پڑے (شامی ۳/ ۲۵۳)۔

دار الاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوا کریں، موجودہ زمانہ میں اکثر جمہوری ممالک وہ ہیں کہ ان اصطلاحات کے لحاظ سے نہ دار الاسلام ہیں، نہ دار الحرب، اس لئے بعد کے علماء نے ''دار'' کی تقسیم میں توسع سے کام لیا ہے، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''پھر دار الکفر کی بنیادی واصولی طور پر چار قسمیں ہیں:

۱— دار الحرب یا دار المحاربہ، ۲— دار المعاہدہ والمسالمہ، ۳— دار الامن، ۴— دار الشر والفساد، اس لئے کہ دار الاسلام کا محاربہ دار الکفر سے ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو اس کا نام دار الحرب یا دار المحاربہ ہوگا، اور اگر محاربہ نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں، آپس میں ان دونوں داروں اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ ومسالمہ ہوگا یا نہیں، اگر معاہدہ یا مسالمہ ہوگا تو اس کو

دارالمعاہدہ یا دارالمسالمہ کہیں گے، اور اگر معاہدہ ومسالمہ نہ ہوگا تو پھر تو دو حال سے خالی نہیں، اس ملک کے مسلم باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ رہتے ہوں گے، یا مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں گے اگر مامون ومحفوظ رہتے ہوں جیسے سرکار دوعالم ﷺ کے زمانہ میں ملک حبش تو اس ملک کو دارالامن کہا جائے گا، اور اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دارالشرو الفساد کہا جائے گا جیسے فتح مکہ سے پہلے مکہ مکرمہ (نظام الفتاوی، ۲/۱۲، ۱۱–۲۱۰)۔

پس ہندوستان ''دارالحرب'' نہیں بلکہ ''دارالامن'' ہے اور بحیثیت دارالحرب یہاں سود لینا جائز نہیں۔

۴— فقہاء کے اس اصول کے تحت کہ جہاں دو نامناسب صورتوں میں ایک کا انتخاب کرنا پڑے وہاں نسبتاً کمتر کو قبول کیا جائے گا اور ''اھون البلیتین'' کو اختیار کیا جائے گا۔

بنک میں جمع شدہ رقوم کا انٹرسٹ نکال لیا جائے، تاکہ مخالف اسلام مقاصد میں اس کا استعمال نہ ہو سکے، عالمگیری میں ہے:

''وعلیه دیون و مظالم جهل اربابها وأئیس من علیه من معرفتهم فعلیه التصدق بقدرها من ماله'' (۵/۳۸۵)۔

۵— سود لینا بہر حال حرام ہے، سود دینا ضرورتاً جائز ہے، علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں:

''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' اور بے شک غیر اسلامی ممالک میں بعض دفعہ ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں کہ سودی قرض کا حصول اسکے لئے ضروری ہو جائے۔

۶— سودی قرض لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس پر مجبور ہو یا اس طرح کی کوئی اور مجبوری در پیش ہو، جس کو فقہاء ''ضرورت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح اگر ایسی صورت حال سے دو

☆استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند۔

چار ہو کہ سودی قرض نہ لینے کی صورت میں وہ شدید مشقت میں مبتلا ہوجائے جس کو حاجت کہا جاتا ہے، تب بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، یہ مجبوری معاشی بھی ہوسکتی ہے اور قانونی بھی، اس لئے انکم ٹیکس کے بعض قوانین کے تحت بھی سودی قرض کا حصول مجبوری بن جاتا ہے۔

۷— فقہاء نے جس طرح اپنے حق جائز کے حصول کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی ہے، اسی طرح ایسے ترقیاتی قرضوں کے حصول کا معاملہ دوسرے سودی قرضوں کے حصول کے مقابلہ خفیف ہے، مگر معمولی اسباب ووجوہ کے تحت اس کی اجازت دینا صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ حکومت پر قرض دینے کا حق اس درجہ کا نہیں، جس درجہ کا حق مقدمہ کے ایک فریق کا اپنی مملوکہ شئی پر ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے۔

۸— چونکہ سود "فضل خالی عن العوض" نی ہی کا نام ہے، یہاں بحیثیت مجموعی قرض خواہ کو ایسا فضل ادا نہیں کرنا پڑتا، اس لئے یہ صورت جائز ہوگی۔

۹— اس صورت میں بھی وہی حکم جاری ہوگا جو ۶ میں لکھا جاچکا ہے، بربنائے حاجت سود ادا کرنا درست ہوگا، جو سود ملتا ہے اگر وہ اس کو وصول نہ کرے اور وہ رقم غیر ملکی تاجر کے پاس رہے تو سود نہ لے، اگر اس کو وصول کرنے پر مجبور ہو تو اس کو صدقہ کردے۔

۱۰— سود چاہے افراد سے لیا جائے یا افراد کے ایک مجموعہ سے، بہر حال سود ہے، اس لئے دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں۔

۱۱— مذکورہ صورت بھی بہر حال سودی قرض کی ہے اور سودی قرض کا حصول حاجت وضرورت ہی کے تحت درست ہے، لہذا یہ صورت جو حاجت واضطرار سے خالی ہے جائز نہیں۔

جوابات ضمیمہ سوال: ۲

۱— فیصلہ تک عدالت سود کے ساتھ جو مجموعی رقم دلواتی ہے وہ سود نہیں ہے بلکہ زمین کی اصل قیمت متصور ہوگی، کیونکہ اب تک مالک زمین کسی قیمت پر راضی نہیں ہوا تھا کہ وہ قیمت

حکومت کے ذمہ ''دین'' ہو اور یہ اضافہ اس دین پر سود قرار پائے۔

۲— یہ زائد رقم چونکہ قرض کی مقدار اور اس کی مدت ادئیگی کے تناسب سے ہی لی جاتی ہے، اس لئے سود میں داخل ہے۔

۳— تجارت و سرمایہ کاری میں ''نفع'' کی تعیین ہی وہ چیز ہے جو کسی معاملہ کو ''مضاربت'' کی حد سے نکال کر ''ربا'' میں داخل کر دیتا ہے، اس لئے مذکورہ صورت بھی سود میں داخل ہے۔

۴— شرعاً تعزیر بالمال جائز نہیں ہے، اس لئے سود والی رقم واجب التصدق ہے، حکومت کو جس وقت یہ رقم ادا کرنی چاہئے تھی اور اب جس وقت وہ اس رقم کو ادا کر رہی ہے۔ روپے کی قدر کے کم ہو جانے کی وجہ سے جو ''اضافہ'' اسے ملنا چاہئے سود کے نام سے ادا کی جانے والی رقم کا اتنا حصّہ اس کے لئے جائز ہوگا۔

☆☆☆

سود کی شرعی حیثیت

مفتی عزیز الرحمن بجنوریؒ ☆

اردو زبان میں جس چیز کو سود کہا جاتا ہے، عربی میں اس کو ربا کہتے ہیں، جس کے معنی بڑھوتری اور زیادتی کے آتے ہیں۔ یہ لغوی معنی ہیں، ربوۃ ٹیلے کو کہا جاتا ہے جو آس پاس کی زمین سے ابھرا ہوا ہو، شرعی اعتبار سے بھی یہی معنی مفہوم ہوتے ہیں۔

۱—وفی الشرع عبارۃ عن فضل مال لایقابلہ عوض فی معاوضۃ۔ (روح)

۲—ھو فضل مال خال عن العوض فی معاوضۃ مال بمال۔ (مدارک)

لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے سود کے بارے میں جو اسرار بیان فرمائے ہیں اس سے سود یا ربا کی نہایت جامع تعریف حاصل ہوتی ہے۔

سود ایسا منافع جو بلا استحقاق بلا معاوضہ بلا تراضی خاص صرف مہلت کے مقابلہ میں حاصل ہو (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۰۳)۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آخری آیات میں ارشاد فرمایا ہے:

۱— جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں ایسا کھڑا ہوں گے جیسے آسیب زدہ ہوتا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ وہ دنیا میں کہا کرتے تھے کہ سود بھی ایک بیع ہے۔ حالانکہ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے (صرف کہنے پر یہ وعید ہے)، پس جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی یہ نصیحت آئی اس کے لئے ما سلف ہی ہے (یعنی جو کچھ ہو چکا وہ

معاف ہے)۔اوراس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے اورجس نے پھر دوبارہ یہ حرکت کی (سودخوری کی) وہی لوگ دوزخی ہیں اوروہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

۲ – اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کفار اثیم کو دوست نہیں رکھتا ۔

۳ – ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور مابقی سود کو چھوڑ دو اگر مومن ہو، اگر تم ایسا نہ کر سکے تو اللہ اور اس اسکے رسول کا تمہارے لئے اعلان جنگ ہے، اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لئے بقدر راس المال ہی ہے تم نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

۴ – ایک دوسری سورہ میں ارشاد فرمایا:

ایمان والو! بڑھتا چڑھتا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

سود کی حرمت:

مندرجہ بالا آیات سے سود کی حرمت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے اور بقول قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی یہ نص غیر مجمل ہے، اشکال صرف بعض صورتوں میں ہوسکتا ہے ورنہ قطعیت میں کوئی شک نہیں ہے، یہ اسلامی تہذیب اور معاشرت کا شعار ہے جسمیں ترمیم یا تبدیل ناممکن ہے، شعائر کی حیثیت اسلام میں فرض سے زیادہ اہم ہے۔

تاریخ حرمت ربوا (۹ھ) کو مفسرین اور علماء کے بیان کے مطابق اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تب بھی ۹ھ کے قبل کے حالات ایسے ملتے ہیں جن سے حرمت ربا اس سے قبل ثابت ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیات جن کا نزول ۲ھ کے قریب کا ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد جس کو فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

”قال اشتریت یوم خیبر قلادۃ باثنی عشر دیناراً فقال لا تباع حتی تفصل“

(مسلم، مشکوۃ شریف)۔

غزوہ خیبر ۷ھ میں ہوا ہے اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ۲ھ میں بھی حرمت ربوا

ثابت ہے۔

غیر اسلامی ملکوں میں سود کی حرمت:

مشکوۃ شریف باب الربا میں ایک دوسری حدیث شریف میں موجود ہے جس کو امام احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

''شب معراج میں، میں ایک ایسی قوم کے پاس آیا کہ ان کے پیٹ مثل گھر کے پھولے ہوئے تھے اور ان میں سانپ تھے جو باہر سے دیکھے جا سکتے تھے میں نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ لوگ کون ہیں فرمایا یہ سود خور ہیں نی نی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہجرت سے پہلے معراج کے موقعہ پر یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ اس وقت بھی سود کو برا جانا جاتا تھا۔

اور جنگ ایران اور روم کے موقع پر ۷ھ میں مکہ معظّمہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے امیہ بن خلف کے ساتھ جو شرط کی تھی وہ شرط ۲ھ میں غزوہ بدر کے موقع پر پوری کرائی گئی، اور اس وقت اہل روم کو اہل ایران پر فتح ہوئی تھی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سو ۱۰۰ اونٹ حاصل کئے اور جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کو صدقہ کرا دیا تھا، اس کی طرف قرآن شریف میں اشارہ مذکور ہے۔

''ویومئذ یفرح المؤمنون'' اس دن مومنین خوش ہوں گے۔

اور اس میں غزوہ بدر کی طرف اشارہ ہے، اور یہ واقعہ ۲ھ کا ہے، فتاوی عالمگیری میں مذکور ہے کہ حربی کافر سے اس کی رضا مندی سے جو مال حرام حاصل ہو اس کو صدقہ کر دینا چاہیے۔

۱ـــ لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب (ردالمحتار) دار الحرب میں مسلمان اور کافر کے درمیان ربوا نہیں ہے۔

۲ـــ ''لأن الربوا لا یجری بین المسلم والحربی فی دار الحرب'' (مکتوبات شیخ

الاسلام) اس لئے کہ دارالحرب میں مسلم اور کافر کے درمیان ربوانہیں ہے۔

یہ امام ابو یوسفؒ کا مسلک ہے جو نصوص کے زیادہ قریب ہے، اس لئے کہ لاربا میں لانفی جنس کے لئے ہے اور سود کی تعریف میں تراضی کی قید سے اس پر ربا کا اطلاق نہیں ہو،تا لیکن معاملہ مسلمان اور کافر کے درمیان تک محدود ہے خواہ بینک ہی کیوں نہ ہو، البتہ اس مال کو حاصل کر کے صدقہ کرنے کا جو حکم ہے وہ بطور مشورہ ہے تاکہ مسلمانوں میں سود کی حرمت برقرار رہے اور اس کی قباحت دور نہ ہوجائے۔

میری رائے میں ان سودی رقومات سے مختلف ٹیکسوں کی ادائیگی، رشوت دینا وغیرہ غیر اسلامی معاملات کو پورا کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ مال طیب کو بچالینا اور مال حرام کو جائے حرام پر خرچ کردینا زیادہ مناسب ہے۔

ان تصریحات کے بعد سود دینے کا معاملہ زیر بحث آتا ہے، قومی مضرت، اقتصادی پسماندگی اور عموم بلویٰ کی وجہ سے سرکاری طور پر حاصل شدہ قرضوں، بینکوں سے لئے ہوئے قرضے، انشورڈ کمپنیوں اور فائینس کمپنیوں کے ذریعے قرضے، انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کی بھرمار، کارخانے والوں پر ملازمین کے لئے فنڈ وغیرہ ایسے قیودات ہیں کہ اگر صحیح طور پر چلا جائے تو دیوالیہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں، اس لئے کسان وکاس پتر اندرراوکاس پتر اور دوسرے متفرق قسم کے بونڈ سے رقومات کو حاصل کرنا چاہئے اور اپنی قوم کے فلاحی کاموں پر بھی خرچ کردینا چاہئے۔

☆☆☆

ربوا کی حقیقت

مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری ☆

ربوا: عقد معاوضہ میں کسی فریق کو حاصل ہونے والی زیادتی ہے جس کے مقابل کوئی چیز نہ ہو، فضل مال بلا عوض، فی معاوضہ مالٍ بمالٍ (کنز الدقائق) اور ربوا کا دائرہ مقادیر (مکیلی اور موزونی چیزیں) ہیں، مجانست کی شرط کے ساتھ۔

"الربا محرم فی کل مکیل أو موزون إذا بیع بجنسه متفاضلاً فالعلة عندنا: الکیل مع الجنس، او الوزن مع الجنس، قال ﷺ: ویقال: القدر مع الجنس وھو أشمل" (ھدایہ باب الربوا)۔

اور تحقیق ربا کے لئے چار شرطیں ہیں ۱- عوضین کا معصوم ہونا یعنی ایسا محترم مال ہونا جس کا جبراً لینا درست نہ ہو، ۲- عوضین کا مالِ متقوم ہونا، یعنی ایسا مال ہونا جس کا اتلاف موجب ضمان ہو، ۳- دونوں عوضوں کا ایک شخص کی ملکیت نہ ہونا کما بین العبد وسیدہ۔

۴- صورت مسئولہ (۱) میں عدالت جو قیمت متعین کرتی ہے اور اس پر ۶ فیصد سالانہ کی شرح سے سود کا حکم دیتی ہے اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، بلکہ حکومت کا یہ نام نہاد سود جزو ثمن ہے، اگر اس قسم کا ہرجانہ اسلامی حکومت دے تو بھی درست ہے۔

۲- اور صورتِ مسئولہ (۲) پر سود کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے وہ درست نہیں ہے، صرف نام بدلنے سے کام نہیں چلتا، شراب کا نام شربت رکھ لیا جائے تو اس سے

شراب حلال نہیں ہوجائے گی، البتہ اگر شراب سرکہ بن جائے تو حلال ہوجائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں صرف نام ہی نہیں بدلتا بلکہ اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے اور حقیقت بدلنے کی صورت یہ ہے کہ واقعی مصارف لئے جائیں، یعنی مصارف کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور سال کے آخر میں اس کو مستقرضین پر حصّہ رسد پھیلایا جائے تو اس کا لینا درست ہوسکتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ مدیون، دائن سے کہتا ہے کہ آپ اپنا قرضہ میرے گھر آ کر لیجائیں آمد و رفت کے مصارف میں ادا کروں گا تو یہ مصارف لینا درست ہے، الغرض محض ''سروس چارج نئی نام رکھ لینے سے جواز پیدا نہیں ہوسکتا۔

۳— اور صورت مسئولہ ۳ بھی درست نہیں ہے، کیونکہ عقد دو فریق مل کر طے کرتے ہیں، صرف مضارب کی نیت کافی نہیں ہے اور i.o.c چونکہ نفع متعین کر دیتی ہے، اس لئے یہ مضاربت فاسدہ ہے۔

۴— اور صورت مسئولہ ۴ درست ہے۔ اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، کیونکہ اس صورت میں کوئی عقد معاوضہ نہیں ہے، اس کی مثال پروویڈنٹ فنڈ پر مستزاد ملنے والی رقم ہے، جس کو حکومت سود کہتی ہے۔ مگر فقہاء کرام اس کو ابتدائی تبرع قرار دیتے ہیں اور اس کو جائز کہتے ہیں۔

دارالاسلام اور دارالحرب:

دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جو مسلمانوں کے زیر نگیں ہو، اور دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جہاں اقتدار اعلیٰ مسلموں کے پاس ہو۔

''المراد بدار الاسلام: بلاد یجری فیھا حکم امام المسلین، ویکون تحت قھرہ، وبدار الحرب: بلاد یجری فیھا أمر عظیمھا، ویکون تحت قھرہ'' (کافی بحوالہ فتاوی

☆مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، مبارکپور، اعظم گڑھ

عزیزیہ ۱/۱۶)۔

اور دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے صرف اقتدار کی منتقلی کافی ہے:

"دار الحرب تصير دار الإسلام باجراء أحكام أهل الاسلام فيها، كجمعة وعيد، وان بقى فيها كافر اصلى، وان لم تتصل بدار الاسلام" (درمختار کتاب الجہاد، فصل فی استئمان الکافر)۔

اور دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے صاحبین رحمہا اللہ کے نزدیک تو اقتدار کی منتقلی کافی ہے، مگر امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک تین شرطیں ہیں ا:- علی الاعلان احکام کفر کا جاری ہونا، ۲- اگر محدود خطہ ہو تو اس کا دارالحرب سے متصل ہونا، ۳- حاکم اسلام کے دیئے ہوئے امان کا بالکلیہ ختم ہوجانا۔

"لا تصير دار الاسلام دار حرب إلا بأمور ثلاثة: بإجراء أحكام الشرك، وباتصالها بدار الحرب وبأن لا يبقى فيها مسلم أو ذمى أمنا بالأمان الاول على نفسه" (درمختار)۔

اور اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے اور غیر مسلموں کے احکام ایک ساتھ نافذ ہوں تو وہ دارالحرب نہیں ہے:

" لو أجريت أحكام المسلمين و أحكام أهل الشرك ،لا تكون دار الحرب" (شامی)۔

اور دونوں کے احکام جاری ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی خاص علاقہ میں مسلمانوں کے احکام جاری ہوں اور دوسرے علاقہ میں غیر مسلموں کے احکام نافذ ہوں بلکہ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی احکام جاری ہوں اور غیر مسلموں میں شرک کے احکام نافذ ہوں تو ایسا ملک دارالحرب نہیں ہے، پھر کیا وہ دارالاسلام ہے؟ اس کی اگرچہ صراحت نہیں ہے مگر الاسلام یعلو کا تقاضا یہی ہے کہ وہ دارالاسلام کہلائے گا۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان جس نے اپنی حیثیت عرفی تو کھودی

ہے مگر یہاں عظیم المشرکین کا تنہا حکم جاری نہیں ہے، کیونکہ ملک کا دستور سیکولر ہے، حکومت کا نظام پارلیمانی ہے، ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے اور ہر قوم کا پرسنل لا محفوظ ہے، پس ایسے ملک کو دارالحرب کہا جائے یا دارالاسلام، کیونکہ فقہاء کے نزدیک دار کی تیسری کوئی قسم نہیں ہے؟ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں مجھے اس کے دارالحرب ہونے میں شک ہے، جو حضرات اس کو دارالحرب قرار دیتے ہیں ان کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ پارلیمانی نظام میں فیصلہ اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور چونکہ اس وقت ہندوستان میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، اس لئے اقتدار اعلیٰ انہی کا مانا جائے گا، مگر یہ خیال قرین صواب نہیں ہے، کیونکہ توافق آراء مذہب کی بنیاد پر نہیں ہوتا، مشاہدہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں، اس لئے یہ ایسی بنیاد نہیں ہے کہ بے جھجک ہندوستان کو دارالحرب کہہ دیا جائے۔

دوسری دلیل ان حضرات کی فسادات کا مسئلہ ہے، مگر اس کا سبب حکومت کی کمزوری ہے، مسلم مما لک کی صورت حال ہندوستان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ امام اعظم دارالحرب کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ۔ فیصلۃ الأعلام فی دارالحرب والاسلام میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''امام ابوحنیفہؒ نے نظر دقیق سے بطور استحسان کے یہ بتایا ہے کہ جب تک غلبۂ اسلام کے آثار میں سے کوئی چیز پائی جاتی ہو، یا استیلاء کفار میں ایسا ضعف محسوس ہو کہ مسلمانوں پر اس کا زائل کر دینا مشکل نہ ہو، اس وقت تک اس ملک پر دارالکفر ہونے کا حکم نہیں کرنا چاہئے، اسی بناء پر امام اعظمؒ نے اس ملک کے دارالحرب ہونے کے لئے دو شرطیں زائد فرمادیں'' (ترجمہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ)۔

پھر دارالحرب قرار دینے کا مقصد جہاد یا ہجرت ہوتی تو ایک بات بھی تھی، فی زمانہ تو

اس بحث کا مقصد صرف سود کو جائز قرار دینا ہے، جبکہ سود کی شناعت زیادہ سے زیادہ احتیاط کی متقاضی ہے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ رسائل قاسم العلوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

کار ایماں آں بود کہ دربار ہجرت ہندوستان دارالحرب قرار می دادند ، و دربارۂ سود گرفتن و نا گرفتن، و دادن و نادادن ایں دیار را دارالاسلام می فہمیدند، نہ ایں کہ دربارہ ہجرت دارالاسلام، و وقت سود گرفتن دارالحرب" (مکتوب ۷)۔

علاوہ ازیں دارالحرب کے معاملہ میں جو روایت آئی ہے اولاً تو وہ متکلم فیہ ہے، ثانیاً: فقہاء کرام نے اس کو مسلم مستامن کے ساتھ مقید کیا ہے، یعنی سود لینے والا وہ مسلمان ہو جو دارالاسلام سے ویزا لیکر دارالحرب میں آیا ہو، نیز یہ قید بھی لگائی ہے کہ اس نے سود لیا ہو، دیا نہ ہو اور حضرت نانوتوی قدس سرہ نے تو احتراز بدارالاسلام کو بھی شرط قرار دیا ہے۔

۱- فقہاء کرام نے اس شخص کو جو دارالحرب میں مسلمان ہوا ہو، اور ہجرت کر کے دارالاسلام میں آیا نہ ہو، اس کو جو حربی کی مانند قرار دیا ہے اس کا مطلب حضرت نانوتوی قدس سرہ نے یہ بیان فرمایا کہ امام اعظمؒ کا مقصد اس حکم سے اس شخص کو عار دلانا ہے اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے پر ابھارنا ہے۔ آنحضرت تحریر فرماتے ہیں کہ:

"غرض امام رحمۃ اللہ ازیں کلام این بود کہ لحوق عار باعثِ ترک آں دار خواہد بود، ایں جا برعکس آں رونمود، ہمیں اباحت سرمایہ اقامتِ ہند گردید، استغفر اللہ!"

اس ضروری تمہید کے بعد عرض یہ ہے کہ اہل حرب کے اموال دارالاسلام کے مسلمانوں کے حق میں تو معصوم اور قابل ضمان نہیں ہیں مگر دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کے حق میں بھی معصوم اور قابل ضمان نہیں ہیں، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لئے ہندوستانی مسلمان اور یہاں کے غیر مسلم کے درمیان کوئی سودی معاملہ ہوتا ہے تو وہ صورۃ بھی سودی معاملہ ہے اور

حقیقۃً بھی سودی معاملہ ہے۔

۴— بینک میں خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری ضرورۃً جو رقم جمع کی جاتی ہے اور اس پر جو سود ملتا ہے اس کا حکم قیاس کی رو سے تو یہ ہے کہ اسے نہ لیا جائے، مگر انگریزی دور میں مفتیان کرام نے استحساناً یہ فتوی دیا تھا کہ اس کا لینا ضروری ہے، موجودہ ہندوستان میں اس فتوی کو بدلنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، اس لئے اب بھی ارباب افتاء کی یہی رائے ہے کہ اس کو لے کر بغیر نیت ثواب غرباء کو مالک بنانا ضروری ہے، بعض اکابر نے رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کرنے کی بھی گنجائش دی ہے، مگر مجھے اس سلسلہ میں شرح صدر نہیں ہے۔

نوٹ:

ایک فتویٰ یہ سامنے آیا کہ : ''سود کی رقم بینک سے نکال کر اولاً غیر واجب ٹیکس کی ادائیگی کی صورت میں حکومت کو واپس کر دیا جائے تا کہ ردعلی رب المال کا اصول پورا ہو جائے، اگر یہ صورت نہ ہو سکے تو پھر اس رقم کو رفع وبال کی نیت سے فقراء ومحتاجوں کو دیدیا جائے''۔

یہ فتوی درست نہیں ہے، کیونکہ اگر ردعلی رب المال ضروری ہے تو پھر بینک سے اس کے لینے ہی کی کیا ضرورت ہے؟

۵— موجودہ ہندوستان میں سود کے لینے کی یعنی استعمال کرنے کی تو قطعاً گنجائش نہیں ہے، البتہ مجبوری کی صورت میں دینے کی گنجائش ہے اور اس کی بنیاد یہ فقہی جزئیہ ہے کہ **یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح** (الاشباہ)۔

۶— حاجت مند کے لئے سودی قرضہ لینے کی شرعاً گنجائش ہے جیسا کہ مذکورہ بالا جزئیہ سے واضح ہے اور فتح القدیر میں پانچ مراتب بیان کئے گئے ہیں: ضرورت، حاجت،، منفعت، زینت، اور فضول۔

ضرورت: ایسی حد تک پہنچ جانے کا نام ہے کہ اگر ممنوع چیز نہ کھائے گا تو ہلاک ہو

جائے گا یا ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا، یہ مرتبہ حرام کے کھانے کو مباح کر دیتا ہے

حاجت: جیسے بھوکا آدمی کہ اگر اس کو کھانے کی کوئی چیز میسّر نہ ہوگی تو ہلاک تو نہ ہوگا جہد و مشقت سے دو چار ضرور ہوگا، یہ مرتبہ حرام کو حلال نہیں کرتا، ایسے شخص کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے۔

منفعت: جیسے گیہوں کی روٹی، بکری کا گوشت، اور مرغن کھانوں کی خواہش کرنا۔

زینت: جیسے حلویٰ شکر کی خواہش کرنا۔

فضول: جیسے حرام اور مشتبہ چیزوں کا ٹھاٹھ سے کھانا (حموی قاعدہ خامسہ)۔

۷— ان سب کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح ہے اور ان صورتوں میں سود دینے کو رشوت دینے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، وجوہ درج ذیل ہیں:

(الف) حق کی تحصیل کے لئے رشوت دینے کی شریعت نے اجازت دی ہے، سود دینے کی اجازت نہیں دی۔

(ب) رشوت میں کوئی عقد معاوضہ نہیں ہوتا اور ان صورتوں میں عقد معاوضہ ہے، اس لئے رشوت دینے نہ دینے کا اختیار رہتا ہے اور ان صورتوں میں نہ دینے کا اختیار نہیں ہے۔

(ج) مالداروں کے مال میں بھی غرباء کا حق ہے **وفی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم** اس لئے اگر رشوت والی تاویل حکومتی سودی قرضوں میں درست ہوگی تو پھر اس کو مہاجنی سودی قرضہ میں بھی جاری کرنا ہوگا۔ وھو کما تریٰ!

۸— اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی یا زیادہ ہے تو درست ہے اور اس کو قرضہ ہی کی واپسی کہا جائے گا حکومت اس کا جو چاہے نام رکھے۔

۹— غیر ممالک سے مال درآمد کرنے کی صورت میں اگر واقعی قانونی مجبوری ہو تو سود دینے کی گنجائش ہے، جیسے ہوائی جہاز سے سفر کی صورت میں چونکہ بیمہ پالیسی میں مجبوراً حصّہ لینا

☆ شیخ الحدیث، دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ گجرات

پڑتا ہے۔ اورغیر مما لک کو مال برآمد کرنے کی صورت میں چونکہ کوئی قانونی مجبوری نہیں ہے، اس لئے اس صورت میں ملنے والے سود کا حکم وہی ہے جو بینک کے سود کا ہے کہ اس کو لے کر غرباء کو مالک بنانا ضروری ہے۔

۱۰— بینک خواہ سرکاری ہوں یا شخصی سودی قرض لینے کے بارے میں دونوں کا حکم یکساں ہے۔

۱۱— اپنی صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے سرمایہ کاروں سے سرمایہ حاصل کر کے اس پر سود ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

تنبیہ: ایک خیال یہ سامنے آتا ہے کہ چونکہ سرکاری خزانہ میں ہر شخص کا حق ہے، اس لئے حکومت اور رعایا کے درمیان سودی معاملہ نہ ہوگا، یہ خیال بہت قدیم ہے مگر صحیح نہیں ہے کیونکہ تحقیق ربوا کی شرائط اربعہ میں تیسری شرط دونوں عوضوں کا ایک شخص کی ملکیت نہ ہونا جو بیان کی گئی ہے اس کی مثال عبد وسید دی گئی ہے ایسی دوسری مثالیں مالک اور دکان کا مینیجر اور باپ اور بیٹا بھی ہوسکتی ہیں، بشرطیکہ املاک متمایزہ ہوں، بیٹا باپ کے ماتحت ہو لیکن اگر بیٹے کی املاک متمایزہ نہ ہوں تو باپ اور بیٹے کے درمیان سود کا تحقق ہوگا، اگر چہ باپ کے مال میں وارث ہونے کی حیثیت سے اولاد کا حق ہوتا ہے، اسی طرح رعایا کا بیت المال میں جو حق ہے اس کی وجہ سے املاک کا تباین ختم نہیں ہوجاتا۔

☆☆☆

سود کا مسئلہ

مفتی جمیل احمد نذیری ☆

۱ – ربا کی تعریف:

" فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط (ذاالفضل) لواحد المتعاقدین فی المعاوضة" (ردالمحتار ۴/۱۷۶)۔

ربا کا دائرہ:

" فالعلة عندنا الکیل مع الجنس أو الوزن مع الجنس قال و یقال القدر مع الجنس" (ہدایہ ۳/۷۷)۔

اسی کتاب میں ہے :"لأن الربوا هو الفضل المستحق، لأحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیه" (حوالہ مذکورہ)۔

اسی کتاب کے (صفحہ ۷۹) پر ہے:" وإذا عدم الوصفان الجنس و المعنی المضموم إلیه حلّ التفاضل و النساء"۔

بدائع میں ہے :" ومنها الخلو عن احتمال الربوا (الی) فاحتمال الربوا یفسد له" (۵/۱۲۹)۔

۲ – دارالحرب کے سودی معاملات سود نہیں کہے جا سکتے، کیونکہ عصمتِ بدلین تحقق

ربا کے لئے شرط ہے۔

”قال فی الشر نبلالیة ومن شرائط الربوا عصمة البدلین وکونهما مضمونین بالاتلاوف فعصمة احدهما وعدم تقومه لایمنع“ (درمختار ۴/۱۷۶)۔

۳— دارالحرب اوردارالاسلام کی تعریف:

”ان المراد بدارالاسلام بلاد یجری فیها حکم امام المسلمین و تکون تحت قهره، و بدار الحرب بلاد یجری فیها أمر عظیمها و تکون تحت قهره“۔

یہ دونوں حقیقی دارالحرب (ایسے ممالک جو بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کبھی مسلمانوں کے زیرنگیں نہیں آئے) کی تعریف ہے اورایسے حقیقی دارالاسلام (ایسے ممالک جو مسلمانوں کے قبضہ میں آنے کے بعد سے آج تک انہیں کے قبضہ میں ہیں) کی، جوممالک دارالاسلام رہ کر کفار کے تسلط میں چلے گئے ہوں ان کے متعلق بدائع الصنائع میں ہے۔ (ہندوستان بھی انہیں ممالک میں داخل ہے)۔

احقر کے نزدیک ہندوستان کا دارالحرب ہونا یقینی نہیں، اغلب رجحان دارالامن کی طرف ہے، ویسے یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس پر الگ سے گفتگو ہونی چاہئے۔

۴— بینکوں سے سود نکال لیا جائے اور بلا نیت ثواب محض تفریغ ذمہ کے لئے غرباء و مساکین کوصدقہ کردیا جائے۔

”قال الشر نبلا لی ان الخبیث واجب التصدق فلا یاخذ الا من یجوز له الصدقة (فتاوی مولانا عبدالحیٔ ر ۴۸۳)، لا یقصدبه أی بالتصدق من المال الخبیث تحصیل الثواب بل تفریغ الذمة“ (کتاب مذکور ر ۵۲۰)۔

۵— سود لینے اوردینے میں فرق ہے، سودلینا کسی حال میں کبھی بھی جائزنہیں، سوددینے کی بعض حالات میں کچھ گنجائش ہے۔ جیسا کہ چھ ۶ کے تحت آرہا ہے۔

اس کی نظیر رشوت ہے کہ بعض حالات میں (مثلاً اپنا حق لینے اور اپنے سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے) رشوت دینے کی گنجائش ہے مگر لینے کی کبھی بھی گنجائش نہیں۔

"الرشوة مايعطى لإبطال حق أو لإحقاق باطل، أما إذا اعطى ليتوصل به إلى حق او ليدفع به عن نفسه ظلماً فلا بأس به" (مرقاۃ المفاتیح ۴؍۱۵۳)۔

۶ — اگر کسی جائز ذریعہ معاش کا کوئی بندوبست نہ ہوتا ہو تو مجبوراً سودی قرض لینا جائز ہے ۔

"يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر ؍ ۶۵)۔

۷ — اس صورت میں احقر کے نزدیک رشوت پر قیاس درست ہے۔

۸ — احقر کے نزدیک اس قسم کا قرض اس نیت سے لینے کی گنجائش ہے کہ اس چھوٹ کو قبول نہیں کرتے ہم پوری رقم ادا کریں گے۔ خواہ حکومت چھوٹ والی رقم کے مساوی رقم، سود کے نام سے وصول کرے، ہم اصل رقم سمجھ کر ادا کر رہے ہیں اور چھوٹ ہمیں منظور نہیں (چھوٹ قبول نہ کرنے کی صورت میں وہ رقم پوری کی پوری ذمہ میں باقی رہ جائے گی)، لہذا مذکورہ نیت کی گنجائش ہے، البتہ اگر چھوٹ والی صورت میں کچھ تفصیل ہو تو وہ بھی لکھی جائے تا کہ مزید غور کیا جائے۔

۹ — غیر مسلم ممالک (دارالحرب) سے اس قسم کی تجارت جائز ہے، اس پر شرعاً سود کا اطلاق نہ ہوگا بین الاقوامی تجارتی ضوابط بھی حربی کے ہی وضع کردہ ہیں۔ لہذا اس قسم کی تجارت کی شرعاً گنجائش ہے۔

۱۰ — دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا سود حرام ہے۔

۱۱ — جائز نہیں ہے، کیونکہ سودی قرض کے لئے سوال میں درج شدہ اعذار شرعاً عذر نہ بنیں گے۔

ضمیمہ سوال ۲ کے جوابات:

۱— خواہ جائیداد پر قبضہ، افسر متعلقہ کی طرف سے قیمت کے تعین کے بعد ہوا ہو یا قبضہ فوراً ہی ہو گیا ہو اور قیمت کا تعین بعد میں ہوا ہو، دونوں صورتوں میں ۶ فیصد والی رقم کو شرعاً سود نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ہماری ملکیت کا جو معاوضہ ہمیں ملا نہیں وہ خواہ معاوضہ کے فرق یا اپنی ملکیت کے انتفاع سے محرومی کے معاوضہ اور سود کے نام پر ملے، حقیقت میں وہ ملکیت کا ہی معاوضہ مانا جائے گا، اسے شرعاً سود نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ سود (ربا) کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"تنخواہ کا کوئی جزو اس طرح وضع کرا دینا اور پھر یکمشت وصول کر لینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے، کیونکہ درحقیقت وہ سود نہیں ہے، اس لئے کہ تنخواہ کا جو جزو وصول نہیں ہوا ہو اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا، پس وہ رقم زائد اس کی مملوک شئے سے منتفع ہونے پر نہیں دی گئی بلکہ تبرع ابتدائی ہے، گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے" (امداد الفتاوی ۳/۱۴۹)۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"پراویڈنٹ فنڈ اور اس پر جو سود ملتا ہے لینا اور اپنے صرف میں لانا جائز ہے، کیونکہ وہ حقیقتاً سود کے حکم میں نہیں ہے" (کفایت المفتی ج ۸/ ۹۳)۔

۲— اس توجیہ وتاویل کی گنجائش ہے، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی صدر مفتی دار العلوم دیوبند نے نظام الفتاوی (جلد اول/۲۵۱، ۲۹۶) میں اس پر مکمل ومفصل بحث کی ہے مگر ان معاملات پر علماء کرام کو مزید غور وخوض کی ضرورت ہے اور اس توجیہ وتاویل کے

قبول کرنے میں کوئی کھٹک باقی نہ رہے۔

میرے خیال میں حضرت مفتی صاحب کی توجیہات پر ہی غور ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

۳— اگر پورے خلوص و دیانت داری کے ساتھ اسی نیت کے مطابق عمل درآمد کرے تو احقر کا رجحان جواز کی طرف ہے۔

۴— اس کو ہرجانہ پر قیاس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، محمد یونس کو پوری رقم لینا جائز ہے، خواہ وہ تنخواہ کے نام پر ہو یا سود کے نام پر اور اسکی وجہ جواز وہی ہے جو سوال ۱ کے جواب کے تحت گذری، اسے تبرع ابتدائی کہیں گے، اس زائد رقم کو شرعاً سود نہیں کہہ سکتے۔

☆☆☆

ربوا کی تعریف اور اس کے احکام ومسائل

مولانا ابوالحسن علی ☆

ربوا حرام ہے اور اس کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ متعدد قرآنی آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اس کی شاہد ہے، یہاں محض تبرک اور اشارے کے طور پر دو آیتیں اور ایک حدیث کا ذکر کررہا ہوں، پہلی آیت: ''أَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا'' ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ہے، اور دوسری آیت سورہ آل عمران کی ہے: ''یٰأَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (سورۂ آل عمران ۱۳۰:) اور حدیث یہ ہے جو حضرت جابر بن عبداللہ سے مسلم شریف میں مروی ہے:

''قال لعن رسول الله ﷺ أكل الربوا و موكله و كاتبه و شاهديه و قال هم سواء''۔

حضور ﷺ نے سود کھانے والے، سود دینے والے، سودی تحریر اور حساب وغیرہ لکھنے والے اور سود کی شہادت دینے والے پر لعنت فرمائی، نیز ارشاد فرمایا: ''گناہ فی نی میں سب برابر ہیں۔

ربا لغت میں زیادتی اور بڑھوتری کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے عقد معاوضہ میں حاصل کی جائے۔

صاحب ہدایہ نے ربا کی تعریف اس طرح کی ہے:

''الربوا هو الفضل المستحق لا حد المتعاقدين فى المعاوضة الخالى عن

عوض شرط فيه" (ہدایہ ۶۱/۳)۔

اور شامی میں ربا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :"**الربوا هو لغة مطلق الزيادة و شرعاً فضل ولو حكماً فدخل ربا النسيئة**"...

دونوں تعریف کا حاصل ایک ہی ہے، یعنی شریعت میں ربا اس زیادتی کا نام ہے جو عقد معاوضہ میں متعاقدین بغیر کسی عوض کے حاصل کریں۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں وہ زیادتی بھی داخل ہے جو روپیہ کو ادھار یعنی قرض دے کر حاصل کی جائے، اس لئے کہ اصل راس المال کے معاوضہ میں تو پورے کا پورا مال مل ہی جاتا ہے اور اس پر جو زیادتی سود یا انٹرسٹ کے نام سے لی جاتی ہے وہ بلا عوض ہے، اسی طرح بیع وشراء کی وہ صورتیں بھی اس میں داخل ہیں کہ جن میں کوئی زیادتی بلا عوض حاصل کی جائے۔

ربا کا یہ مفہوم کہ قرض دیکر اس پر کچھ نفع لیا جائے عرب میں اسلام سے پہلے بھی رائج تھا اور اس کو ربا ہی قرار دیا جاتا تھا، اسی طرح قرض کی رقم کا وقت مقررہ پر ادا نہ کرنے کی صورت میں میعاد بڑھا کر اس کے مقابلہ میں کچھ مزید رقم حاصل کرنا یہ بھی اہل عرب کے یہاں ربا ہی کے شعبہ میں داخل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بیع وشراء میں زیادتی بھی ربا میں شامل ہے، اس سے اہل عرب نہ واقف تھے اور نہ اس کو ربوا قرار دیا جاتا تھا، لیکن حضور ﷺ نے ربا کے مفہوم کو وسیع کرتے ہوئے اس قسم کی زیادتی کو بھی ربا میں شامل کر دیا۔ چنانچہ بخاری شریف میں ابو سعید خدری کی یہ روایت موجود ہے جو بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"**الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يدا بيد فمن زاد أو استزاد فقد اربىٰ الآخذ والمعطى فيه سواء**"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ چھ چیزیں جن کا ذکر اس حدیث میں

ہے یعنی سونا چاندی، گیہوں، جو، تمر اور نمک اگر ان چیزوں کا تبادلہ اسی جنس کے ساتھ ہو تو ضروری ہے کہ معاملہ برابری اور نقد کا ہو اگر اس میں کمی زیادتی کی گئی ہو تو یہ ربا میں داخل ہوگا۔ اسی طرح اگر ادھار کا معاملہ کیا تب بھی یہ ربا میں داخل ہو جائے گا خواہ ادھار میں کمی زیادتی نہ ہو اور معاملہ برابر سرابر کا ہو۔

بیع وشراء میں زیادتی کی یہ صورت جس کو اس حدیث میں ربا قرار دیا گیا ہے۔ اہل عرب میں اسلام سے قبل اس کو سود نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی لئے حضور ﷺ کی یہ بات جب مشرکین کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے انما البیع مثل الربوا کہہ کر رد کر دیا، جس کا جواب اللہ تعالی نے حاکمانہ انداز میں یہ دیا کہ دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں، جبکہ اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام قرار دیا ہے، احل اللہ البیع و حرّم الربو الیکن صحابہ کرام اور خاص طور پر حضرت عمر فاروق ؓ کو مذکورہ حدیث اور ربا کے بارے میں یہ پریشانی رہی کہ حضور دنیا سے رخصت ہو گئے اور ہم لوگ حضور ﷺ سے ربا کے بارے میں مزید توضیح وتفصیل معلوم نہ کر سکے، چنانچہ حضرت عمر نے تودعوا الربوا و الریبۃ کا اعلان فرمادیا یعنی ربوا کو بھی چھوڑ دو اور ان چیزوں کو بھی چھوڑ دو جن میں ربا کا شبہ ہو، دراصل صحابہ کرام اور حضرت عمر ؓ کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نے ربا کو مذکورہ چھ چیزوں میں منحصر فرمایا ہے یا ان چیزوں کو آپ نے بطور مثال کے ذکر فرمایا کہ دوسری چیزوں کو بھی اس میں شامل فرمایا ہے اور اگر دوسری چیزیں بھی اس میں شامل ہیں تو اس کی شمولیت کے لئے ضابطہ اور قاعدہ کیا ہوگا۔ اس کی وضاحت کے بغیر آپ دنیا سے رخصت ہو گئے، بعد میں ائمہ کرام نے حدیث مذکورہ کو معلل بالعلۃ قرار دے کر ربا کا دائرہ ان اشیاء ستہ سے وسیع کر دیا، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے قدر اور جنس علّت نکال کر بتلا دیا کہ جہاں جہاں یہ دونوں باتیں پائی جائیں گی زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہوگا اور جہاں ان دونوں چیزوں میں ایک چیز پائی جائے گی وہاں زیادتی جائز اور ادھار جائز ہوگا اور جہاں یہ دونوں وصف موجود نہ ہو وہاں زیادتی اور ادھار دونوں جائز ہوگا، چنانچہ مذروعات و معدودات میں

دونوں باتیں جائز ہیں زیادتی بھی اور ادھار بھی۔

امام ابوحنیفہ ہی کی طرح دیگر ائمہ نے بھی اس حدیث کو معلل بالعلۃ قرار دے کر علت کا استخراج کیا ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ نے طعم اور ثمینت کو علت قرار دیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ جہاں دونوں علت پائی جائیں گی زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہوگا۔ اور جہاں ایک علت موجود ہو وہاں جائز اور ادھار ناجائز ہوگا، اور جہاں دونوں علت نہ ہو وہاں زیادتی اور ادھار دونوں کو جائز قرار دیا جائے گا۔ بہر حال صحابہ کرام کے اقوال اور ائمہ کرام کے مذاہب سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ربا کا دائرہ ان مذکورہ اشیاء ستہ میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ تمام مکیلی اور موزونی چیزوں کو محیط ہے، لیکن اس میں زیادتی اسی وقت حرام ہوگی جبکہ مکیلی یا موزونی چیزوں کا تبادلہ ہم جنس کیساتھ ہو ورنہ اختلافِ جنس کے وقت تو حکم یہ ہے: ''اذا اختلف الجنس فبیعوا کیف شئتم'' یعنی جب جنس مختلف ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو۔

بہر حال ربا کا ایک خاص مفہوم ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اور اسی مفہوم کے اعتبار سے سود حرام ہے اور یہ حرمت بغیر کسی قیدِ ملک و مذہب کے ہے، نیز سود کی یہ حرمت بغیر کسی فرد، اشخاص یا زمانہ کے مطلقاً منصوص ہے اور سود کے صرف لینے دینے والے ہی کے لئے نہیں بلکہ اس میں کسی بھی حیثیت سے شرکت کرنے والے اور تعاون کرنے والے پر بھی طرح طرح کی وعیدیں اور لعنتیں وارد ہوئی ہیں۔

اس لئے سود کا مفہوم شرعی جس رقم پر بھی صادق آئے گا اور جس معاملہ پر بھی سودی معاملہ ہونا صادق آئے گا وہ حرام ہوگا، پھر وہ معاملہ خواہ ہندوستان میں ہو یا کسی دوسرے ملک میں، مسلمان کے ساتھ ہو یا غیر مسلمان کے ساتھ، سبھی حرام اور ناجائز ہی رہے گا اور جس طرح سود کا لینا حرام ہوگا اسی طرح دینا بھی حرام ہوگا مگر مجبوری کی حالت کا حکم دوسرا ہوگا۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ دور میں بینکنگ کے تمام کاروبار کو سودی قرار دینا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ اس دور میں بنک مختلف مقاصد کے لئے قائم ہو رہے ہیں۔ اور بنک کے اصول و مقاصد میں اب پہلے کے مقابلہ میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوتی جا

رہی ہیں، بہت سے بنکوں میں مختلف نوع کے کاروبار تجارتی اصول پر بھی ہونے لگے ہیں، بعض بنک شرکت ومضاربت کے اصول پر بھی چلائے جاتے ہیں، اس لئے جن کاروباروں میں مطالبات کی ادائیگی بنک کے ذریعہ یا چک کے ذریعہ ہوتی ہے، یا جن میں ملازمین کی تنخواہیں بنک کے ذریعہ ادا کی جاتی ہیں اور بنک اس میں اپنے لئے بھی کچھ رقم وصول کرتی ہے تو اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ وہ بنک کی اجرت اور محنتانہ میں بھی محسوب کیا جاسکتا ہے اور اس طرح بنک کو اجیر یا وکیل قرار دے کر اس حاصل کردہ رقم کو بنک کی اجرت اور کارکردگی کا معاوضہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہر بنک کا ہر حال میں ایک ہی حکم نہیں رہے گا بلکہ بنک کے طریقہ کار، اس کے اصول وضوابط اور معاملات کے اعتبار سے الگ الگ احکام ہوں گے جس صورت پر ربا کی شرعی تعریف صادق نہ آئے گی اس کو سود نہیں کہا جاسکتا خواہ بنک والے اس کو سود ہی کہتے ہوں جیسا کہ اکابرین اور فقہاء امت نے پراویڈنٹ فنڈ اور اس پر حکومت کی طرف سے ملنے والی زائد رقم کو سود نہیں کہا ہے، حالانکہ اس زائد رقم کو حکومت اور بنک والے سود ہی کہتے ہیں جو وضع شدہ رقم پر اور حکومت کی طرف سے شامل کردہ مجموعی رقم پر بنک کی طرف سے اضافہ کر کے ختم ملازمت پر دیا کرتے ہیں۔

اور آج کے اس دور فساد میں جبکہ بنک کے علاوہ دیگر ذرائع سے سرمایہ کی حفاظت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو چکا ہے تو مجبوری اور احتیاط کے درجہ میں سودی کاروبار کرنے والے بنکوں میں بھی اپنی رقوم کو جمع کرانا اور محفوظ کرنا جائز ہوگا، جیسا کہ اب تک اکابرین اور مفتیان کرام کا یہی فتوی رہا ہے، اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو کی ضرورت ہی نہی ہے۔ نیز یہ بھی باتفاق علماء طے شدہ بات ہے کہ خاص سود لینے اور آمدنی بڑھانے کے ارادہ سے بنک میں روپیہ جمع کرانا جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر حفاظت کے لئے روپیہ بنک میں جمع کرانا اور محفوظ رکھنا جائز ہے، تو اب اس پر جو سود ملے گا تو اس کو کیا کرنا چاہئے، یہ سوال نامہ میں موجود ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ

فقہاء امّت کے فتاوی کے مطابق اس سودی رقم کو بنک میں چھوڑ دینا بھی جائز نہیں ہے بلکہ اس کو حاصل کر کے بلا نیت ثواب غرباء مسلمین کو دے دینا لازم ہے، خود اپنے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے، خواہ سود کی یہ رقم سرکاری بنک سے حاصل ہو خواہ شخصی اور پرائیویٹ بنک سے، دونوں کا حکم ایک ہی ہے کہ صدقہ کر دیا جائے مسلمان ضرورت مند کو دینا غیر مسلم ضرورت مند کو دینے سے افضل ہے۔

بنک سے سودی قرض لینے کی صرف مجبوری اور احتیاج شدیدہ کی حالت میں اجازت ہوسکتی ہے بغیر مجبوری اور ضرورت شدیدہ کے سود کا لینا اور دینا حرام ہی رہے گا۔ مجبوری کی حالت میں سودی قرض لے سکتا ہے جیسا کہ الاشباہ والنظائر اور اس کے حاشیہ حموی میں موجود ہے (الاشباہ ۱۴۹/ مطبوعہ دارالعلوم دیوبند)۔

حکومت کی ترقیاتی اسکیموں سے جو قرضے دیئے جاتے ہیں اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں جن میں بعض صورتیں تو جائز ہیں اور بعض ناجائز۔ مثلاً کچھ سامان جیسے مشین یا کھیتی باڑی کے لئے ٹریکٹر، ٹیوب ویل اور سامان کے ساتھ بقدر ضرورت اس سامان کو استعمال کرنے کے لئے کچھ نقد رقم بھی دیا گیا اور اس پر کچھ زائد رقم وصول کر لی ہے تو اس کو سودی معاملہ قرار دینے کے بجائے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو زائد رقم وصول کیا گیا ہے وہ اس شعبہ کے انتظامی امور کو درست رکھنے کے لئے فیس ہے۔ لہذا یہ صورت سودی معاملہ نہ ہونے کی وجہ سے جائز ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت نے کاروبار کے لئے فیکٹری لگانے کے لئے سامان اور مشین وغیرہ دیا اور اس کے ساتھ نقد رقم اتنا زیادہ دیا کہ اس کی ضرورت اس سامان کو استعمال کرنے یا کام میں لانے کے لئے نہیں ہے اور پھر اس پر سود کے نام سے زائد رقم وصول کیا اور واپسی کی کل رقم حاصل شدہ رقم سے مقدار میں زیادہ ہے تو یہ سود ہے، کیونکہ اس پر سود کی تعریف :"هو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدين فى عقد المعاوضة" صادق ہے، اسکے

علاوہ ئی ئی کل قرض جرّ نفعافھو ربا'' کا یہی مصداق ہے، اس لئے یہ حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حکومت ترقیاتی اسکیموں کے ماتحت قرض دیتی ہے، مثلاً تجارت کے لئے یا مکان بنانے کے لئے یا کنواں کھودنے کے لئے اور جو رقم قرض کے طور پر دیتی ہے اس میں کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے اور باقی پر سود عائد کرتی ہے مثلاً بارہ ہزار روپے قرض دیا اور ایک تہائی یعنی چار ہزار معاف کر دیا اور باقی پر معمولی سود لمبی مدت تک کے لئے مقرر کر دیا تو دیکھا جائے گا کہ اضافی رقم اور اصل رقم ملا کر جو حکومت کو دینا پڑا ہے، حاصل کردہ رقم ۱۲ ہزار سے زیادہ تو نہیں ہے اگر زیادہ نہ ہو، برابر ہو یا کم تو پھر یہ سود کے دائرہ سے خارج ہوگا اور جائز قرار دیا جائے گا۔

غیر مما لک سے تجارت کی صورت میں بین الاقوامی اصول وضوابط کے ماتحت جو سود ملتے ہیں وہ شرعی حیثیت سے ربا میں شامل ہے اور حرام ہے، مگر چونکہ مجبوری ہے اس لئے اس کو لینے میں گناہ نہیں ہوگا، مگر جو بھی اس طرح سے سود کی رقم حاصل ہو اس کو بلا نیت ثواب غریبوں، مسکینوں پر صدقہ کر دینا واجب ہوگا۔

بنک خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، انفرادی شخصی ہو یا مشترکہ کمپنی، سودی لین دین کی اجازت ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ جن صورتوں پر ربا کی شرعی تعریف صادق نہیں آئے گی اور اس کو بنک والے سود ہی کہتے ہوں گے تو بھی جائز اور حلال ہوگا، جن صورتوں پر ربا کی شرعی تعریف صادق آئے گی اس کو حرام قرار دیا جائے گا خواہ بنک والے اور حکومت کے اہل کار اس کا سود کے علاوہ کوئی بھی نام رکھیں۔

سودی کاروبار دارالاسلام اور دارالحرب دونوں میں ائمہ ثلثہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ناجائز ہے۔ حتی کہ سودی کاروبار کی دارالاسلام میں ذمیوں کے لئے بھی اجازت نہیں ہے، چہ جائیکہ مسلمان کے لئے جائز ہو، مگر امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ دارالحرب میں ربا کی گنجائش ہے (شامی ۱۸۶/۵)۔

حضرت تھانویؒ نے بھی اپنے فتاوی میں اس کو نقل فرمایا ہے اور پھر لکھا ہے کہ قائلین بالجواز کے نزدیک بھی اس میں اتنی قیود ہیں ۱:— وہ محل دارالحرب ہو، ۲— معاملہ ربوا کا حربی سے ہو، ۳— مسلم اصلی سے نہ ہو اور نہ ذمی سے ہو اور مسلم اصلی وہ ہے جو دارالحرب میں آنے کے قبل اسلام لایا ہو خود یا تبعاللآبا، ۴— معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہو یا وہ مسلم ہو جو کہ دارالحرب میں اسلام لایا ہو، وہ مسلم اصلی نہ ہو جو دارالحرب ہی میں رہتا ہو (امدادالفتاوی ۳/۱۷۵)۔

حضرت تھانویؒ نے اوپر کی شرائط جواز کو ذکر کرنے کے بعد امام ابو یوسف کے قول یعنی عدم جواز کو دلائل کے ساتھ ترجیح دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: دونوں قولوں کے دلائل میں نظر کی گئی تو امام ابو یوسف کے دلائل قوی معلوم ہوئے۔ چنانچہ اس کو مفصلا رسالہ تحذیر الاخوان میں ذکر کردیا گیا ہے۔

لیکن اگر ہم حضرت تھانوی کی رائے کے برخلاف امام ابوحنیفہ ہی کے قول کو اختیار کریں تب بھی ہندوستان جیسے ملک میں ان کے مسلک اور شرائط کے مطابق ربا کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شرائط مذکورہ کا یہاں تحقق نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام اور یہ کہ موجودہ حالات میں دار کا لفظ دارالاسلام اور دارالحرب میں درست ہے یا نہیں، تو اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اصل دار فقہاء کرام کے یہاں دو ہے: ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالکفر، دارالاسلام وہ ملک کہلاتا ہے جہاں اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اور مسلمان وہاں اسلامی احکام وقواعد کے مطابق قانون بنانے اور اس کو جاری کرنے پر قدرت رکھتے ہوں، اور اس کے بالمقابل دارالکفر وہ ملک ہے جہاں اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر کافروں کے ہاتھ میں ہو، وہاں کفر اور شعار کفر کا شیوع اور غلبہ ہو۔ پھر دارالکفر کی تین قسمیں کی گئی ہیں: اول دارالحرب یعنی وہ ملک جو دارالاسلام کے ساتھ محاربۃ رکھتا ہو، یا محاربۃ کی کیفیت پر قائم ہو جیسے صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ

کی حالت تھی۔

دارالکفر کی دوسری قسم دارالامن ہے یعنی وہ ملک جہاں اگرچہ اقتدار اعلی کافروں کے ہاتھ میں ہومگر مسلمانوں کو وہاں اسلامی زندگی گذارنے کی آزادی اور امن ہو جیسے حضور ﷺ کے زمانہ میں ملک حبشہ کا حال تھا۔

تیسری قسم دارالکفر کی وہ ہے جس کو دارالمعاہدہ والمسالمہ کہا جاتا ہے یعنی وہ ملک جہاں کفار کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ہواور اس معاہدہ کے تحت مسلمانوں کو کافروں سے اور کافروں کومسلمانوں سے امن وامان حاصل ہو، جیسے صلح حدیبیہ کے بعد تقریباً مکہؐ کی یہی حالت تھی۔

اوراب آج کے دور میں تو شاید دارالکفر کی ایک چوتھی قسم بھی وجود میں آ گئی ہے جس کو دارالشر والفساد کہنا چاہئے، ہمارے ملک ہندوستان کو ہمارے اکابر دارالامن کہتے آئے ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کو دارالمعاہدہ والمسالمہ کہنا زیادہ موزوں ہے، کیونکہ دستور ہند یہاں کے تمام رہنے والوں کے درمیان ایک طرح کا عقد معاہدہ ہے۔

بہرحال ہندوستان دارالکفر ہے، اوراس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے پھر خواہ وہ دارالامن ہو یا دارالحرب، شرعی نقطہ نظر سے امام ابوحنیفہ کے مسلک پر بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے سودی کاروبار نہ مسلمانوں سے جائز ہے اور نہ کافروں سے، البتہ مجبوری اوراحتیاج شدید کے وقت سودی قرض لینے کی اجازت ہے جیسا کہ اس سے پہلے الاشباہ کے حوالہ سے اس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

☆☆☆

مسئلہ ربوا

مولانا آدم پالنپوری، گجرات

۱— ربوا کی شرعی حقیقت کا تحقق قرض، رہن اور بیع فاسد کی بعض صورتوں میں ہوتا ہے قرض میں اس طرح ہوتا ہے کہ ایک معین مقدار روپیہ متعین میعاد کے لئے ادھار دے کر معین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لی جاوے، جس کا ماخذ وہ حدیث ہے جو علاّمہ سیوطی نے جامع صغیر میں بایں الفاظ نقل کی ہے: ''کل قرض جر منفعةً فهو ربواً'' جو محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے، نزول قرآن کے وقت ربوا کی یہی صورت مروّج تھی کہ قرض دے کر کچھ نفع لیا جاوے، اور آیات ربوا سنتے ہی سب صحابہؓ نے اسی ربوا کو حرام سمجھ کر فوراً ترک کر دیا تھا، اسی طری رہن میں بھی قرض دے کر مرہون سے انتفاع کی شرط لگائی جاتی ہے یا انتفاع معروف ہو وہ بھی ربوا میں داخل ہے، نیز نبی کریم ﷺ نے ربوا کے مفہوم میں اس کا بھی اضافہ فرمایا کہ اشیاء ستہ ذہب، فضہ وغیرہ کے باہمی تبادلہ میں کمی بیشی ہو یا ادھار معاملہ ہو خواہ اس ادھار میں مقدار کی کوئی زیادتی نہ ہو بلکہ برابر لیا دیا جائے، احکام القرآن ابوبکر جصاص حنفیؒ فرماتے ہیں:

''فمن الربوا ما هو بيع ومنه ما هو ليس بيع وهو ربوا اهل الجاهلية وهو القرض المشروط فيه الاجل وزيادة مال على المستقرض''

ربوا کی ایک قسم وہ ہے جو بیع میں ہوتا ہے، دوسرا وہ جو بیع میں نہیں ہوتا ہے اور یہی ربوا اہل جاہلیہ میں جاری تھا کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ قرض کسی میعاد تک اس شرط پر دیا جائے کہ قرض لینے والا اس پر کچھ زیادتی کے ساتھ ادا کرے گا آیات ربوا اور احادیث شخصی

صرفی سود اور تجارتی سود دونوں کو شامل ہے، کیونکہ وہ مطلق ہیں، بلا کسی دلیل شرعی کے ان کو مقید کرنا جائز نہیں ہے، نیز آیات ربوا کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت عرب میں تجارتی سود کا رواج تھا، اس کو بھی حرام قرار دیا گیا۔

۲ــ　طرفینؒ کے نزدیک ربا کے متحقق ہونے کی ایک شرط بدلین کا معصوم ہونا بھی ہے، لہذا جب بدلین میں سے کوئی ایک غیر معصوم ہوگا، تو طرفینؒ کے نزدیک ربا کا تحقق نہ ہوگا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے، لہذا ان کے نزدیک اس صورت میں ربا متحقق ہو جائے گا، اسی بنیاد پر جب کوئی مسلمان دارالحرب میں کسی حربی سے سودی معاملہ کرے (جس میں وہ حربی سے سود حاصل کرے) تو طرفین کے نزدیک یہ جائز ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ طرفین کی دلیل یہ ہے کہ دارالحرب میں حربی کا مال معصوم نہیں ہے پس جب ربا کے متحقق ہونے کی شرط نہیں پائی گئی تو یہ معاملہ ربا کا نہ ہوا بلکہ یہ معاملہ حربی کی رضا کے حصول کا سبب ہوا جس سے غدر منتفی ہوا، اور ملکیت تو مالِ مباح پر استیلا کے سبب سے حاصل ہوئی نہ کہ عقد کے سبب سے، لہذا ربا متحقق نہ ہوگا، کیونکہ ربا اسی فضل کو کہتے ہیں جو عقد کے سبب حاصل ہو، اب یہ اشکال بھی نہ رہا کہ نصوص ربا عام ہیں جن کی تخصیص دارالاسلام کے ساتھ خبر واحد **لا ربا بين اهل الحرب و بين اهل الاسلام اخرجه البيهقي مر سلاً** کے ذریعہ کرنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ وجہ دفع اشکال کی یہ ہے کہ نصوص ربا عام ہونے کے باوجود اس مال کو شامل ہی نہیں ہیں جو استیلاء کے سبب سے حاصل ہو، نصوص کا عموم تو اس کو شامل ہے جو عقد کے ذریعہ کیا جاوے۔

۳ــ　حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے ایک طویل فتویٰ میں ''کافی نی نی سے دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریف بایں الفاظ فرمائی ہے:

''**ان المراد بدار الاسلام بلاد يجرى فيها حكم امام المسلمين وتكون تحت قهره و بدار الحرب بلاد يجرى فيها امر عظيمها و تكون تحت قهره**'' اس

تعریف سے ہندوستان دارالحرب ہے۔

نیز الدر المختار اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین شرطیں ہیں (۱) اس میں علی الاعلان مشرکین کے احکام جاری ہوں، مسلمانوں کے احکام جاری نہ ہوں، اس شرط سے معلوم ہوا کہ جس میں مشرکین کے احکام اور مسلمانوں کے احکام جاری ہوں وہ دارالحرب نہ ہوگا۔ (۲) وہ ملک دارالحرب سے متصل ہو یعنی دونوں کے درمیان کوئی دارالاسلام حائل نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ہندوستان بعض جوانب میں دارالحرب سے متصل ہے اور بعض جوانب میں دارالاسلام سے متصل ہے (۳) وہاں کوئی مسلمان یا ذمی اپنے سابق امان کے ساتھ (جو دارالاسلام ہونے کی حالت میں حاصل تھا) باقی نہ ہو یعنی مسلم کو اسلام کی وجہ سے اور ذمی کو عقد ذمہ کی وجہ سے، اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں شرطیں مجموعی طور پر ہندوستان میں نہیں پائی جاتیں، لہذا امام صاحب کے نزدیک ہندوستان دارالحرب نہ ہوا، صاحبین کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں شعائر کفر رواج پا جائیں، کذا فی فتاویٰ عبدالحی، شامی میں اس شرط کو بایں الفاظ لکھا ہے: **"وهو اظهار الكفر"** لہذا صاحبینؒ کے نزدیک ہندوستان دارالحرب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے "کافی نی نی سے جو تحریر نقل فرمائی ہے وہ صاحبین کے مسلک پر ہے، اور جن محققین اکابر مثلاً شاہ عبدالعزیز دہلوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا ہے وہ صاحبین کے قول کو اختیار فرما کر دیا ہے۔

جواب ۲ و ۳ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی کفار سے سود لینے کا جواز صرف امام محمدؒ کے قول کے مطابق حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق تو ہندوستان دارالحرب ہی نہیں ہے، اس لئے ان کے نزدیک ہندوستانی کفار سے سود لینا جائز نہیں ہے اور

☆مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

امام ابو یوسف کے قول کے مطابق اگر چہ ہندوستان دارالحرب ہے لیکن ان کے نزدیک دارالحرب میں بھی حربی سے سود لینا جائز نہیں ہے (جیسا کہ جواب (۲) میں گذرا ہے)، اس لئے اب صرف امام محمدؒ کے نزدیک ہندوستانی کفار سے سود لینے کا جواز ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک ہندوستانی دارالحرب سے اور دارالحرب میں حربی سے مسلمان کا سود لینا جائز ہے۔ اور افتاء کا اصول یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں شیخین ایک جانب ہوں اور امام محمدؒ دوسری جانب تو شیخین کے قول پر فتوی دینا ضروری ہے، اگر چہ مفتی دلائل میں غور کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، الغرض ہندوستان کے (صاحبین کے نزدیک دارالحرب ہونے کے باوجود) ہندو سے سود لینا مسلمان کے لئے جائز نہیں (دیکھئے: اعلاء السنن ۱/ ۳۶۰)۔

۴ــ سرکاری بینکوں میں اور ان بینکوں میں جن کے مالک غیر مسلم ہیں روپیہ جمع کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس روپیہ سے وہ سودی کاروبار کر کے مالی استفادہ حاصل کرتے ہیں، اور اس کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کی تخریب پر صرف کیا جاتا ہے، اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔

لیکن اگر کسی نے غلطی یا قانونی مجبوری کی بنا پر روپیہ جمع کر دیا ہو تو اس کا سود (بھی باوجود حرام ہونے کے) وصول کر لینے کا جو فتوی ہمارے اکابر (حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت سعید احمد مظاہری وغیرہم) نے دیا تھا اس کی وجہ خود انہوں نے اپنے بعض فتاویٰ میں یہ بتائی ہے کہ ''ایسی سود کی رقمیں پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے دی جاتی ہیں اور یہ رقمیں مسلمانوں کو مرتد بنانے میں استعمال کی جاتی ہیں، اس لئے سود کی رقم نہ لینا ایک بڑے فتنہ وفساد کا سبب ہے، لہذا ارباب فتاویٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ مذکورہ سودی رقمیں ضرور لینا چاہئے بلکہ سمندر میں پھینک دینا بینک میں چھوڑ دینے سے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کو ہمارے اکابر نے سود ہی قرار دیا تھا لیکن اھون البلیتین کو اختیار فرما کر اسے وصول کر لینے کا فتویٰ دیا تھا۔

۵— سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں، چنانچہ طرفین کے نزدیک دار الحرب میں یہ صورت بھی جائز ہے کہ مسلمان کسی حربی سے ایک درہم کے بدلے دو درہم لیوے اور یہ بھی جائز ہے کہ دو درہم کے بدلے ایک درہم لیوے، کیونکہ حربی کے مال کو لینا حقیقتا بطریق ربا نہیں ہے بلکہ بلا غدر بطریق اباحت ہے، چنانچہ مبسوط سرخسی (۵۹/۱) پر مذکور ہے:

"ویستوی ان کان المسلم اخذ الدرھمین بالدرھم او الدرھم بالدرھمین، لانہ طیب نفس الکافر بما اعطاہ قل ذلک او کثر واخذ مالہ بطریق الاباحۃ الخ"

اور ائمہ ثلثہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک سود لینا اور دینا دار الحرب میں بھی جائز نہیں ہے، سود دینا اضطرار کی حالت میں درست ہے، پس اگر جان کا قوی خطرہ ہو یا عزت کا قوی خطرہ ہو اور اس سے بچنے کی صورت نہ ہو، مثلاً نہ جائداد فروخت ہوسکتی ہے نہ روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں شرعاً معذور ہے، اور اگر ایسی ضرورت نہ ہو بلکہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لئے ضرورت ہو یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے یا جائیداد فروخت ہوسکتی ہے تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں، کبیرہ گناہ ہے (فتاوی محمودیہ ۳۰۷/۶)۔

۶— سودی قرض لینا حرام ہے۔ لہذا حرام کے ارتکاب کے لئے جس درجہ کی ناقابل برداشت مجبوری ہونی چاہئے اس کے بغیر اس کی گنجائش نہ ہوگی، الاشباہ والنظائر میں قاعدہ بیان کیا گیا ہے: **"الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ"** اس کے ذیل میں یہ جزئیہ نقل کیا ہے: **"یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"** جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا، اور بغیر قرض کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں، اور قرض بھی بغیر ربا کے نہیں ملتا ہو وہ اپنی مجبوری کی حد تک معذور ہے (فتاوی محمودیہ ۳۰۷/۶)۔

اضطرار اور حد درجہ مجبوری کی حالت میں جب کہ ہلاکتِ نفس کا خوف ہو جس طرح بقدر ضرورت مردار کھا کر اپنی جان بچانے کی اجازت ہے اسی طرح فقہاء نے اضطرار اور حد درجہ کی احتیاج اور شدید مجبوری کی صورت میں جبکہ قرض وغیرہ ملنے کی امید نہ ہو تو بقدر ضرورت

سودی قرض لینے کی اجازت ہے، ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۶ / ۴۶۱)۔

پھر ضرورت اور حاجت میں فرق ہے۔ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہوجائے گا۔یہی صورت اضطرار کی ہے، اسی صورت میں حرام چیز کا استعمال بچند شرائط جائز ہوجاتا ہے۔اور حاجت کے معنی یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہ ہوگا مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی، یہ صورت اضطرار کی نہیں ہے، اس صورت میں نماز، روزے، طہارت وغیرہ بہت سے احکام میں سہولتیں تو دی گئی ہیں، مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی (ماخوذ از جواہر افقہ)۔

۷— حکومت ترقیاتی اسکیموں یا امدادی قرضوں کے نام سے جو سودی قرضے تقسیم کرتی ہے اس کا لینا بلا اضطراری حالت کے جائز نہیں ہے، ان کا حکم بھی عام سودی قرضوں کی طرح ہے، کیونکہ اس پر ربا کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے کہ نقد روپیہ قرض دے کر زیادتی کے ساتھ واپس لینا اس میں ہوتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جمہوری حکومت کے خزانۂ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے شرعی ملک مراد نہیں، چنانچہ مالکانہ تصرّفات (بیع) ہبہ، وصیت وغیرہ) اس میں جاری نہیں ہوتے، اور جو انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے وہ دفع رشوت کے جواز کے لئے کافی نہیں کیونکہ یہ حق انتفاع ایسا ہی ہے جیسا کہ جنگل سے لکڑیاں چننے کا حق ہے اور حق احتطاب کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز نہیں ہے۔چنانچہ البحر الرائق میں لکھا ہے:

"الظلمة تمنع الناس من الاحتطاب من المروج الا بدفع شئی الیهم فالدفع والاخذ حرام لانه رشوة" (۲۸۶/۶)۔

رشوت تو اس صورت میں دینا جائز ہے جبکہ مال کسی مسلمان کی ملک میں آچکا ہو اور قبضہ بھی ہو اور اس کے متعلق ظلم کا خوف ہو یا اپنی آبرو یا جان کے متعلق ظلم کا خوف ہو جیسا کہ البحر الرائق میں مذکور ہے: **"اذا دفع الرشوة خوفا علی نفسه او ماله فهو حرام علی الأخذ غیر حرام علی الدافع وکذا اذا طمع فی ماله فرشاه ببعض المال" (۲۸۶/۶)**

جب مقیس علیہ (رشوت) کا یہ حال ہے تو (مقیس) سود کا حال اسی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کو فقہاء نے جو جائز کہا ہے اس کا مفہوم مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے جو سرکاری خزانے سے حق انتفاع کے مفہوم سے بالکل مغایر ہے:

"اذا کان المدعی محقا یری ان القاضی لا یحکم له بحقه ولا یدفع عنه ظلم خصمه الا بدفع الرشوة فلا باس له فی الدفع وحرام علی القاضی الاخذ لان الحکم بالحق ودفع الظلم واجب علیه لا یجوز له ان یاخذ علیه شیأ" (التفسیر المظہری)۔

جب عام معاشرہ بگڑ چکا ہو، غیر قومیں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں تو علماء کا کام یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی جواز کی راہ نکال کر ان غیر قوموں کی اتباع کا فتوی دیں، بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ رضا خداوندی اور ابدی انعامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے اخلاص وقوت کے ساتھ پیش کریں اور یہ بتائیں کہ مسلمان کی ترقی احکام شریعت کی پابندی میں ہے نہ کہ حلال وحرام کی تمیز کے بغیر مال جمع کرنے میں، اگر موسم خراب ہو اور امرود سے حیضہ پھیلنے کا اندیشہ ہو تو حفظان صحت کے ماہرین حدود میونسپلٹی میں بھی امرود کا داخل ہونا بند کرا دیتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ بندر اور گدھے امرود کھا رہے ہیں اور ان کو کسی طرح ہیضہ نہیں ہوتا کہ ان کی حرص میں انسانوں کو بھی اجازت دی جاوے (فتاوی محمودیہ ۲۱۸/۴)۔

۸۔ حکومت نے کسی کو مثلاً پانچ ہزار روپئے قرض دے کر ان میں سے ایک ہزار معاف کر دیئے تو یہ معاف کرنا فقہاء کی اصطلاح میں ابراء، یا ہبۃ الدین ممن علیہ الدین کہلاتا ہے

جو مدیون کے قبول کے بغیر تام ہو جاتا ہے، مدیون کے رد کرنے سے رد بھی ہو جاتا ہے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری ۴؍ ۳۸۴ پر ہے :"ھبة الدین ممن علیه الدین و ابراء ہ یتم من غیر قبول من المدیون و یرتد بردہ، ذکرہ عامة المشائخ وھو المختار الخ" اس اصول کی روشنی میں جب عام طور پر لوگ چھوٹ کو رد نہیں کرتے تو یہ ابراء کا معاملہ تام اور مکمل ہو جاتا ہے، اس بنا پر اب قرض صرف چار ہزار ہی رہ گیا، پھر جب اس کو زیادتی کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے جس کی پہلے سے شرط ہوتی ہے تو یہ سود ہو گیا اگر مدیون ابراء کو رد کر دے تو سود لازم نہ آوے، بشرطیکہ واپسی کی مجموعی رقم پانچ ہزار سے بڑھ جاوے، لیکن ابراء کو رد کرنے کی عملی شکل کیا ہوگی، جب خود اس نے ابراء کا مطالبہ کر رکھا ہے اور فارم میں بھی اس مطالبہ کو پیش کر چکا ہے یہ محل غور ہے۔

۹ــ غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں سود سے بچنے کا شرعی حیلہ یہ ہے کہ سودا (معین میعاد کے ساتھ) ادھار کیا جاوے اور وہ قیمت طے کی جاوے جو اصل اور سود ملانے سے حاصل ہوتی ہے جس سے سود سود نہیں رہے گا، بلکہ جزو ثمن بن جائے گا، مثلاً کوئی مسلم تاجر دوسرے ملک سے ایک لاکھ روپے کا مال خریدتا ہے اور تین مہینے میں قیمت ادا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو مزید بیس ہزار روپئے سود بھرنا پڑتا ہے تو سود سے بچنے کے لئے یہ کرے کہ یہی مال تین مہینے کی میعاد سے ایک لاکھ بیس ہزار میں خریدے تو یہ بیس ہزار جزو ثمن بن جائے گا۔ اسی طرح مال بیچنے میں بھی کرے، ہدایہ میں ہے :"ألا یری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل"
۔

۱۰ــ سرکاری اور غیر سرکاری بینکوں میں قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں کچھ فرق نہیں ہوگا، یعنی اضطراری اور حد درجہ کی احتیاج اور مجبوی کی صورت میں جب کہ قرض کے بغیر گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو اور قرض بھی بغیر ربا کے نہ ملتا ہو تو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت ہے ورنہ اجازت نہیں اور نہ ضرورت سے زیادہ لینا درست ہے ۔

۱۱ــ اپنی صنعت اور تجارت کی ترقی کے لئے پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے سرمایہ حاصل

کرنا اور اس پر سود ادا کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، یہ ترقی اسلامی نقطہ نظر سے ترقی نہیں ہے بلکہ بربادی ہے اور قہار کا قہر جوش میں لانے والی ہے، مسلمان کی ترقی حرام اور لعنت کے کاموں سے پوری طرح پرہیز کرنے میں ہے، سودی کاروبار کو مالِ مسلم کی ترقی کا ذریعہ تجویز کرنا نصوص قرآن وحدیث کا مقابلہ کرنا ہے، ارشاد باری تعالی ہے :"**یمحق اللہ الربا**" اللہ تعالی سود کو گھٹاتے ہیں، حدیث پاک میں ہے :"**وان الربا وان کثر فان عاقبتہ الی قل**" یعنی سود خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اس کا انجام کار قلت ہے، جس وقت سود (ربا) کی حرمت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ کمزور اور قابل رحم تھے، وہ حضرات پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، کئی کئی روز فاقہ کرتے تھے، بھوک کی وجہ سے غش کھا کر گر جاتے تھے، دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں سلگتی، کپڑا بھی پوری تن پوشی کے لئے موجود نہ ہوتا تھا، بچوں کو بھوکا روتا دیکھ کر یہود کی مزدوری کرنی پڑتی تھی، پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ جواز ربا کی طرف نازل نہیں ہوا، لہذا علماء کی ذمہ داری ہے کہ غریب طبقہ کو صبر وقناعت کا سبق دیں اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے عمومی حالات زندگی سنائیں، اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی کا ایک طویل فتویٰ مطبوعہ فتاویٰ محمودیہ (ج ۴ ص ۲۰۲ تا ص ۲۱۸) مستقبل رسالہ کی صورت میں قابلِ اشاعت ہے۔

☆☆☆

سود کا مسئلہ

مفتی جنید عالم قاسمی ☆

ربا کی تعریف:

ربا کے معنی زیادتی اور بڑھوتری کے آتے ہیں اور اصطلاح شرعی میں ربا ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل ہو۔ ابن العربی کی مشہور تفسیر احکام القرآن میں ربا کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''الربوٰ فی اللغة الزیادة والمراد فی الآیة کل زیادة لا یقابلها عوض'' (احکام القرآن)۔

صاحب ہدایہ ربا کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

ربا ہر وہ زیادتی کہلائے گی جو دو آدمیوں کے باہمی لین دین کے معاملہ میں بغیر کسی مالی عوض کے کسی کو مشروط طریقہ پر حاصل ہو، ملاحظہ ہو ہدایہ کی عبارت:

''لان الربا هو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیه'' (ہدایہ باب الربا ۳/۷۷)۔

صاحب ہدایہ کی اس تعریف سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر زیادتی کی شرط نہیں لگائی گئی ہے بلکہ دینے والا اپنی خوشی سے اصل مال سے کچھ زیادہ دے رہا ہے تو وہ زیادتی ربوا نہیں کہلائے گی اور اس کا استعمال شرعاً جائز ہوگا، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ کی عبارت سے اس کی

پوری وضاحت ہوتی ہے۔

"قال محمد فی کتاب الصرف ان اباحنیفة علیہ الرحمۃ کان یکره کل قرض جر منفعة قال الکرخی هذا اذا کانت المنفعة مشروطة فی العقد بان أقرض غلة لیرد علیه صحاحا او ما اشبه ذلک فان لم تکن المنفعة مشروطة فی العقد فاعطاه المستقرض اجود مما علیه فلاباس به" (عالمگیری ۳/۲۰۲)۔

عالمگیری کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زیادتی کی شرط عقد کے اندر لگائی گئی تو وہ ربا کہلائے گی ورنہ نہیں۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں ربا کی جو تعریف نقل کی ہے اس میں بھی یہ قید ہے:

"وفی البنایة قال علماء نا هو بیع فیه فضل مستحق لاحد المتعاقدین خال عما یقابله من عوض شرط فی هذا العقد" (البحر الرائق ۶/۱۳۵)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے البحر الرائق کے حاشیہ المسمی بمنحۃ الخالق میں ابن کمال اور اس کی شرح کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں ایک اور قید کا اضافہ ہے، وہ کہ زیادتی کی شرط بدلین میں ہو یعنی بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کے لئے ہو، اگر ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے تو زیادتی ربا نہیں کہلائے گی۔

اگر زیادتی کی شرط کسی تیسرے شخص کے لئے لگائی گئی تو وہ زیادتی ربا نہیں کہلائے گی بلکہ ایسی صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی، اس لئے کہ یہ شرط فاسد ہے اور شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے (منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق باب الربا ۶/۱۳۵)۔

فقہاء نے ربا کی جو تعریف کی ہے اس کو سامنے رکھنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ معاملہ بیع وشراء میں تحقق ربا کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زیادتی اموال ربویہ کے اندر ہو، اور دو ہم جنس چیزوں کا باہم تبادلہ ہو تو وہ زیادتی ربا کہلائے گی ورنہ نہیں۔ چنانچہ اگر پانچ ذراع ہروی کپڑے سات ذراع ہروی کپڑے کے بدلے میں فروخت کر رہا ہے یا ایک انڈے کو دو انڈے کے بدلہ میں فروخت کر رہا ہے تو یہ زیادتی ربا نہیں کہلائے گی، اس لئے کہ

کپڑے اور انڈے اموال ربویہ میں سے نہیں ہیں، اسی طرح اگر گیہوں کی بیع جو سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی کمی بیشی جائز ہے، اس لئے کہ یہ دونوں ہم جنس نہیں ہیں، خلاصہ بحث یہ ہے کہ ربا کا تحقق اس وقت ہوگا جب کہ:

(۱) زیادتی کسی عوض کے مقابلہ میں نہ ہو (۲) صلب عقد میں کسی ایک جانب سے اس زیادتی کی شرط لگائی گئی ہو (۳) معاملہ بیع وشراء کے اندر زیادتی اموال ربویہ کے اندر ہو (۴) اور دو ہم جنس اشیاء کا باہم تبادلہ ہو۔ نیز تحقق ربا کے لئے چار شرطیں ہیں:

(۱) بدلین کا معصوم ہونا (۲) ان دونوں کا کسی ایک شخصیت کی ملکیت نہ ہونا (۴) بدلین میں عاقدین کی شرکت کا نہ ہونا خواہ شرکت عنان ہو یا شرکت مفاوضہ، اگر یہ چار شرطیں پائی جائیں گی تو ربا کا تحقق ہوگا ورنہ نہیں۔

ربا کا دائرہ: چونکہ اردو زبان کا دامن عربی کے مقابلہ میں تنگ ہے، اس لئے ربا کا ترجمہ سود سے کیا جاتا ہے اور عام طور پر اس سے وہی مراد ہوتا ہے جو ہمارے زمانہ میں مروج ہے یعنی وہ زیادتی جو قرض کے نتیجہ میں دی جاتی ہے، بلا شبہ یہ بھی ربا ہے، لیکن ربا کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے، معاملہ بیع وشراء کے اندر جو زیادتی حاصل ہوتی ہے اس کو بھی شرعاً ربا کہتے ہیں۔

علماء ربا کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک ربا النسیہ جس کو ربا الجاہلیہ بھی کہتے ہیں اور دوسری قسم کو ربا النقد یا ربا البیع یا ربا الفضل سے تعبیر کرتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں بھی پہلی قسم کا ربا مروج تھا اور اصطلاحاً اسی زیادتی کو ربا کہتے تھے جو قرض کے نتیجہ میں مدیون سے لی جاتی تھی۔ لغت عرب کی نہایت ہی مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

"الربوا ربوان والحرام كل قرض يوخذ به اكثر منه يجر به منفعة"

ربا کی دو قسمیں ہیں اور حرام وہ قرض ہے جس سے کچھ زیادہ لیا جائے یا جس سے کوئی

منفعت حاصل ہو۔

ابو بکر جصاص نے اپنی مشہور تفسیر ''احکام القرآن'' میں ربا کی دو قسمیں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک ربا تو وہ ہے جو بیع میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو بیع کے علاوہ دوسری چیز میں ہوتا ہے، اور یہ زیادتی ہے جو قرض لینے والا دینے والے کو ادا کرتا ہے اور یہی ربا زمانہ جاہلیت میں مروج تھا۔

چونکہ زمانہ جاہلیت میں ربا کی یہی قسم مروج و متعارف تھی، اس لئے جب حرمت ربا کے سلسلہ میں آیات قرآنیہ نازل ہوئی تو سب نے اس کو حرام سمجھ کر ترک کر دیا، لیکن حضور اکرم ﷺ نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے ربا کے معنی بیان فرمائے اس میں ایک اور قسم کا اضافہ تھا اور وہ بیع و شراء کے اندر زیادتی۔ اس طرح ربا کا اطلاق ان قسموں پر ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

''الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يداً بيدٍ فمن زاد واستزاد فقد اربى الآخذ والمعطى فيه سواء'' (بخاری شریف)۔

اس حدیث میں چھ چیزوں کا ذکر ہے، سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور نمک، ان چیزوں کا باہمی تبادلہ اور بیع و شراء ہو تو کمی زیادتی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ زیادتی ربا ہے۔ اس میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ صراحت فرمادی ہے کہ ربا کا تحقق صرف قرض ہی کی صورت میں نہیں ہے بلکہ بیع و شراء کے اندر بھی ہے۔

یہاں پر ایک بحث یہ آتی ہے کہ یہ حدیث ان چھ چیزوں کے ساتھ خاص ہے یا معلل ہے، اور اس علت کی بنیاد پر ان چھ کے علاوہ دیگر اشیاء میں بھی ربا کا تحقق ہوگا؟

ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حدیث ان چھ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ دیگر اشیاء میں بھی ربا کا

تحقق ہوگا، البتہ اس کی علّت میں اختلاف ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے اجتہاد سے ایک ضابطہ بنایا اور اس ضابطہ کے مطابق ان چھ کے علاوہ دوسری چیزوں میں بھی ربا کا حکم جاری کرتے ہوئے حرمت کا فتوی دیا (اس کی پوری تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد دوم اور بدایۃ المجتہد جلد دوم)۔

یہاں پر صرف اس بیان پر اکتفا کرتا ہوں کہ حنفیہ کے نزدیک علت تحریم قدر مع الجنس ہے یعنی اگر دونوں چیزیں کیلی یا وزنی ہوں اور دونوں ایک جنس سے ہیں تو زیادتی بھی ناجائز اور ادھار بھی ناجائز۔ اور اگر ان دونوں میں سے صرف ایک وصف موجود ہے دوسرا نہیں تو زیادتی جائز ہے ادھار نہیں۔ اور اگر دونوں وصف معدوم ہیں تو تفاضل اور ادھار دونوں جائز ہیں (دیکھئے: ہدایہ ۳/۷۷)۔

خلاصہ کلام یہ کہ، ربا کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ وسیع ہے۔ قرض کے دائرہ سے نکل کر بیع وشراء کے اندر بھی ربا کا تحقق ہوتا ہے، اور ہر ان دو چیزوں کے باہمی تبادلہ میں زیادتی ربا کہلائے گی جو کیلی یا وزنی ہوں اور دونوں ایک جنس سے ہوں۔

۲ — دارالحرب میں سودی لین دین کے احکام:

دارالحرب میں سودی لین دین کے احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱ — دارالحرب میں دو مسلمانوں کے مابین باہم سودی کاروبار کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

۲ — اگر کوئی حربی ہجرت کر کے دارالاسلام چلا آیا اور پھر دارالحرب میں چلا گیا تو اس سے بھی مسلم مستامن بالاتفاق سودی کاروبار نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح دارالحرب کا ہی رہنے والا مسلمان کافر حربی سے سودی کاروبار نہیں کرسکتا ہے۔

۳ — اگر دو شخصوں نے دارالحرب میں اسلام قبول کیا اور ان دونوں نے دارالاسلام

کی طرف ہجرت نہیں کی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان دونوں کے مابین سودی لین دین جائز ہے اور صاحبین کے نزدیک ناجائز۔

۴- جو مسلمان ویزا لے کر دارالحرب میں چلا گیا تو وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد کے نزدیک غیر مسلم حربی سے سودی معاملہ کرسکتا ہے امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نہیں کرسکتا ہے (پوری تفصیل اور حوالہ کے لئے دیکھئے شامی ج ۴ ص ۱۸۸)، پہلی دونوں صورتوں میں تو سب متفق ہیں کہ سودی معاملہ دارالحرب میں بھی جائز نہیں ہے۔ تیسری صورت میں صرف امام صاحب جواز کے قائل ہیں اور بقیہ حضرات عدم جواز کے۔ اور چوتھی صورت میں طرفین جواز کے قائل ہیں اور امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ عدم جواز کے۔ گویا کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صورت میں دارالحرب میں رہ کر بھی کسی کافر سے سودی معاملہ کرے۔

اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ طرفین کے نزدیک تحقق ربا کے لئے بدلین اور عوضین کا معصوم اور متقوم ہونا شرط ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک شرط نہیں، چونکہ دارالحرب میں ایک مسلم مستأمن کے لئے ایک حربی کا مال معصوم اور متقوم نہیں ہے، اس لئے ان کے مابین ربا کا تحقق نہ ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چونکہ معصوم اور متقوم ہونے کی شرط نہیں ہے اس لئے ربا کا تحقق بہر حال ہوگا (دیکھئے: بدائع الصنائع ۳/۱۲۷، ۳/۱۲۸)۔

امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کا قول زیادہ راجح اور احتیاط سے قریب تر معلوم ہوتا ہے، مفتیان کرام کو امام ابو یوسفؒ ہی کے قول پر فتویٰ دینا چاہئے جیسا کہ مفتی عزیز الرحمن صاحب اور دیگر اکابر دیوبند نے اسی کو احتیاطی قول قرار دیتے ہوئے اس پر فتویٰ بھی دیا ہے، اس لئے کہ:

۱- قرآن وحدیث میں سود کی حرمت اور اس کی شناعت جتنی شدت سے بیان کی گئی ہے اور سود لینے والے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ کی دھمکی دی گئی ہے اس کے پیش نظر کسی مسلمان کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص سے بھی سودی کاروبار کرے، خواہ وہ

مسلم ہو کہ کافر ہو اور خواہ دارالاسلام میں ہو یا دارالکفر میں۔

۲- فقہاء کرام نے یہ صراحت کر دی ہے مسلمان جہاں بھی رہے احکام اسلام کا پابند ہے :**ولان المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون**" (مبسوط ۱۲۸/۴)۔

۳- باب ربا میں احتیاطی پہلو کو زیادہ راجح قرار دینا چاہیئے ۔ چنانچہ مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے باوجود یکہ انگریزی دور اقتدار میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لیکن سودی لین دین کے معاملہ میں اس کو دارالاسلام ہی مانتے تھے (ملاحظہ ہو مکتوبات قاسمیہ)۔

۴- امام صاحب کے جواز کا مقصد عار دلانا تھا کہ اس کو تو دارالاسلام میں رہنا چاہیئے تھا لیکن اس نے دارالاسلام کو چھوڑ کر دارالحرب کی سکونت کو ترجیح دی تو وہ سودی رقم جیسی حرام چیز کا استعمال کرے۔

بہر کیف! راقم الحروف کے نزدیک اس ایک خاص جزئیہ میں بھی امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کا قول احوط ہے، اسی قول پر مفتیان کرام کو فتوی دینا چاہیئے۔

۳- دار کی تقسیم اور اس کی تعریف:

چونکہ پوری دنیا کے اندر رہنے والے انسان دو قسموں پر منقسم ہیں، ایک مسلم اور دوسرے غیر مسلم، اس لئے پوری دنیا کو دو دار میں تقسیم کرتے ہیں: ایک "دارالاسلام" اور دوسرے "دارالکفر ثانی پھر دارالکفر کی بھی ذیلی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ دارالحرب، دارالمعاہدہ اور دارالامن۔

دارالاسلام کی تعریف:

دارالاسلام وہ ملک ہے جس کا اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو، اس میں شریعت

اسلام کے احکام وقوانین نافذ ہوتے ہوں اور حدود وتعزیرات کا اجراء ہوتا ہو۔ وہاں کا نظام مملکت شرعی اصول پر قائم ہو اور پورے ملک پر شریعت کا غلبہ ہو۔

"قَاتِلُوْ هُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" (سورۂ انفال ۳۹)۔

"قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَايُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍوَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ"۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ ان آیات میں کفر وشرک سے اس وقت تک مقابلہ کا حکم ہے جب تک کہ ان کا خاتمہ ہو کر دین کا غلبہ نہ ہو جائے اور اس کے احکام کا نفاذ نہ ہونے لگے۔ اس سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ جب تک کسی ملک میں شریعت اسلام کا نفاذ پورے طور نہیں ہو تا ہے وہ ملک دار الاسلام نہیں قرار پائے گا۔

کافی میں ہے: "ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیھا حکم المسلمین و تکون تحت قھرہ"۔

یعنی دار الاسلام سے مراد وہ ملک ہے جس میں مسلمانوں کا حکم نافذ ہو اور ان کے زیر اقتدار ہو، مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے اپنی لاجواب کتاب (ہندوستان اور مسئلہ امارت) میں دار الاسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

دار الاسلام دنیا کے اس حصہ ملک کو کہتے ہیں جہاں مسلمانوں کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو عام ازیں کہ اس ملک میں شخصی حکومت ہو یا شورائی (ہندوستان اور مسئلہ امارت)۔

صاحب شرح السیر الکبیر نے دار الاسلام کی تعریف کرتے ہوئے اس کی علامت یہ بتلائی ہے کہ مسلمان اس ملک میں مامون ہوں، ان کو جانی مالی اور ایمانی تحفظ حاصل ہو۔

"فان دار الاسلام اسم للموضع الذی یکون تحت ید المسلمین وعلامة ذلک ان یأمن فیه المسلمون" (شرح السیر الکبیر ۸۱/۳)۔

دارالاسلام کی تعریف کا خلاصہ یہ کہ وہ ملک دارالاسلام کہلائے گا:

(۱) جس کا اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو (۲) شریعت کے احکام وقوانین مثلاً حدود وقصاص اور دیگر تعزیرات کا نفاذ ہو اور جمعہ وعیدین وغیرہ شعائر اسلام کا قیام ہو (۳) اور مسلمانوں کو جانی، مالی اور ایمانی تحفظ حاصل ہو۔

دارالکفر دارالاسلام کب بنتا ہے:

یہاں پر اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دارالکفر دارالاسلام کب بنتا ہے؟ فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ جب کسی ملک میں اسلام کے احکام نافذ ہونے لگیں تو وہ ملک دارالاسلام کہلائے گا:

"ودارالحرب تصير دارالاسلام باجراء احكام الاسلام فيها كجمعة وعيدين وان بقي فيها كافر اصلي وان لم تتصل بدارالاسلام" (درمختار علی الشامی ۳/۲۳۲)۔

"اعلم دارالحرب تصير دارالاسلام بشرط واحد هو اظهار حكم المسلمين فيها" (فتاوی الہندیہ ۲/۲۳۲)۔

واضح رہے کہ یہاں پر اظہارِ احکام سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ عیدین، جمعہ اور دیگر نمازیں پڑھی جائیں، بلکہ ان کے ساتھ حدود وقصاص بھی نافذ ہوں اور شریعتِ اسلامیہ کو غلبہ بھی حاصل ہو، کسی ملک میں صرف مذہبی آزادی کا حاصل ہوجانا اس کے دارالاسلام ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، اس لئے کہ:

۱- لغت اور آیات قرآنیہ پر نظر رکھنے والا شخص یہ جانتا ہے کہ "اظہار" کے معنی میں غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: **وليظهره على الدين كله** تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے، آیت کریمہ میں صرف اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ غلبہ مقصود ہے۔

۲- ذمی کو دارالاسلام میں مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے، اگر صرف مذہبی آزادی کسی ملک کی تبدیلی کا ذریعہ بن جائے تو ایک ہی ملک کو دارالاسلام اور دارالحرب دونوں ماننا پڑے گا جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

۳- اگر مذہبی آزادی کو دارالاسلام قرار دینے کی بنیاد مانا جائے تو شاید ہی کوئی ملک دارالحرب ہو اس لئے کہ تقریباً ہر ملک میں مسلمانوں کو نماز وغیرہ ادا کرنے کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

دارالکفر کی تعریف:

"تعرف الاشیاء باضدادھا" چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔

جب ماقبل میں دارالاسلام کی تعریف کر دی گئی تو اس کی روشنی میں دارالکفر کی تعریف بھی ازخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ دارالکفر وہ ملک ہے جس کا اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کو حاصل ہو اور ان کے یعنی کفر وشرک کے احکام جاری ہوتے ہوں، کافی میں ہے : **"بلاد یجری فیھا امر عظیمھا ویکون تحت قھرہ"** (کافی)۔

دارالحرب کی تعریف:

دارالحرب یا دارالمحاربہ دنیا کا وہ دارالکفر ہے جس کی حکومت اسلامی حکومت سے برسر پیکار ہو، مسلمانوں کی دشمن اور ان کی آزادی کے لئے خطرہ ہو، مولانا مودودی صاحب اپنی کتاب "سود نی کے صفحہ ۳۸۹ پر دارالحرب سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل ہماری جنگ برپا ہو"۔

دارالمعاہدہ:

دارالکفر کا وہ ملک جس کا اسلامی حکومت سے معاہدہ ہو، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار مکہ سے چند سالوں کے لئے معاہدہ کیا تھا۔

دارالامن:

دارالکفر کا وہ ملک دارالامن کہلاتا ہے جہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو، ان کو امن و امان حاصل ہو، حکومت ان کی تہذیب و ثقافت اور مذہبی امور میں کوئی دخل اندازی نہ کرے جیسا کہ دورِ رسالت میں مکہ مکرمہ تھا جس کے باشندے مسلمانوں سے ہر طرح برسر پیکار رہتے تھے۔ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے مذہبی آزادی نہیں تھی۔ وہ مذہب کی تبلیغ اور اس پر علی الاعلان عمل پیرا نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے اس کو دارالکفر اور دارالحرب کہا

گیا۔اس کے بالمقابل مدینہ منورہ تھا جہاں پر مسلمانوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل تھی، اسلام کا غلبہ تھا، حدود وقصاص اور دیگر احکام شرع بھی نافذ تھے اس کو دارالاسلام کہا گیا، اسی دور میں ایک ملک تھا ملک حبشہ، وہاں کی حکومت تو عیسائی حکومت تھی، اس کی باگ ڈور نجاشی کو حاصل تھی جو عیسائی مذہب کا پیرو تھا لیکن اس میں لوگوں کو امن و امان حاصل تھا، اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی تھی اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی، چنانچہ کچھ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ گئے اور وہاں پر ان کو امن و امان اور مذہبی آزادی حاصل رہی، اس لئے اس ملک کو دارالامن کہا گیا۔

دارالاسلام دارالحرب کب بنتا ہے؟:

امام ابو حنیفہ کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی تین شرطیں ہیں (۱) اس میں کفر وشرک کے احکام جاری ہو جائیں (۲) اس کے اور دارالحرب کے درمیان کوئی اسلامی ملک حائل نہ ہو بالفاظ دیگر دارالحرب سے متصل ہو۔(۳) ذمی اور مسلمانوں کو امان کی بنیاد پر جو تحفظ باقی تھا وہ باقی نہ رہا ہو۔

اور صاحبین کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی صرف ایک ہی شرط ہے کہ اس میں کفر وشرک کے احکام کا اظہار برملا ہو۔

اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے احکام بھی جاری ہوں اور غیر مسلمین کے بھی تو اس کو دارالحرب نہیں کہا جائے گا۔

''لو اجریت احکام المسلمین و احکام اھل الشرک لا تکون دار حرب'' (شامی)۔

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت:

اس سے قبل دارالاسلام اور دارالحرب کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی روشنی میں موجودہ ہندوستان پر نہ تو دارالاسلام کی تعریف صادق آتی ہے اور نہ ہی دارالحرب کی، جو ظاہر

ہے اس لئے کہ یہاں کی حکومت کا خود کوئی مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، دستور و آئین کے اعتبار سے یہاں کے انتظامی امور میں مسلمانوں کو بھی حصہ لینے کا حق حاصل ہے، یہاں ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی حاصل ہے، حکومت ان کے شخصی قانون میں مداخلت نہیں کرسکتی ہے، اگر کرے گی تو مسلمان دستور و آئین میں دئے گئے حق کے مطابق حکومت سے لڑ سکتے ہیں، لہذا راقم الحروف کے نزدیک موجودہ ہندوستان نہ تو دارالاسلام ہے اور نہ ہی دارالحرب بلکہ دارالامن ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ ہر جگہ فسادات ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان بھی کافی ہوتا ہے تو پھر یہ دارالامن کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معاملہ عوام سے ہے، خود حکومت علی الاعلان ان فسادات میں حصہ لے کر مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان نہیں پہنچاسکتی ہے، نیز مسلم ممالک کا حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

۴— بینک کی سودی رقم بینک میں نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کو نکال کر بلانیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، اس لئے کہ گرچہ وہ سود ہے جس کی حرمت پر نصوص صریحہ اور اجماع امت موجود ہے لیکن بینک میں چھوڑنے سے ایک سودی ادارہ کا تعاون ہوگا اور اس کے سودی کاروبار میں مزید ترقی ہوگی جو تعاون علی الاثم والعدوان ہے جس کی مخالفت نص قرآنی سے ہے، اس لئے **واذا ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما** کے اصول کے پیش نظر اس رقم کو نکال لینا ہی راجح ہے۔

بینک کے سودی رقم کے مصارف:

بینک کی سودی رقم نکال لینے کے بعد اس کے مصارف کے سلسلہ میں تقریباً تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ اس کو نکال کر بلانیت ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کر دیا جائے اور ناروا وغیر واجبی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس وغیرہ میں بھی دے سکتے ہیں (غیر واجبی ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ اس

کا کوئی نفع مسلمانوں کو نہ پہنچتا ہو)۔ان کے علاوہ مسلمانوں کے مفادعام میں صرف کر سکتے ہیں یانہیں،اس میں علماء کے دوگروہ نظر آتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عزیز الرحمن اور مفتی شفیع صاحبان اور دارالعلوم دیو بند کے موجودہ مفتیان کرام کی رائے یہ ہے کہ اس کوفقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے، رفاہ عام میں صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ان حضرات کے پیش نظر لقطہ اور مال حرام کا حکم ہے کہ جب مالک کا پتہ نہ ہو تو ان کا تصدق واجب ہے، فقہاء نے ان جیسے مال کے لئے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے اور تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔گویا کہ ایسی جگہوں پر صرف کرنا صحیح نہیں جہاں مالک بننے کی صلاحیت نہیں۔

مفتی کفایت اللہ صاحب (مفتی اعظم) مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری، مفتی سعید احمد صاحب مفتی اعظم مظاہر علوم، شیخ الاسلام حسین احمد مدنی کی رائے یہ ہے کہ اس کو مسلمانوں کے مفادعام میں صرف کر سکتے ہیں۔حضرت مدنی تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اس کو نکال کر سمندر میں پھینک دینا بہتر ہے بینک میں چھوڑنے سے، یوسف قرضاوی اور عبداللہ بن باز کا فتویٰ بھی جواز کا ہے، ان حضرات نے عام طور پر فقہاء کی عبارت **وما اوجف المسلمون علیه من اموال الحرب بغیر قتال یصرف فی مصالح المسلمین** سے استدلال کیا ہے۔

راقم الحروف کا ذاتی رجحان بھی جواز ہی کی طرف ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے لاکھوں اور کروڑوں روپئے بینک کے اندر سود کی شکل میں موجود ہیں، اور اب مسلمان زیادہ تنگ دست بھی نہیں ہیں، نیز ان کے ذہنوں میں سود کی حرمت وشناعت اس قدر بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ پریشانیوں کو جھیل سکتے ہیں لیکن سودی رقم کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے الّا یہ کہ بہت زیادہ مجبوری ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقم بینک ہی میں چھوڑ دی جائے جو صحیح نہیں یا اس کو نکال کر سمندر وغیرہ میں پھینک دی جائے جس کی اجازت نہ تو شریعت دیتی ہے اور نہ ہی کوئی عقلمند انسان۔ اس لئے اس کو لامحالہ رفاہِ عام میں صرف کرنا ہوگا۔

اور یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ فقہاء نے مالِ حرام کے لئے لفظ تصدق استعمال کیا ہے اور لفظ تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ لفظ تصدق صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فقہاء نے قربانی کے جانوروں کی کھال اور ان کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت دونوں ہی کے لئے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے جب کہ کھال کا تصدق واجب نہیں ہے بلکہ خود بھی استعمال کرسکتا ہے اور کسی مالدار کو بھی دے سکتا ہے، اس کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت کا تصدق واجب ہے جس سے ظاہر ہے کہ لفظ تصدق کا استعمال صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لئے ہوتا ہے۔

فقہاء کی عبارت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے کو گناہ سے بری کر لے۔ لیکن کیا اس کے مصارف وہی ہوں گے جو صدقاتِ واجبہ کے مصارف ہیں اس کی صراحت نہیں ملتی ہے۔

"وفی القنية لو كان الخبيث نصابا لا يلزمه الزكوة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه" (شامی کتاب الزکوۃ ۲/۲۵)۔

جن حضرات نے اس کے مصارف صدقات واجبہ کے مصارف کو قرار دیا ہے ان کے پیش نظر لفظ تصدق ہے، لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ تصدق صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ مالک کا پتہ نہ ہونے کی صورت میں مالِ حرام کا تصدق محض اس نیت سے ہے کہ اصل شئے نہیں تو کم از کم اس کا ثواب ہی مالک کو پہنچ جائے، اور ظاہر ہے کہ جس طرح فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنے سے مالک کو ثواب ملے گا اسی طرح رفاہِ عام میں صدقہ کرنے سے بھی ثواب حاصل ہوتا ہے، بلکہ احادیث میں تو رفاہ عام میں صدقہ کرنے کو صدقہ جاریہ قرار دیا گیا ہے۔ لہذا میری ناقص رائے میں مال حرام کے تصدق کا مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ

سے بری کردے، لیکن اس کے مصارف وہی ہوں جو صدقاتِ واجبہ کے مصارف ہیں ضروری نہیں ہے۔

نیز لقطہ کے مشابہ مان کر عدم جواز کا فتویٰ دینا دو وجہوں سے صحیح معلوم نہیں ہوتا، اول یہ کہ لقطہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ لقطہ میں مالک کا علم نہیں ہوتا ہے اور یہاں پر مالک کا علم ہے، لقطہ میں مالک کی طرف مال کا لوٹانا ضروری ہے اور یہاں پر لوٹانے کے بجائے لینا ضروری ہے، ثانیاً اگر لقطہ کو مسلمانوں کے مفاد عامہ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی عبارتیں مختلف ہیں، صاحب درمختار نے جواز کے پہلو کو اختیار کیا ہے، گرچہ علامہ شامی نے صاحب ہدایہ وغیرہ کی عبارت سے عدمِ جواز ہی کے پہلو کو راجح قرار دیا ہے تاہم اختلاف کی وجہ سے استدلال تام نہیں ہوگا (شامی ۲/۵۸، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ رحیمیہ جلد سوم)۔

سود لینے کے سلسلہ میں سرکاری اور غیر سرکاری بینک کا فرق:

سود لینا بہرحال حرام ہے، اس کی حرمت نصوص صحیحہ اور اجماع امت سے ثابت ہے، اس لئے اس کو نکال کر اپنے ذاتی مصرف میں استعمال نہیں کر سکتے ہیں خواہ وہ سرکاری بینک کا سود ہو یا غیر سرکاری بینک کا، البتہ سود کی رقم بینک میں نہیں چھوڑی جانی چاہئے بلکہ نکال کر صدقہ کر دینا چاہیئے خواہ سرکاری بینک ہو یا غیر سرکاری، اس لئے کہ دونوں ہی صورت میں ایک سودی ادارہ کا تعاون ہوگا جو تعاون علی الاثم والعدوان ہونے کی وجہ سے ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

۵— سود لینے اور دینے کے حکم میں فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لئے سود لینا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور اصول فقہ کا عام قاعدہ بھی ہے کہ "ماحرم اخذہ حرم اعطاءہ" جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی

حرام ہے، علامہ ابن نجیم نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الاشباہ والنظائر'' میں مذکورہ قاعدہ کے تحت سود اور رشوت کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس قاعدے سے بعض حالات کو مستثنی بھی قرار دیا ہے اور ان حالات میں رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے، مثلاً جان و مال کا خطرہ ہو یا کسی حاکم کے پاس اپنا جائز کام کرانا ہو یا اس قسم کی کوئی دوسری مجبوری ہو تو رشوت دینا جائز ہے (دیکھئے: الاشباہ والنظائر ر ۲۲۹) بعض مجبوریوں میں سود دینے کی اجازت ہوگی خواہ وہ مجبوریاں اسلامی ملک میں ہوں یا غیر اسلامی ملک میں۔

۶ — عام حالات میں تو سودی قرض لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح دینا بھی حرام ہے، اگر حالات ایسے ہیں جن کو شریعت حاجت وضرورت سے تعبیر کرتی ہے، جن حالات میں حرام اشیاء کے استعمال کی شرعاً اجازت ہوتی ہے یا جن میں احکام کے اندر تخفیف ہوجاتی ہے، مثلاً سودی قرض کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، یا زندگی گذارنا دشوار ومشکل ہو یا زندگی کی بنیادی چیزیں مثلاً روٹی اور مکان وغیرہ بھی پورا نہ کرسکیں تو ایسے حالات میں سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی ''**الضرورات تبیح المحظورات**'' (الاشباہ) ''**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**'' (الاشباہ والنظائر ر ۱۴۱)۔

۷ — عام سودی قرضوں اور حکومت کے سودی قرضوں کے درمیان فرق ہے۔

جواب ۶ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ عام قرضوں کا حکم ہے، حکومت کے سودی قرضوں کا حکم ان سے مختلف ہے، ترقیاتی منصوبوں کے پیش نظر حکومت جو قرض دیتی ہے اس کا لینا جائز ہے اس لئے کہ حکومت اپنے خزانہ میں جو رقم رکھتی ہے وہ تمام شہریوں کی ترقی کے لئے ہوتی ہے، گویا کہ اس کے ساتھ جس طرح غیر مسلموں کا حق متعلق ہے، اسی طرح مسلمانوں کا حق بھی متعلق ہے، چونکہ حکومت کا ترقیاتی نظام رشوت اور سود پر مبنی ہے، اس لئے جب مسلمان اپنے حق کی وصولیابی کے لئے جاتا ہے تو وہ بھی رشوت وسود دینے پر مجبور ہوتا ہے اور فقہاء نے یہ صراحت کردی ہے کہ اپنے حق کی وصولیابی کے لئے رشوت وسود دینا جائز ہے، لہذا مسلمان بھی

مذکورہ صورت میں اپنے حق کی وصول یابی کے لئے رشوت وسود دے سکتا ہے۔ اور یوں کہا جائے کہ وہ رشوت ہی نہیں ہے بلکہ حکومت عام لوگوں کی ترقی کے لئے خزانہ میں رقم رکھتی ہے اس لئے اس کے نظام کو چلانے کے لئے ملازمین وغیرہ کی اجرت کے طور پر قرض لینے والوں سے کچھ رقم لے لیتی ہے جس کو رشوت نہیں کہا جا سکتا ہے، یہی رائے مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند اور خالد سیف اللہ رحمانی کی ہے، اور مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاضی شریعت بہار واڑیسہ کی بھی یہی رائے ہے (دیکھئے ان کی کتاب ''چند اہم فقہی مسائل بدلتے ہوئے حالات میں''، نیز دیکھئے: نظام الفتاوی اور جدید فقہی مسائل)۔

۸— اگر حکومت قرض پر چھوٹ بھی دیتی ہے اور اس پر سود بھی لیتی ہے اور چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہے یا اس سے زیادہ ہے تو ایسی صورت میں قرض لینا شرعاً جائز ہوگا، اس لئے کہ جب حکومت نے سود کے مساوی یا اس سے زائد چھوٹ ہی دے دیا تو اضافی رقم کو سود دینا نہیں کہا جائے گا، گرچہ حکومت اس کو سود کے نام پر وصول کرتی ہے، مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند نے بھی ایسی صورت میں سودی قرض لینے کو جائز قرار دیا ہے، او راس کو سود ہی نہیں مانا ہے (دیکھئے: نظام الفتاوی جلد اول)۔

۹— غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں چونکہ سود اور رشوت سے نجات مشکل ہے اس لئے بدرجہ مجبوری سود اور رشوت دے سکتے ہیں، شرعاً اس کی اجازت ہوگی، اسی طرح اگر قانونی مجبوری کے پیش نظر مال برآمد کرنے کی صورت میں سود ملتا ہے تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ بینک کے سود کی طرح اس کو نکال کر بلانیت ثواب صدقہ کر دینا چاہئے۔

۱۰— دونوں قسم کے بینکوں میں فرق ہے، وہ بینک جن کے مالک اشخاص وافراد ہوتے ہیں ان کا مقصد صرف دولت اکٹھا کرنا اور معاشی پریشانی کو دور کرنا ہوتا ہے، اس لئے ان بنکوں سے عام حالات میں سودی قرض نہیں لے سکتے ہیں، البتہ اگر ''ضرورت نی نی و'' حاجت نی نی کے درجہ کی مجبوری ہو تو **''الضرورات تبیح المحظورات''** اور **''یجوز للمحتاج**

الاستقراض بالربح“ کے پیش نظر سودی قرض لینے کی شرعاً اجازت ہوگی۔

جہاں تک سرکاری بینکوں کا تعلق ہے جن کے مالک حکومت ہوا کرتی ہے تو ان کا مقصد دولت جمع کرنا نہیں ہوتا بلکہ عوام کی تجارتی، صنعتی وغیرہ ترقی کو فروغ دینا ہوتا ہے اور اس نظام کو چلانے کے لئے ملازمین کی اجرت کے طور پر قرض لینے والوں سے کچھ اضافی رقم حکومت لیتی ہے جو معمولی رقم ہوتی ہے اس کو سود نہیں کہہ سکتے ہیں، اس لئے عام حالات میں بھی تجارتی اور صنعتی ترقیات کے لئے حکومت کے بینک سے قرض لے سکتے ہیں۔

۱۱— کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے سرمایہ حاصل کرے اور اس پر سود ادا کرے، اس لئے کہ بلا کسی شدید مجبوری کے سود دینا پڑے گا اور سود دینا و لینا ناجائز اور حرام ہے۔

جواب ضمیمہ سوال نمبر: ۲

۱— قانون حصول اراضی کی دونوں شکلوں میں سود کے نام پر دی جانے والی اضافی رقم پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی ہے، اس کو لے کر اپنے ذاتی مصرف میں استعمال کرنا شرعاً جائز ہوگا اس لئے کہ

۱— اضافی رقم بھی زمین کی اصل قیمت شمار کی جائے گی، گرچہ حکومت نے اس قیمت کو دو قسطوں میں ادا کیا ہے۔

۲— اضافی رقم حکومت کی طرف سے انعام ہے جیسا کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کے سلسلہ میں علماء اور مفتیان کرام کا فتوی ہے۔

۳— کوئی اضافہ اس وقت سود قرار پاتا ہے جب کہ کسی جانب سے مشروط ہو جیسا کہ اس سے قبل ربا کی تعریف میں فقہاء کرام کی عبارتیں ذکر کی جا چکی ہیں اور مذکورہ صورت میں اضافی رقم مشروط طریقہ پر نہیں مل رہی ہے بلکہ عدالت کے فیصلہ پر حکومت اپنی طرف سے

دے رہی ہے یا بغیر فیصلہ کے اپنی طرف سے دے رہی ہے۔

اگر یہ حرجانہ کوئی اسلامی حکومت دے تب بھی اس کالینا شرعاً جائز و درست ہوگا۔

۲— کاشتکاروں کو حکومت سے زرعی ترقیاتی سودی قرضے لینا جائز و درست ہے، اس لئے کہ:

۱—حکومت کے خزانہ میں دیگر شہریوں کی طرح ہر مسلمان کا بھی حق ہے اور اپنے حق کی وصولیابی کے لئے سود ورشوت دینا جائز ہے۔

۲— اضافی رقم درحقیقت سود نہیں بلکہ حکومت اپنے انتظام کو چلانے کے لئے ملازمین وغیرہ کی اجرت لیتی ہے گویا کہ اضافی رقم کا تعلق انتظامی مصارف سے ہے۔

۳— کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کارپوریشن کے حصص خریدے، اس پر سود کی تعریف صادق آتی ہے، سوالنامہ میں خود ہی اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ کارپوریشن کے حصص مضاربت کے اصول پر فروخت نہیں کئے جاتے، لہذا محض ایک شخص کی نیت کر لینے سے مضاربت صحیح نہیں ہوگی اور یہ عقد جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ عقد تو دو فریق مل کر طے کرتے ہیں، نیز کارپوریشن جب نفع بشکل سود متعین کردیتی ہے تو مضاربت کے صحیح ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴— یہ صورت جائز و درست ہے، اس میں اضافی رقم پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، محمد یونس کے لئے اضافی رقم کا لینا شرعاً جائز و درست ہے اس میں بھی وہ تمام تاویلیں چل سکتی ہیں جو جواب امیں کی گئیں۔

☆☆☆

☆ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور۔

سود کا مسئلہ

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، علی گڑھ

۱ــــ شرعاً ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جس کے مقابل کوئی معاوضہ نہ ہو، اگر بغیر شرط کے اضافہ کردیا جائے تو یہ ربا نہیں ہے بلکہ قضاء احسن ہے، **خیر کم احسن قضاءً**۔

ربا کے دائرہ میں ہر طرح کا قرض داخل ہے خواہ وہ کسی مقصد کے لئے دیا گیا ہو، اس کے علاوہ اس کا اطلاق تبادلہ اشیاء کے بعض ان معاملات پر بھی ہوتا ہے جن میں ایک جنس اپنی طرح کی جنس سے کمی بیشی یا وقت کے اختلاف کے ساتھ بدلی جائے۔

۲ــــ ربا کے معاملہ میں دارالحرب کے استثناء کی بنیاد قوی نہیں ہے، اگر ہم اسی طرح اصول بناتے جائیں تو دارالحرب میں چوری زنا وغیرہ بھی جائز رہنے چاہئیں جنہیں کوئی معقول نہیں سمجھتا۔

۳ــــ میرے خیال میں دارالحرب اور دارالاسلام کی قدیم اصطلاحات دور حاضر کے شاید ہی ایک آدھ ممالک پر منطبق ہوں، آج خود مسلم ممالک میں صحیح اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے والوں کو جس طرح ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اکثر غیر مسلم ممالک میں جو آزادی فکر وعمل ہے اس کو دیکھتے ہوئے نئی تقسیم کی ضرورت ہے، دارالحرب اور دارالاسلام کی قدیم تقسیم اس وقت کے سیاسی ودینی نظام کے تحت تھی، اب حالات دوسرے طرح کے ہیں، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ نہ تو دارالحرب ہے نہ دارالاسلام، بلکہ دارالفتن ہے جہاں کبھی امن رہتا ہے اور کبھی فساد، یہاں شہادت علی الناس کی ضرورت ہے۔

۴— بینکوں سے جو سود ملتا ہے اس کے بارے میں مجھے علماء کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اسے وہیں چھوڑ نہیں دینا چاہئے، جہاں تک اس کے مصرف کا تعلق ہے چونکہ اس کے حقیقی مالک نامعلوم ہوتے ہیں (بینک نہ جانے کن جیبوں سے وصول کرتا ہے) اس لئے ایسے اموال جن کے اصل مالک کا پتہ نہ چل سکے رفاہِ عام کے کاموں میں لگانا مناسب رہے گا، مثلاً اگر حکومت کسی سڑک کی تعمیر کے لئے چندہ طلب کرتی ہے تو اس میں دے دینا، فسادات کی روک تھام کی تدابیر وغیرہ، اس سے غیر مسلمین کی تالیف قلب کے سلسلہ میں بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

۵— دارالحرب میں جن فقہاء نے سود کے حکم میں فرق کیا ہے انہوں نے صرف سود لینے کو جائز کہا ہے دینے کو نہیں۔

۶— صرف اضطرار کی شکل میں سودی معاملہ جائز ہوسکتا ہے اضطرار کا تعین اکثر فرد خود کرتا ہے۔ یہ سود صرف رفع اضطرار اور بس ضرورت بھر ہونا چاہئے۔

۷— مسئلہ سنجیدہ غور وفکر کا متقاضی ہے، چونکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے حکومت کی مراعات سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، اور اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سے بندگان خدا کا بھلا کر سکتا ہے، اس لئے بہ کراہت کچھ گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس کا معاملہ بھی بہت کچھ نیتوں پر منحصر ہے، عام اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے سود سے نفرت کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور اچھے نظام کے لئے کوشش یا کم از کم خواہش مٹ سکتی ہے۔

۸— اگر فعل حرام نہیں تو کم از کم کراہت سے خالی نہیں

۹— غیر ممالک سے تجارت کے سلسلہ میں جہاں تک سود دینے کی مجبوری کا تعلق ہے اس کے اضطرار کا فیصلہ صاحب معاملہ خود کرے یا کچھ عادل و عالم اشخاص سے دریافت کرے، بہر حال معاملہ کراہیت سے خالی نہیں، رہا سود ملنے کا مسئلہ تو اس سود کو خود استعمال نہ کرے بلکہ

جس طرح بینکوں کے سود کو خرچ کرنا چاہئے اسی طرح اس کو بھی خرچ کرے۔

۱۰ــ ابھی تو سرکاری بینکوں سے سرمایہ حاصل کرنے کا مسئلہ ہی حل طلب ہے، اگر سرکاری بینکوں سے سود پر سرمایہ حاصل کرنے کا جواز ثابت ہو جاتا ہے تو رشوت سے احتراز ظلم سے فرار کی خاطر پرائیویٹ سرمایہ کار سے معاملہ کا جواز پیدا ہو سکتا ہے۔

ضمیمہ سوال نمبر ۲:

مثال :۱

چونکہ اس معاوضہ حرجانہ کی ادئیگی میں مارکٹ شرح سود کو بنیاد بتایا جاتا ہے اور وقت کی کمی وبیشی پر اس کی کمی وزیادتی کا انحصار ہوتا ہے نہ کہ صاحب معاملہ کی تگ ودو اور اخراجات کا، اس لئے اس کے جواز کا فتوی کراہیت سے خالی نہیں ہوگا، اس مثال کے آخر میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہے جو سود کی تقریباً تمام ہی صورتوں میں موجود ہوتا ہے، ربا البیوع میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہوتا، اسی طرح شرکت کا وہ معاملہ جس میں کوئی شریک سرمایہ پر متعین رقم وصول کرے وہ بھی سود کی نوعیت کا ہے جبکہ اس میں قرض کے بجائے شرکت کا عنصر موجود ہے۔

دوسری مثال:

رأس المال پر مدت کے معاوضہ میں اضافہ ہی دراصل ربا الجاہلیہ ہے جس کی حرمت آئی ہے۔ اسلام میں جہاں نیتوں کے فرق سے حکم میں فرق واقع ہوجاتا ہے اگر شکلا بھی معاملہ غلط ہو تو حکم واضح ہے، رہی یہ بات کہ حکومت کو مختلف مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں تو یہ کوئی وجہ جواز نہیں، اس طرح کے انتظامی مصارف بینک بھی برداشت کرتا ہے تو کیا اسے سود وصول کرنے کا جواز حاصل ہو جائے گا۔ حکومت تو طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتی ہے اس سے یہ مصارف پورے کرنے چاہئیں، یا صرف اتنی ہی رقم وصول کرے جو واقعی مصارف ہوتے

ہیں، جب تک یہ بات ہوتی سود کے سلسلہ میں آئی ہوئی وعیدوں کے پیش نظر اس طرح کے قرضوں سے احتراز اولی ہے، خاص طور سے اس سلسلہ میں عام جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔

تیسری مثال:

کارپوریشن کے معاملہ میں ایک مسلمان اپنے طور پر اپنی شرکت کو مضاربت نہیں قرار دے سکتا ہے، یہ معاملہ دونوں سے طے کرنے کا ہے، مثال مذکورہ میں خسارہ ہونے یا نفع باعتبار حصہ رسدی کچھ ہونے کا ذکر تو ہے لیکن باعتبار حصہ رسدی نفع زیادہ ہونے کا ذکر نہیں ہے؟ دراصل کارپوریشن یا اس طرح کے دوسرے کاروباری اداروں میں شرکت کا معاملہ جد انوعیت کا ہے، جس پر الگ سے غور ہونا چاہئے، اس طرح اداروں کا بیشتر سرمایہ سود پر حاصل کیا ہوا ہوتا ہے، کاروبار کے مختلف مراحل میں سود کا نفع اور سود کی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔

چوتھی مثال:

محمد یونس کا جو معاملہ ہے وہ ایک جزئی یا شخصی معاملہ ہے، اس کی مثال سے ایک عام حکم نہیں لگایا جاسکتا، یہ ضرور ہے کہ بینکوں کے سود کی طرح محمد یونس کو چاہئے کہ ان کے معاوضہ پر ملنے والی رقم کا سود وصول کریں لیکن اس کا کیا مصرف ہو۔ پورے کا پورا اضافہ وہ خود رکھ لیں یا پورے کا پورا محتاج ومضطر پر خرچ کردیں، کسی طرح یہ حساب کریں کہ اس عرصہ میں اس کی وصولیابی کے لئے انہیں کتنے اخراجات برداشت کرنے پڑے اور کتنی مشقتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ پھر اس کے مطابق سود کی رقم کے حصّے کریں یا نہ کریں، پھر یہ کہ اس مدّت میں افراط زر ہوا ہے یا تفریط زر، کیونکہ اس تاخیر سے مدعی کا فائدہ بھی ہوسکتا ہے، اگر اس مدت میں قیمتوں کی عام سطح میں گراوٹ آگئی ہو، یہ سب چیزیں محمد یونس خود فیصلہ کرسکتے ہیں اگر وہ اس کی صلاحیت محسوس کریں یا پھر کسی قابل اعتماد عالم سے دریافت کرسکتے ہیں، اس طرح کی مثال رسول اللہ ﷺ کے بعض فتاویٰ میں ملتی ہے کہ صاحب معاملہ کے پیش نظر ایک ایسا حکم دیا جو عام حکم

نہیں بن سکتا، مثلاً ایک کفارہ دینے والے کو اجازت دی کہ وہ اپنے کفارہ کو خود اپنے اہل وعیال میں خرچ کرڈالے۔

مسائل ربوا

مولانا محمد ایوب ندوی

ربا کی چار قسمیں ہیں:

۱— ربا فضل : دوہم جنس اشیاء کا تبادلہ کمی وبیشی کے ساتھ ہو، مثلاً ایک کلو عمدہ چاول دو کلو معمولی چاول کے بدلے بیچنا۔

۲— ربا الید: اگر دوہم جنس اشیاء کا تبادلہ کرتے وقت متبادل اشیاء پر قبضہ سے پہلے مجلس برخاست ہوجائے تو اس میں سود پایا جاتا ہے۔

۳— اگر دوہم جنس اشیاء کا تبادلہ ادھار ہو تو اس ادھار کا ربا پائے جانے کی وجہ سے یہ بھی حرام ہے۔

۴— ربا القرض: قرض دینے والے کا اپنے لئے نفع کی شرط لگا کر مال دینا۔ یہ چاروں صورتیں ربا میں شامل ہیں۔ آج کل چوتھی صورت کثرت سے پائی جاتی ہے۔

شافعیہ کے نزدیک دارالحرب اور دارالاسلام میں کوئی فرق سود کی حرمت کے معاملے میں نہیں ہے۔

۵— سود بالکل حرام ہے اور دینے میں اگر کسی قسم کی مجبوری ہو، جیسے ہندوستان کے سرکاری قوانین کی بنیاد پر کسی قسم کی مجبوریاں معلوم ہوتی ہیں تو سود دینا ضرورتاً جائز ہے۔

۶— اگر کسی مسلمان کے پاس کوئی مناسب ذریعہ معاش نہ ہو اور اپنے ذاتی روپیہ سے

کاروبار شروع کرنے کی صورت میں اس بات کا خطرہ ہو کہ حکومت انکم ٹیکس کے ذریعہ اس میں سے ایک بڑی مقدار غصب کرے گی تو صرف حکومت کو دکھانے کے لئے اس وقت سود پر روپیہ لے سکتا ہے جب کہ اس کو جلد ادا کی امید ہو۔

۷— حکومت سے ترقیاتی اسکیموں کے لئے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے لیکن اگر حکومت سود اتنا کم لے جو صرف اس کے اخراجات کے لئے کافی ہو تو یہ اخراجات بنام سود لینا جائز ہونا چاہئے۔

۸— جائز ہے لیکن احتیاط بہتر ہے۔

۹— معلوم نہیں۔

۱۰— کچھ فرق نہیں ہوگا۔

۱۱— سرکاری قرضہ لینے کی صورت میں جو رعایتیں حاصل ہوتی ہیں اگر وہی رعایتیں کمپنی کی طرف سے قرضہ لینے کی صورت میں حاصل ہوں تو دونوں کا حکم یکساں ہے ورنہ عام حالات میں یہ جائز نہیں۔

جوابات ضمیمہ سوال ۲،۱—:۴

اس صورت میں مالک زمین یا ملازم صرف اپنی واجبی رقم طلب کرتا ہے، اور عقد بیع یا اجارہ میں اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہوتی بلکہ حکومت اپنے قانون کی بنا پر مع سود ادا کرتی ہے تو اس کا لینا شرعاً جائز ہے، اس لئے کہ سود انہیں قرضوں میں ہوتا ہے جہاں ادائیگی معہ اضافہ مشروط ہو یہاں کوئی شرط نہیں ہے، اور شافعیہ کے نزدیک قرض کی ادائیگی بھی باضافہ سنت ہے لہذا زائد رقم لینا بالکل جائز ہے۔

۲ــ عقود کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب وقبول میں معنیً یکسانیت ہو، اگر متعاقدین کی نیتیں مختلف ہوں تو عقد نہیں ہوگا، لہذا اس طرح کا لینا جائز نہیں ہے۔ فتح المبین باب البیع کی ابتدا میں ہے:

"ویشرط ایضا أن یتوافقا معنیً لا لفظاً فلو قال بعتک بالف حالة فاجل او عکسه او مؤجله بشهر فزاد لم یصح للمخالفة"۔

★★★

مسائل ربوا

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ ☆

دونوں سوالناموں میں ضمنی سوالات کی پوری تفصیلی تحقیق سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے دارالاسلام و دارغیر اسلام کی پوری تشریح سامنے آجائے، اس کے بعد ضمنی نمبرات پر کلام کیا جائے۔

اس لئے ضمنی سوالات کی ترتیب بدل کر پہلے دارالاسلام و دارغیر اسلام پر اپنی بضاعۃ مزجات کے مطابق کچھ عرض ہے۔

اصل میں سارا عالم (موجودہ و آئندہ موجود ہونے والا سب) حسب ضابطہ فقہاء (الدار داران) دو دار میں منقسم ہے، اور عقلاً بھی سارا عالم دو دار میں منحصر ہوگا، ایک ''دار اسلام نی نی، دوسرا دارغیر اسلام نی نی۔

اس لئے کہ وہ دار و ملک جس میں اقتدار اعلی مسلمانوں کو حاصل ہو یعنی مسلمان اس میں اسلامی احکام و قوانین جاری کرنے میں اور سب پر لاگو کرنے میں آزاد ہوں اور اس پر قادر ہوں اور دوسرا دار (دارغیر اسلام) وہ دار و ملک جس میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو اس طرح حاصل نہ ہو کہ وہ اس میں اسلامی احکام و قوانین جاری و لاگو کرنے میں آزاد ہوں اور حسب منشاء خود اس پر قادر ہوں۔

خلاصہ: یہ ہوا کہ مطلق دار مقسم کے درجہ میں ہوا اور یہ دونوں دار (دار اسلام و دارغیر اسلام) اسی مقسم کی دو قسمیں ہوئیں، اور آپس میں متبائن و قسیم اور ایک دوسرے کے

مقابل ہوئیں اور ظاہر ہے کہ اسلام کا مقابل کفر ہے، لہٰذا دارالاسلام کا مقابل دارالکفر ہوگا۔

اور دارالکفر کی حصر عقلی کے اعتبار سے محض چار قسمیں نکلیں گی، اس لئے کہ دارالکفر کا محاربہ کسی دارالاسلام سے ہوگا یا نہیں، اگر محاربہ ہو تو وہ شرعاً دارالکفر و دارالمحاربہ شمار ہوگا اور اگر محاربہ نہ ہو تو پھر دو حال سے خالی نہیں یعنی یہ کہ دارالاسلام سے معاہدہ یا مصالحہ ہے یا نہیں، اگر ہے تو وہ شرعاً دارالمعاہدہ والمصالحۃ ہے، اور اگر معاہدہ یا مصالحہ نہیں ہے تو پھر دو حال سے خالی نہیں یعنی یہ کہ اس دارالکفر میں مسلمان امن وسکون سے ہیں یا نہیں، اگر امن وسکون سے ہیں تو وہ دارالکفر شرعاً دارالامن شمار ہوگا، اور اگر مسلمان وہاں امن وسکون سے نہیں ہیں تو پھر وہ دارالکفر والشر والفساد شمار ہوگا۔

الغرض دارالکفر کی حصر عقلی کے اعتبار سے یہ چار قسمیں (دارالمحاربہ، دارالمعاہدہ یا المصالحہ، دارالامن، دارالشر والفساد) نکلیں گی اور دارالکفر کی یہ چار قسمیں شخصی حکومت کے اعتبار سے ہیں۔

اگر حکومت شخصی نہ ہو جمہوری ہو تو اس کی تقسیم دوسرے اعتبار سے ہوگی اور وہ یہ کہ دارالکفر اور دارالاسلام کا جو مقسم (مطلق دار) ہے اس کی دو قسمیں ہوں گی:

ایک تو وہ جمہوری ملک جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو وہ ملک دارِ غیر اسلام بمعنی دارالکفر ہوگا، اور دارالکفر کی دوسری قسم دارالمعاہدہ میں عموماً داخل ہوگا، اس لئے کہ جمہوری ملکوں میں ملک کا ہر فرد اور ہر باشندہ بلا لحاظ مذہب ومسلک کے ایک معاہدہ کے تحت ہو کر اس معاہدہ کا پابند ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں ملک کا دستور کہتے ہیں، اور چونکہ وہ دستور اپنے ہی ہاتھوں کا بالوکالۃ و بالواسطہ یا بلاواسطہ براہ راست بنایا ہوا ہوتا ہے، اس لئے اس اعتبار سے ہر فرد اپنے کو بلا لحاظ مسلک ومذہب آزاد وحر بھی کہہ سکتا ہے۔

اور دستور کا تابع و پابند ہونے کی وجہ سے معاہد بھی کہہ سکتا ہے، لہٰذا سابق کی ساری اصطلاحات شرعیہ (حر وغلام یا ذمی ومستامن وغیرہ کسی کا مصداق) باقی نہ رہیں گی، اور ان کے احکام وہی ہو جائیں گے جو ایک معاہد کے ہوتے ہیں۔

الغرض یہ چاروں قسمیں دارالکفر کی ہیں، اور ان چاروں قسموں کے شرعا الگ الگ احکام ہیں جو عنقریب معلوم ہوں گے۔

اور فقہائے کرام جو ان چاروں قسموں کو صرف دارالحرب سے تعبیر کر دیتے ہیں وہ بہ اشارہ آیت کریمہ "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" (سورۂ بقرہ ۱۹۳:) تحریضا علی الجہاد وترغیبا لہ فرماتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اسی اشارہ کی بنیاد پر حضرات شوافع سارے عالم کو فقط ایک دار (دارالاسلام) فرماتے ہیں۔

بہر حال ان اطلاقات سے ان چاروں قسموں (دارالمحاربہ، دارالمصالحۃ، دارالامن، دارالشر والفساد) کے الگ الگ احکام میں شرعاً کوئی فرق نہیں پڑے گا، مثلاً دارالمحاربہ میں بہ زمانہ محاربہ اموال حربی شرعاً معصوم ومتقوم یا واجب الضمان شمار نہیں ہوتے، بلکہ مباح الاستعمال ہوتے ہیں، بشرطیکہ خداع صریح وغصب وظلم وغیرہ قبیح لعینہ اور حسن لعینہ کے خلاف کا ارتکاب نہ ہو۔

اور مثلاً دارالمعاہدہ والمسالمہ میں حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے اور معاہدہ ومسالمہ کی رعایت کرتے ہوئے تمام احکام شرعیہ انفرادی ہوں یا اجتماعی میں اتباع معاہدہ ومسالمہ کرنا واجب رہے گا اور اس کے خلاف کرنا درست نہ رہے گا۔

اور مثلاً دارالامن میں تمام احکام شرعیہ انفرادیہ ہوں یا اجتماعیہ ہوں واجب العمل رہیں گے، بشرطیکہ قانون امن یا قانون حکومت کے صریح خلاف نہ ہوں، اگر صریح خلاف ہو تو حکومت وقت سے اجازت لے کر عمل کریں گے۔

اور مثلاً دارالشر والفساد میں ان کے جان ومال کچھ بھی معصوم نہ ہوں گے، بلکہ حدود شرع کے مطابق مباح الاستعمال شمار ہوں گے، اور حسب استطاعت ان سے جہاد کرنا یا وہاں سے ہجرت کر جانا لازم رہے گا جبکہ مقام ہجرت کہیں ملے اور جب استطاعت جہاد نہ ہو یا مقام ہجرت کہیں میسر نہ ہو تو وہیں رہ کر صبر کرنا اور انابۃ الی اللہ اور اپنے اعمال واحوال اجتماعیہ وانفرادیہ میں رجوع الی اللہ کرنا لازم رہے گا۔

جیسا کہ اللہ تعالی کے قول میں اس طرف اشارہ ہے:"رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا" (سورۃ نساء ۷۵:)۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی میں بھی اس طرف اشارہ ہے، حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"إن الله تعالیٰ يقول أنا الله لا إله إلا أنا مالک الملوک و ملک الملوک قلوب الملوک في يدي وإن العباد إذا أطاعوني حولت قلوب ملوكهم عليهم بالرحمة والرأفة وإن العباد إذا عصوني حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشتغلوا أنفسكم بالدعاء على الملوک ولكن اشتغلوا أنفسكم بالذكر والتضرع كی أكفيكم" (مشکوۃ ۳۲۳)۔

دارالکفر (دارالحرب) کے ان چاروں قسموں کی مثال دیکھنا چاہیں تو دارالشر والفساد کی مثال مکہ مکرمہ ہجرت سے قبل بن سکتا ہے، اور حبشہ دارالامن کی مثال بن سکتا ہے، اس لئے کہ ان دو داروں کے لئے دارالاسلام کا وجود لازم نہیں ہے، بخلاف دار المعاہدہ و دارالمحاربہ کے کہ ان دونوں کے نام میں باب مفاعلہ مستعمل ہے، اور باب مفاعلہ میں فریقین کا دار ہونا خود بخود نکلتا ہے، اس لئے ان دونوں (دارالمعاہدہ والمحاربہ) کی مثالوں میں دارالاسلام کا وجود ماننا بھی لازم رہے گا، اور ان دونوں کی مثال صلح حدیبیہ سے لے کر جب تک صلح قائم تھی مکہ اور اطراف مکہ دارالمعاہدہ کی مثال بن سکتے ہیں، اور اس کے علاوہ عرب کا سارا علاقہ جن سے جہاد و محاربہ جاری تھا وہ سب دارالمحاربہ کی مثال بن سکتے ہیں۔

اور ان مثالوں کے ذریعہ سے ان سب کے احکام کا شرعاً الگ الگ ہونا بھی واضح ہوسکتا ہے، نیز کتب مذہب میں اکثر مصرح بھی ہیں، اور اکثر الگ الگ تفصیل کے ساتھ بیان شدہ بھی ہیں۔

دارالاسلام کی قسموں کا بیان:

یہاں سے یہ بات بھی سنتے چلئے کہ دار کی یہ چار قسمیں دارغیر اسلام بمعنی دارالکفر کی ہیں اور دارالاسلام کا شرعی اور اصلی حکم تو یہی ہے کہ دار اسلام سارے عالم کا ایک ہی ہونا چاہئے، جس طرح دور رسالت ﷺ سے دور عثمانی تک تھا پھر حضرت حسنؓ کے صلح کے بعد سارے اسلام کا واحد دارالاسلام عود کر آیا، یہ درمیان کا چار ساڑھے چار سال کا دور جس کو مشاجرات صحابہ کا دور بھی کہا جا تا سکتا ہے، یہ دور تو بلا شبہ دلائل شرعیہ کے اندر اور خالص اخلاص پر مبنی تھا اور خطاء اجتہادی سے آگے یہ خطاء نہیں گئی، اور اسی وجہ سے اس پر انگشت اعتراض اٹھانے کی بھی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ احادیث پاک میں وارد ہے:

"المجتهد قد يخطى و قد يصيب إذا أخطاء فله أجر و إذا أصاب فله أجران"

اور پھر یہ دور عبوری آیت کریمہ:

"وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا" (سورۂ حجرات ۹)۔

اور آیت کریمہ: **"إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوْا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ"** (سورۂ حجرات ۱۰)۔

کا مظہر ہو کر حضرت حسنؓ کی صلح پر حسب ارشاد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام ختم ہو جاتا ہے اور وہ ارشاد نبوی ہے:

"عن ابی بکر رضی اللہ عنہ قال رأيت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم على المنبر و الحسن بن على إلى جنبه و هو يقبل على الناس مرة و عليه أخرى و يقول إن ابنى هذا سيد و لعل الله أن يصلح به بين طائفتين عظيمتين من المسلمين" (راوہ البخاری، مشکوۃ/۵۶۹)۔

اور پھر صدیوں سارے عالم کا دارالاسلام دار واحد تھا پھر دارالاسلام کا تعدد جو شروع ہوا ہے ان تمام تعدد دار کے دور کو مثل مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دور کے مبنی بر

اخلاص وغیرہ نہیں کہا جاسکتا۔

اور اگر کسی اختلاف سلطنت کی ابتداء مبنی بر اخلاص رہی بھی ہو تو پورے دور اختلاف کو ہرگز مثل مشاجرات صحابہ کے مبنی پر اخلاص نہیں کہا جاسکتا ہے، بلکہ چونکہ دار الاسلام واحد کی نعمت خاص عطیہ خداوندی تھی جیسا کہ حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ملتا ہے اور سنت اللہ بھی جاری اس طرح ہے کہ:

"بِأَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" (سورۃ انفال ۵۳:)۔

اور اس طرح ہے: "**کما تکونوا یولی علیکم**" **وفی روایة "أعمالکم عما لکم**"۔

اس قسم کی آیات وروایات سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ تعدد دار اسلام عموماً اپنے شامت اعمال یا سوء اتفاق یا سوء فہمی یا سوء تدبیر سے ہوا ہے۔

بہر حال جب ہو گیا تو اس دار کی بھی دلیل حصری کے مطابق وہی چاروں قسمیں نکلیں گی جو دار غیر اسلام (دار الکفر) کی ہیں یعنی دار المحاربہ، دار الشر والفساد، دار لمعاہدہ اور دار الامن۔

اور ان دونوں دار (دار المعاہدہ و دار الامن) کے احکام تقریباً یکساں ہی ہوں گے، صرف معمولی اور ضمنی فرق ہوگا۔

البتہ دونوں کے دار المحاربہ اور دار الشر والفساد کے احکام میں بہت فرق ہوگا، مثلاً دار الکفر کے دار المحاربہ و دار الشر والفساد میں کسی کا مال معصوم ومتقوم و واجب الرد والضمان نہیں رہتا مگر دار الاسلام کی دونوں قسموں میں آپس کے عین محاربہ وفساد کی حالت میں بھی ہر فرد کا مال معصوم ومتقوم اور واجب الرد والضمان رہتا ہے۔

جیسا کہ حضرت علیؓ کے عمل (**وجعل سلاحه للذی جاء به . . .) حتی وضعت الحرب أو زارها رده علی صاحبه . . .**"۔

السیر سے نقل کرتے ہوئے قواعد الفقہ میں صراحت کی گئی ہے: "**مال المسلمین**

لا یصیر غنیمۃ بحال''۔

دونوں داروں کے احکام کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، صرف اشاروں پر اکتفا ہے، اور دارغیر الاسلام کے چاروں قسموں کے اموال اور ان سے متعلق احکام کی بقدر ضرورت تفصیل ان شاء اللہ آئے گی۔

ربوا کی تعریف اور اس کی شرعی حیثیت

ربوا کی شرعی تعریف : اموال ربویہ معصوم ومتقوم میں عقد معاوضہ کا معاملہ کیا جائے اور اس عقد میں کسی کی جانب کوئی شئی عوض سے خالی اور زائد ہوتو یہ زیادتی ئی ئی الفضل ربوانی نی میں داخل ہوکر شرعی ربوا (شرعی سود) کہلائے گی، اور اس عقد کا نام عقد ربوا کہلائے گا اور اس زیادتی کا لینا دینا دونوں حسب ضابطۂ شرع ممنوع وحرام رہے گا۔

اس تعریف میں جتنی قیدیں ہیں سب احترازی ہیں، پس اموال ربویہ سے مراد وہ اموال ہیں جن میں جنس وقدر میں اتحاد ہو اور معصوم ومتقوم سے مراد وہ اموال ہیں جن کا مالک کی اجازت کے بغیر لینا اور استعمال کرنا درست نہ ہو، جیسے دارالامن اور دارالاسلام کے ہر قسم کے جائز اموال اور دارالمعاہدہ کے وہ اموال جو معاہدہ کے تحت ہوں۔

بخلاف دارالمحاربہ اور دارالشر والفساد میں حربی اور شر وفساد والوں کا مال جو مباح الاستعمال ہوتا ہے اور معصوم ومتقوم واجب الضمان نہیں ہوتا۔

اور عقد معاوضہ سے مراد وہ عقد ہے جس میں اموال کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہو جیسا کہ عقد بیع وشراء میں اور شفعہ وہبہ بالعوض وغیرہ میں ہوتا ہے ۔

اور معاملہ کیا جائے سے مراد وہ اعمال ہیں جن میں طرفین میں یعنی دو شخصوں کے درمیان میں لینے دینے کا عمل کیا جائے۔

اس سے وہ اعمال نکل جائیں گے جن میں طرفین میں لینے دینے کا عمل نہ کیا جائے، بلکہ کوئی شخص خود اپنی مرضی وخوشی سے بلا لحاظ معاملہ بطور عطیہ یا تبرعاً کچھ دے دے جیسا کہ

ہدیئے میں ہوتا ہے، یا کوئی شخص صدقہ وخیرات کردے وغیرہ وغیرہ (بدائع الصنائع ۵/ ۱۹۲ تا ۲۱۴، اعلاء السنن ۱۴/ ۳۳۳ تا ۳۶۰)۔

یہیں سے کتب فقہ کی اس عبارت (**لا ربوا بین الحربی والمسلم المستامن فی دار الحرب** (**علی اختلاف العبارات**) کا مفہوم بھی واضح ہوگیا کہ ''الحربی'' اور ''المستامن'' میں الف لام عہد کا ہے، استغراق کا نہیں ہے اور اس سے صرف دار المحاربہ اور دار الشر والفساد کے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر قیود احترازیہ کہ ضمن میں ابھی گذرا ہے۔

آیت کریمہ : ''**الم غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ أَدْنَی الْأَرْضِ ...**'' (سورۂ روم ۲:) کے نزول کے بعد حضرت صدیقؓ کا بعض اہل مکہ سے مقامرہ کے قبیل کا معاملہ کر لینے سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، اس لئے کہ مکہ مکرمہ اس وقت بالیقین دار الشر والفساد تھا اور یہ واقعہ موضوع وغلط نہیں ہے، بلکہ صحیح وثابت ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر نکیر نہ کرنا بھی ثابت وصحیح ہے (اعلاء السنن)۔

پھر بھی چونکہ حرمت ربوا کا حکم بہت زیادہ تہدید آمیز ہے یہاں تک کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول جس کو صاحب تفسیر مدارک نے نقل کیا ہے، یہ ہے : ''**أخوف آیات القرآن عندی آیة الربا**'' نیز چونکہ حکم حرمت ربوا کے الفاظ عام ہیں، ائمہ ہدیٰ نے اس معاملہ میں بہت احتیاط برتی ہے اور فرماتے ہیں کہ ''**لا ربوا بین حربی الخ**'' کے حکم میں محض زیادتی لینے کی اجازت ہے، زیادتی دینے کی اجازت نہیں ہے، علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے : ''**فالظاهر أن الا باحة تفید المسلم الزیادة و قد التزم الأصحاب فی الدرس أن مرادهم من حل الربا و القمار ما إذا حصلت الزیادة للمسلم نظراً إلی العلة وإن کان اطلاق الجواب خلافه**''، اسی طرح عام کتب فقہ میں ہے۔

رہ گیا سود دینا تو اس کا حکم آگے سوال (۲) کے ضمن میں آئے گا۔

جوابات ضمیمہ سوال: ۲

۱، ۲، ۳ — ان تینوں نمبروں کا جواب تفصیل سے سوال نمبر ۱ اور تمہید میں گذر چکا ہے، یہاں ان سب کا اعادہ بے سود ہوگا۔

البتہ بعض زائد باتیں جو سوالنامہ میں ضمناً آ گئی ہیں ان پر حسب ضرورت گفتگو ہوگی۔

ربوا کی شرعی حیثیت وحقیقت ربوا کی شرعی تعریف کے ضمن میں آچکی ہے اور اس کا دائرہ عمل واثر دارالحرب کی چاروں قسموں میں سے صرف دو قسموں (دارالامن اور دارلمعاہدہ) کو اور دارالاسلام کی تمام قسموں کو عام وشامل ہے، ان سب میں ربوا کا لینا دینا سب حرام رہے گا، باقی دارالحرب کی دو قسموں (دارالمحاربہ، دارالشر والفساد) میں اس کا حکم جاری نہیں ہوتا۔

اور بعض معاملات جو دیکھنے میں ربوا معلوم ہوتے ہیں مگر تنقیح کے بعد ان کی حقیقت ربوا کے بجائے کچھ اور نکلتی ہے، اس لئے ان کا حکم بھی ربوا کے حکم علاوہ کچھ اور نکل سکتا ہے، البتہ چونکہ شریعت مطہرہ نے ربوا والریبہ ہر ایک سے روکا ہے، اس لئے ان کا حکم اخذ کرنے میں غایت احتیاط اور نہایت بیدار مغزی سے کام لینا ہوگا اور پورے اصول شرع پر حاوی ہو کر ہی ان کا حکم اخذ ہوسکتا ہے، بلکہ اصول شرع پر مع جمع وفرق کے پوری طرح حاوی ہونے کے بعد اور جزئیات فقہیہ پر فی الجملہ حاوی ہونے کے بعد سارے عالم کے ہر خطہ وملک کے ہر معاملہ کا حکم شرعی جواز وعدم جواز کا برابر نکل سکتا ہے

قرآن کریم کی یہ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے: ’’**اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْإِسْلاَمَ دِیْنًا**‘‘ (سورۂ مائدہ ۳:)۔

مثلاً ہندوستان اور ہندوستان جیسا ہر ملک جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور عوامی جمہوری حکومت قائم ہو، وہاں کا ہر فرد بلا لحاظ مذہب وملت حکومت کے ساتھ معاہد کی حیثیت میں ہوتا ہے اور وہ ملک دارالحرب کی ایک خاص قسم (دارالمعاہدہ) کے درجہ میں شمار ہوتا ہے

☆ شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ یوپی

اور وہاں کے احکام حدود شرع میں رہتے ہوئے جو معاہدہ کے مطابق ہوں جاری ہوتے ہیں۔

اور اسی اصل کے تحت وہاں کے سرکاری بینکوں کے ذریعہ کاروبار کرنے اور حکومت کی ترقیاتی و اقتصادی اسکیموں میں شریک ہونے اور ان اسکیموں کے تحت قرضہ لینے سے متعلق شرعی احکام بھی مستنبط ہوتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل اگلے نمبروں کے جوابوں کے تحت انشاء اللہ آجائے گی۔

۴، ۱۰ — بینک دو طرح کے ہوتے ہیں جیسا کہ سوال ۱۰ میں مذکور ہے، ان کے احکام یہ ہیں کہ جو بینک غیر سرکاری ہوں یعنی اس کے مالک افراد یا اشخاص یا سوسائٹی ہو تو اس میں جمع کردہ روپیہ پر جو رقم سود کے نام سے ملے اس کو وہاں سے نکال کر اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو جو مستحق زکوۃ ہوں ان کو بطور تصدق دیدے اور خود اپنے کسی کام میں نہ لائے اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے۔

اور جو بینک سرکاری اور گورنمنٹ کے ہوں ان بینکوں میں جمع شدہ رقم پر جو پیسہ سود کے نام سے ملے اس کو بھی بینک میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر دیکھے، اگر اپنے اوپر سرکار و گورنمنٹ کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو رہا ہو تو وہ رقم پہلے اس میں دے تاکہ رد الی رب المال ہو جائے پھر جو رقم بچے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو جو مستحق زکوۃ ہوں ان کو بطور تصدق دے کر اپنے ملک سے نکال دے اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے، کیونکہ ایسے مال کے تصدق کرنے میں ثواب کی نیت کرنے کو محققین فقہاء کفر تک فرماتے ہیں۔

اس حکم کے دلائل: حرام مال کے بارے میں جو احکام کتب فقہ میں اور بذل المجہود (۱/ ۳۷) میں مذکور ہیں وہ کافی ہیں، اور مزید تحقیق و تفصیل اگر مطلوب ہو تو اعلاء السنن (جلد ۱۴) وغیرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

اور سرکاری بینکوں اور غیر سرکاری بینکوں سے سود کے نام پر ملنے والی رقوم میں ایک

فرق تو یہی ہے جو ابھی مذکور ہوا، باقی اور فرق تو ہر واقعہ جزئیہ کی صورت سامنے ہونے کے بعد ہی واضح ہوسکتا ہے اور احقر کے بہت سے فتاوی اس قسم کے جزئی واقعات پر شائع بھی ہو چکے ہیں، ان سے بھی ان فروق پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

۵ — سود (ربوا) کی شرعی تعریف صادق آجانے کے بعد لینا دینا دونوں حرام ہوجائے گا، اور ساری دنیا کے غیر ربوا کہنے سے غیر ربوا (غیر سود) نہ کہا جائے گا۔

اسی طرح جب ربوا کی شرعی تعریف صادق نہ آئے تو اس کو حرام کہنا یا ربوا کہنا درست وجائز نہ رہے گا، بلکہ اس کا لینا دینا دونوں درست رہے گا، اسلامی ملک ہو یا غیر اسلامی ملک، ہر جگہ یہی حکم ہوگا، اس میں کوئی فرق نہ پڑے گا، البتہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر سود معلوم ہوتے ہیں مگر تنقیح کے بعد اس کی حقیقت کچھ اور نکلتی ہے، اس کے اندر یہ حکم جاری نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لینے دینے میں فرق پڑ سکتا ہے جیسا کہ سوال ۱ تا ۲ کے تحت کچھ تفصیل گذر چکی ہے۔

۶ — سودی قرض لینے کی شریعت مطہرہ نے صرف اس وقت اجازت دی ہے جبکہ بغیر قرض لئے کام نہ چلے اور غیر سودی قرض نہ ملے، اور بغیر اس قرض کو لئے ہوئے نا قابل تحمل و برداشت تکلیف کا سامنا ہو، معیشت باقی نہ رہے یا کاروبار معطل ہوجائے تو بوجہ مجبوری اور بقدر مجبوری سودی قرض لے لینے کی گنجائش ہوجائے گی جیسا کہ ''الاشباہ والنظائر فنی کے اس جزئیہ ''**یجوز للمحتاج للإستقراض بالربح**'' سے اور اس کی شرح حموی سے معلوم ہوتا ہے، البتہ ایسا قرض جہاں تک ہوسکے اس سے بچنا ہی چاہئے۔

۷ — حکومت کے ترقیاتی اسکیموں میں اقتصادیات کی بحالی سے منصوبوں میں مسلمانوں کو بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے برابر شریک ہونا چاہئے، جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے: ''**وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ**'' (سورۃ انفال ۶۰) اس آیت کریمہ سے اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

پس اسی نیت سے حدودِ شرع میں رہتے ہوئے شرکت کی جائے، رہ گئی یہ بات کہ اس سلسلہ میں حکومت جو قرض لوگوں کو دیتی ہے تو اس قرض میں ہمیشہ سود ہونا شرعاً لازم نہیں آتا بلکہ اس میں تفصیل ہے، اس لئے اس کے لینے دینے کے جواز و عدم جواز میں بھی تفصیل ہوگی، اور ہر جزئی کا حکم تنقیح کے بعد واضح ہوگا، اور اسی تنقیح کے مطابق جواز و عدم جواز کا جو حکم نکلے گا صحیح ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح نہیں ہوگا بلکہ اس سے کچھ مختلف ہوگا، مثلاً کبھی بے روزگاروں کو باروزگار بنانے کے لئے حکومت کچھ رقم قرض دیتی ہے اور اس میں کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے مثلاً چھتیس ۳۶ ہزار قرض دے کر ایک چوتھائی نو ہزار چھوٹ دے کر صرف ستائیس ۲۷ ہزار قرض تسلیم کر کے ادائیگی شروع کرنے کے لئے مزید پانچ سال یا جو مدت مناسب ہوتی ہے اس کی مہلت دیتی ہے، پھر اس مدت کے ختم ہونے کے بعد اسی ستائیس ہزار پر کچھ سود کے نام سے زیادتی کر کے باقساط وصول کرتی ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک یہ کل ادائیگی کل یافتنی رقم (۳۶ ہزار) کے اندر اندر رہے گی وہ شرعاً سود شمار نہ ہوگی اور کسی غیر مسلم خواہ حکومت ہی کیوں نہ ہو اس کے سود کہنے سے اس کا سود ہونا لازم نہ آئے گا، اگر ۳۶ ہزار کی رقم پوری ہونے سے قبل ہی حسب مطالبہ حکومت ادائیگی مکمل ہو جائے گی تو ۳۶ ہزار میں سے باقی ماندہ رقم تبرع شمار ہو جانے کی وجہ سے سود لینا بھی لازم نہیں آئے گا۔

اور مثلاً حکومت نے تعمیر کے لئے یا کاروبار وغیرہ کے لئے کوئی رقم یا کوئی سامان خود دیا یا کسی کارخانہ وغیرہ سے سستے داموں سے دلا کر خود اس کی قیمت اپنے خزانہ سے ادا کیا، مگر جس کام کے لئے دیا اس کی نگرانی کے لئے ایک عملہ مقرر کیا جو وقتاً فوقتاً نگرانی کرتا ہے کہ رقم اپنے کام میں صحیح طریقہ سے خرچ بھی ہوتی ہے یا نہیں نیز حسب ضرورت وہ عملہ مشورے بھی دیتا ہے کہ اس کام میں اس طرح خرچ کرو، نیز انہیں مصلحتوں سے کہ رقم ضائع نہ ہو حکومت بیک مشت

ساری رقم نہیں دیتی بلکہ کام کا معائنہ کرنے کے بعد باقساط دیتی ہے تو اس صورت میں اپنی دی ہوئی رقم سے کچھ زائد رقم اگرچہ سود کے نام سے وصول کرے مگر اس زیادتی کا کسی غیر مسلم حکومت یا فرد کے سود کہہ دینے سے شرعاً سود ہونا لازم نہ آئے گا، جب تک کہ سود کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے، جیسا کہ ہم تمہید میں کہہ آئے ہیں، اس لئے کہ سود شرعی لفظ ہے اور اس کا ایک شرعی معنی ہے، نیز اس لئے کہ قول راجح ومحقق میں کوئی غیر مسلم ان احکام کا مکلف ہی نہیں ہے کہ اس کے سود کہہ دینے سے اس کا سود ہونا لازم آجائے۔

بلکہ اصل دی ہوئی رقم پر ان تمام زیادتیوں کو شرعی تاویل سے اس عملہ کی اجرت وفیس بھی قرار دے سکتے ہیں، اور اس زائد رقم کی وصولی کو ایک طریقہ ادائیگی اجرت قرار دے سکتے ہیں۔

ترقیاتی اسکیموں سے ملی ہوئی رقوم پر سود دینے کے جواز کے لئے یہ استدلال (کہ جمہوری حکومت کے خزانہ عامہ کی مالک) صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ملک کی اکائیوں کو صرف استحقاق ملک ہوتا ہے، تحقق ملک نہیں ہوتا، استحقاق ملک اور چیز ہے اور تحقق ملک اور چیز ہے، دونوں میں بون بعید ہے اور بڑا فرق ہے، اس کو اس طرح دیکھئے کہ زکوۃ وفطرہ اور رقوم واجب التصدق غربا ومساکین کے لئے ہی ہوتی ہیں اور وہی لوگ اس کے مستحق ہوتے ہیں، مگر جب تک مالک نصاب (منتظمین) ان مستحقین کو دیں نہ دیں وہ مستحقین ملک اس دی ہوئی رقم کے مالک شمار نہیں ہوتے۔

پس معلوم ہو گیا کہ استحقاق ملک دوسری چیز ہے اور تحقق ملک دوسری چیز ہے، اور دونوں کے احکام بھی الگ الگ ہیں، اس لئے یہ قیاس صحیح نہ ہوگا، اور اس پر یہ حکم متفرع نہ ہوگا۔

اسی طرح رشوت دینے پر بھی اس دینے کو قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ رشوت تو اپنے حق متحقق ومشخص کو حاصل کرنے سے مجبور ہونے کی صورت میں اور مانگنے اور طلب کرنے پر بھی نہ ملنے کی مجبوری میں دینے کی اجازت ہوتی ہے، اور بغیر اس مجبوری کے دینے کی اجازت نہیں

ہوتی۔

۸— ہاں اگر چھوٹ کا تناسب اس رقم کے مساوی ہے جس کو محکمہ سود کے نام سے لیتا ہے تو اس پر شرعاً سود دینے کا اطلاق نہ ہوگا، اور یہ جائز رہے گا جیسا کہ حوالہ ۷ کے ضمن میں اور تمہید میں گذر چکا ہے۔

۹— جن مجبوریوں میں سودی قرض لینے کی اجازت ہے انہیں مجبوریوں میں سود دینے کی بھی اجازت ہے، اس لئے کہ سودی قرض کی ممانعت کی وجہ وہی سود دینا ہی ہے اور اس کی گفتگو جواب ۶ میں گذر چکی ہے۔

اور جن مجبوریوں میں اپنے ملک کے اندر سود دینے کی گنجائش ہے، اس سے زیادہ مجبوری غیر ممالک سے بذریعہ تجارت سود دینے میں ہے، اس لئے کہ اگر سود دینے سے بچنے کے لئے غیر ممالک سے تجارت کرنا ہی بند کر دیا جائے تو پوری قوم مسلم فی زمانہ مفلوج و معطل ہو کر رہ جائے گی اور آیت کریمہ ''**واعدوا لهم ما استطعتم**'' کے بھی خلاف ہو جائے گا، اس لئے اس کی اجازت رہے گی۔

علاوہ ازیں فی زمانہ غیر ممالک سے کاروبار و تجارت کرنے میں پوری قوم مسلم اپنی معیشت کو برقرار رکھنے کے لئے مضطر ہے۔

اور اضطرار دو قسم کا ہوتا ہے: ایک اضطرار انفرادی و شخصی، اور ایک اضطرار اجتماعی و قومی، پس جس طرح ''**ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**'' اضطرار شخصی و انفرادی میں سودی قرض لے کر سود دینے یا اسی طرح اضطرار اجتماعی و قومی میں بھی سودی قرض لینے یا سود دینے یا سودی معاملہ بوجہ اضطرار کرنے کی گنجائش رہے گی۔

رہ گیا سود ملنے یا لینے کی گنجائش کا معاملہ، اس کا حکم تو سوال ۱ میں ''**لا ربوا بین الحربی والمسلم**'' کے تحت مفصل و مدلل گذر چکا ہے کہ اس کی گنجائش رہے گی۔

۱۰— اس نمبر کا جواب جواب ۴ کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

۱۱— ان افراد یا کمپنیوں سے ایسا معاملہ یا کاروبار کرنا جس میں سود دینا پڑے بغیر ایسی مجبوری کے گنجائش نہیں ہوگی کہ بغیر اس معاملہ یا کاروبار کے معیشت باقی نہ رکھ سکے جیسا کہ جواب(٦) وتمہید کے ضمن میں بدلائل اس کا بیان گذر چکا ہے۔

ہاں ایسی مذکورہ شدید مجبوریوں کے اگر معاملہ یا کاروبار کرے تو حکم میں یہ تفصیل ہوگی: اگر وہ افراد یا کمپنیاں محض مسلمانوں کی ہوں تو جس قدر رقم سود کی ملے اس کو کسی نہ کسی طرح عیاناً واپس کردے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو یا مضر ہونے کا اندیشہ ہو تو کسی حیلہ سے خواہ مخفی طور پر ہو ان کی ملک میں پہنچادے۔

اور اگر وہ افراد یا کمپنیاں محض مسلمانوں کی نہ ہوں تو جس قدر رقم سود کی ملے اس کو واپس نہ کرے بلکہ اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء ومساکین کو جلد سے جلد دے کر اپنی ملک سے نکال دے۔

یا پھر ان افراد یا کمپنیوں سے شرکت عنان کا معاملہ کر کے کاروبار کرے، تو اس صورت میں سود لینے وغیرہ کا قصہ آنا لازم نہ رہے گا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے اپنے فتاوی ''التحقیق السنی فی حصص کمپنی'' میں اس کی تحقیق پیش کی ہے۔

پھر اگر بینکوں سے سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے میں مذکورہ پریشانیاں پیش آتی ہوں تو اپنی صوابدید سے مذکورہ تفصیل کے ساتھ ان افراد وغیرہ سے بھی سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے میں مضائقہ نہ ہوگا۔

ضمیمہ ۲ سے متعلق جوابات:

۱— اگر حصول اراضی قانون کے مطابق حکومت جب چاہتی ہے کسی بھی جائداد غیر منقولہ کو مفاد عامہ کے تحت ان کے مالکوں کی مرضی کے بغیر خود اس کی ایک قیمت مقرر کر کے اپنے

قبضہ میں کرلیتی ہے، ہاں اتنی مہربانی کرتی ہے کہ اگر مالکوں کے نزدیک وہ قیمت کم ہوتو عدالت سے قیمت تشخیص کرالیں، لیکن دینے میں مالکان مجبور ہی ہوتے ہیں انکار نہیں کرسکتے۔

پھر اگر عدالت اس کی قیمت کچھ زیادہ تشخیص کردے جب بھی مالکان دینے سے انکار نہیں کرسکتے، اس فیصلۂ عدالت کے مطابق قیمت لینے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اگرچہ اس فیصلہ میں جو دو تین سال کی تاخیر ہوجائے اور حکومت اس تاخیر کی وجہ سے کچھ رقم بنام سود دے جب بھی ظاہر ہے کہ مالکان جائداد کی مرضی کو اس معاملہ میں دخل نہیں ہوتا تو اس زائد رقم دینے پر سود کی شرعی تعریف صادق نہیں آسکتی جیسا کہ تمہید میں سود کی شرعی تعریف سے واضح ہے، بلکہ یہ زائد دینا منجانب حکومت عطیہ کے حکم میں ہوگا، اور چھ فیصد یا کسی بھی فیصد سے دے یہ دینا عطیہ دینے کا ایک قانون ونظم قرار پائے گا، لہذا اس زیادتی کا لینا اصلی قیمت کے لینے کی طرح جائز اور مباح رہے گا۔

لہذا ضمیمہ کے اس نمبر میں جتنی تاویلیں مذکور ہیں ان میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

۲— اس نمبر کے اندر ذکر کردہ تاویلات کی قطعاً حاجت نہیں ہے، بلکہ سوالنامہ ۲ میں ذکر کردہ تاویل کے مطابق اس زیادتی کو عملہ کی اجرت قرار دیا جائے گا اور اس کا دینا جائز گردانا جائے گا۔

۳— جب یہ کارپوریشن تجارتی ادارہ ہے اور حصص فروخت کرکے اکٹھا شدہ سرمایہ سے اور مشترک سرمایہ سے اپنا کاروبار کرتا ہے تو یہ معاملہ اور کاروبار شرکت عنان کے قبیل کا ہوگیا، اور سال ختم ہونے پر سال بھر کے نفع ونقصان کا میزانیہ تیار کرنا یہ بھی اس کاروبار کے شرکت عنان ہونے کا قرینہ ہے۔

لہذا یہ کاروبار عقد مضاربہ کے قبیل کا ہوگا ہی نہیں، پس اس کو عقد مضاربہ قرار دینا یا عقد مضاربہ کی قبیل میں داخل کرکے شریک وغیرہ ہونا مبنی بر غلط ہوگا، اور فرق بین العقود سے

ناواقفیت کی وجہ سے ہوگا، بلکہ اس کا حکم وہی ہوگا جو مبنی برشرکت کمپنیوں کا ہوتا ہے جس کی جانب احقر سوالنامہ(۱) وغیرہ میں "التحقیق السنی فی حصص کمپنی نی نی کے حوالہ سے اشارہ کر چکا ہے۔

اور مبنی برشرکت کمپنیوں میں جس طرح حصہ ونفع لینا جائز ہے اسی طرح اس میں بھی حصہ اور نفع لینا جائز رہے گا۔

۴— فوجی محمد یونس کو حکومت جو زائد رقم چھ فیصد کے حساب سے دیتی ہے اس کو حکومت بطور خود دیتی ہے، اس دینے میں محمد یونس سے کوئی معاملہ نہیں کرتی، محمد یونس کا مطالبہ تو صرف اس رقم کا تھا جو حکومت پر اس کے ضابطہ کے مطابق واجب الادا تھی، اور وہ وصول نہیں ہو رہی تھی۔

لہذا اس زاید حاصل شدہ رقم پر سود کی شرعی تعریف نہیں صادق آتی، سود کی شرعی تعریف جو تمہید میں بیان ہو چکی ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔

اس لئے اس زاید رقم کو ضمیمہ(۱) کے اندر زاید ملی ہوئی رقم کی طرح شرعاً عطیہ کہیں گے اور جائز وحلال کہیں گے۔

اگر کسی اسلامی حکومت میں اس طرح کا معاملہ پیش آئے، اور قاضی ایسی زاید رقم سود کے نام سے دے دے تو شرعاً وہ زاید رقم عطیہ ہی شمار ہو کر جائز الاخذ والاستعمال ہوگی، اور یہ تعبیر (بہ نام سود) اس قاضی کے شرعی علوم سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوگی۔

☆☆☆

ربوا کی شرعی حقیقت

مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی ☆

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں : ''قرآن حکیم میں جس چیز کو بلفظ''ربا''حرام قرار دیا گیا ہے اس کا ترجمہ اردو زبان میں تنگ دامنی کے باعث عام طور سے لفظ''سود''کیا گیا ہے جس کی وجہ سے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ''ربا''اور سود دونوں عربی اور اردو میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔لیکن حقیقۃً یہ نہیں، مروجہ سود عربی ربا کی ایک قسم یا فرد کی حیثیت میں ہے، مروجہ سود ایک معین مقدار روپیہ متعین معیاد کے لئے ادھار دے کر معین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینے کا نام ہے، بلا شبہ یہ بھی ربا کی تعریف میں داخل ہے مگر ربا اس میں منحصر نہیں ہے، زمانہ جاہلیت میں عموماً ربوا صرف اس کو کہتے تھے اور سمجھتے جسے آج سود کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ربا کے معنی کی وسعت بیان کر کے بہت سی ایسی صورتوں کو بھی ربا قرار دیا ہے جن میں ادھار کا معاملہ نہیں ہے، آپ نے آیات کی تشریح کرتے ہوئے ربا کے جو معنی بیان کئے ان میں ایک قسم کا اضافہ تھا جس کو پہلے سے عرب میں ربا کے اندر داخل نہ سمجھا جاتا تھا، اسی لئے عام طور سے علماء نے لکھا ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں'' (مسئلہ سود ص ر ۱۳-۱۵)۔

ہمارے فقہاء نے ربا شرعی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

''هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه'' (ہدایہ ۳ر ۷۰، مجمع الانہر ۲ر ۸۳، عنایۃ علی ہامش الفتح ۵ر ۲۷۴، احکام الجصاص ار ۵۵۱)۔

اسی سے ملتے جلتے الفاظ دوسری کتابوں میں بھی ہیں، اسی کے قریب الفاظ احکام

القرآن لابن العربی، احکام القرآن للجصاص، نہایہ، ابن اثیر وغیرہ میں بھی ہیں۔

حاصل یہ نکلتا ہے کہ سود کی شرعی حقیقت ’’آپس میں ہونے والے مالی لین دین کے معاملات میں ایک طرف سے پیش کیا جانے والا مال کا وہ حصہ جس کے مقابلہ میں دوسری طرف سے مال کا کوئی حصہ نہ ہو اور یہ قدرزائد معاملہ میں مشروط بھی ہونی نی۔

یعنی رباشرعی کے تحقق کے لئے چند امور ضروری ہیں:

اول : باہمی معاملہ جانبین سے مال کا ہو، یعنی ایسی صورت نہیں کہ جس میں ایک طرف سے مال دیا جانے والا ہو جیسے کرایہ وغیرہ کا معاملہ بلکہ اس کے لئے خرید وفروخت کا معاملہ یا قرض کا معاملہ درکار ہے کہ ان دونوں میں دونوں طرف سے مال کا لین دین ہوتا ہے۔

دوم : معاملہ میں ایک طرف سے پیش کیا جانے والا مال دوسری جانب کی مقدار سے زائد ہو کہ اس کے مقابلہ میں مال کا کوئی حصہ نہ ہو حقیقۃ وحساً یا حکماً سہی جیسے کہ فقہاء سونے چاندی وغیرہ کی باہمی ادھار فروخت میں مانتے ہیں۔

سوم : ایک طرف سے پیش کی جانے والی زائد مقدار کی معاملہ کی گفتگو میں شرط ہوئی ہو، اس لئے اگر ایک آدمی نے دوسرے سے سو روپے قرض کا معاملہ کیا تو دوسری طرف سے بھی اسے واپسی میں سو روپیہ ملے گا۔ اب واپسی میں اگر سو روپے کے ساتھ دس بڑھا دیئے گئے تو ایک طرف کا مال دوسرے طرف کے مال سے زائد ہے کہ اس کے مقابلہ میں سو کے آگے کچھ نہیں ہے، اب اگر یہ دس زائد کی باہم شرط ہوئی ہو تو یہ دس ربا وسود ہے، ورنہ اگر پہلے نے دوسرے کو ہبۃً مثلاً کسی وقت سو روپئے دیئے، دوسرے نے کسی دوسرے وقت جواب میں اس کو دوسو روپئے دیئے یا قرض ادا کرنے والے نے بوقت ادائیگی بغیر سابقہ شرط کے سو کے سوا سو کر دیئے تو پہلے کی طرف سے دیئے جانے والے مال پر ملنے والی زائد مقدار سود نہیں کہلائے گی۔

اس تفصیل کے مطابق حکومت کے مروج ’’رعایتی قرض نی نی جس میں قرضدار سے

ایک حصہ کی معافی کے بعد باقی کی واپسی مطلوب ہوتی ہے، اس تفصیل کے ساتھ کہ اگر متعینہ مدت تک باقی رقم ادا کر دے تو معافی سے فائدہ اٹھائے گا ورنہ پھر باقی پر اضافہ ہوتا رہے گا، یہ قرضے بظاہر اس وقت تک ''سودنی نی کی حد میں نہیں داخل ہوں گے جب تک کہ قرضدار کی طرف سے واپس کی جانے والی رقم اصل لی ہوئی رقم سے زیادہ نہ ہو، چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب اعظمی نے متعدد فتاویٰ میں اسی بنیاد پر ایسے قرض کی اجازت دی ہے (نظام الفتاوی ۱/ ۱۵۵، ۲۶۹)۔

شرائط ربوا:

صاحب بدائع نے ربا کے پائے جانے کی جو شرائط ذکر کی ہیں ان میں دو شرطیں یہ ذکر کی ہیں: نمبر ا بدلین کا معصوم ہونا۔ نمبر ۲ متقوم ہونا (بدائع ۵/ ۱۹۲)۔

اول کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ کرنے والے دونوں اشخاص کی طرف سے مال معصوم ہونا چاہیے، یعنی ایسا کہ ایک دوسرے کو بغیر دوسرے کی رضا کے اس کے لینے کا حق نہ ہو، اور دوم کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اس کی حیثیت کو یوں تسلیم کرتی ہو کہ اس کے ضائع کر دینے پر ضمان واجب کرتی ہو۔

اول کے مفقود ہونے کی وجہ سے دارالحرب کے کافر اور مسلمان کے درمیان سود کا اعتبار نہیں اور سودی معاملہ کا جواز ہے، اس لئے کہ حربی کا مال مسلمان کے حق میں ''مباح نی نی ہے، جس طرح چاہے وہ اس پر قبضہ کر سکتا ہے حتی کہ اس کی رضا کے بغیر بھی اور چوری کر کے بھی۔

اور دوسری شرط پر یہ صورت متفرع ہے کہ اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں ہی اسلام لانے والے (سابق کافر حربی) سے سودی معاملہ کرے تو درست ہے، اس لئے کہ اس نومسلم کا

مال (متقوم) یعنی قابل ضمان نہیں ہوتا، خود اس کی جان چلی جانے پر ضمان نہیں ہے۔

یہ جزئیات فقہ حنفی کی کتابوں میں عموماً مذکور ہیں اور نہ صرف سود کا معاملہ بلکہ مختلف فاسد معاملات بھی روا ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ جزئیات اور ان کے اصول وشرائط طرفین کے مشہور قول پر مبنی ہیں کہ دارالحرب کے باشندوں کے معاملات میں ربا کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اگرچہ پہلی ہی صورت ان دونوں کے نزدیک درست ہے، دوسری وتیسری تو صرف امام صاحب کے نزدیک درست ہے۔

اس لئے اس شق وسوال کا جواب دراصل حضرات طرفین کے قول کی تحقیق پر مبنی ہے۔

دارالحرب میں جواز سود سے متعلق طرفین کا قول:

احقر نے کسی زمانے میں اس سلسلہ میں ایک مبسوط تحریر تیار کی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے:

اولاً: یہ کہ حضرات طرفین کا یہ قول اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے، بلکہ اکابر نے اس کی توجیہ فرمائی ہے، حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ مطلب صرف یہ ہے کہ امام المسلمین ایسے شخص سے تعرض نہ کرے گا، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ جواز کے لئے دارالاسلام میں منتقل کر کے لے جانا ضروری ہے، یا پھر یہ کہ نفس معاملہ جائز نہیں، ہاں حاصل کردہ مال مباح ہوگا، اگرچہ حضرت تھانویؒ نے ان ساری توجیہات کو ذکر کرنے کے ساتھ رد بھی فرمایا ہے (دیکھئے: تحذیر الاخوان، رافع الضنک، امداد الفتاوی، محمودیہ میں بھی ایسی توجیہات کا ذکر ہے ۲۳۹،۲۳۸/۴)۔

ثانیاً: اگر اس کو ظاہر پر رکھا جائے تو تحقیق مسائل کا جو قاعدہ ہے حتی کہ خود حنفی اصول

افتاء کے مطابق صورت یہ ہے کہ ایک طرف فقہاء و مجتہدین کا سواد اعظم، دلائل کی قطعیت اور قوت وصراحت ہے، سود سے متعلق وعیدیں، آخرت کی سزائیں حتی کہ ذمیوں کے لئے بھی ممانعت ہے، دوسری طرف حضرات طرفین اور بعض تابعین اور دلائل حرمت کی حیثیت کے نہیں، یوں بھی مسئلہ حلت وحرمت کا ہے، اور معروف قاعدہ ہے کہ مبیح ومحرم اور حلت وحرمت کے درمیان تعارض کی صورت میں بر بناء احتیاط سہی محرم وحرمت کی ترجیح دی جاتی ہے۔

اسی لئے اگرچہ یہ مسئلہ فقہ حنفی کے اصل متون میں جواز کی تعبیر واسلوب میں ہی ذکر کیا گیا ہے، بلکہ صاحب مبسوط وصاحب بدائع وغیرہ کی توجیہات وتفصیلات بھی اسی کے مطابق ہیں، مگر اکابر علماء دیوبند کا عام میلان یا آخری میلان عدم جواز وحرمت کی طرف ہی رہا ہے، حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب اور آخر میں استاذی مفتی محمود حسن صاحب، مفتی نظام الدین صاحب، مفتی عبد الرحیم صاحب وغیرہ سب نے انہیں وجوہ کی بنا پر حرمت کے قول کو اختیار کیا ہے (فتاوی رشیدیہ/ ۵۰۵ ، امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۱۳، عزیز الفتاویٰ ۷، ۸/ ۳۰/ ۳۶، فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۲۳۹/ ۳۴۰، نظام الفتاوی ۱/ ۲۵۶ و ۲۹۶، فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۷۴)۔

جواز کے سلسلہ میں شاہ عبد العزیز صاحب کا نیز قاضی ثناء اللہ صاحب کا فتوی معروف ہے (فتاویٰ عزیزیہ/ ۵۸۱ تا ۵۸۶)، مولانا عبد الحئی صاحب بھی اسی رائے پر ہیں (مجموعۃ الفتاویٰ ۲/ ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۲)، حضرت گنگوہی کے متعلق مشافہۃً ایسا سنا ہے، تحریر میں نہیں ملا، صاحب اعلاء السنن مولانا ظفر احمد کا رجحان بھی اسی طرف ہے، اگرچہ مولانا کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے روایۃ ودرایۃ طرفین کے مذہب کو قوی قرار وثابت کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ احوط اکابر کی ہی رائے ہے، پھر ہندوستان کے حق میں تو وہ جواز کے قائل نہیں، اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہند اگر دار الحرب ہے تو صاحبین کے قول پر اور جواز ہے امام صاحب کے نزدیک یہ تلفیق ہے جو کہ ممنوع ہے (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۶۹ و ۳۷۰)، مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کا ایک مبسوط

اور پرزور مضمون اس کے جواز پر ہے (مضمون کیلانی شامل سود از مودودی ترتیب جدید) اور اخیر میں مکرمی مولانا اسحق صاحب سندیلوی سابق مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء نے اس مسئلہ کے مجتہد فیہ ہونے کی وجہ سے گنجائش کا ذکر کیا ہے، جیسے کہ مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے قیام مظاہر علوم وغیرہ کے زمانے کے فتاویٰ میں بھی آیا ہے (فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۱۹۸)۔

اگرچہ میں نے اوپر جس رائے کا ذکر کیا ہے وہ قیام دار العلوم کے عہد کے فتوی سے ماخوذ ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ''سود کا جائز ہونا جی کو نہیں لگتا، دوسرے اگر ہو بھی سہی تو اجازت میں عوام کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے، کیونکہ ان میں قیاس فاسد کا مادہ بہت ہوتا ہے، کیا عجب ہے کہ تھوڑے دن میں یہ قیاس کرنے لگیں کہ زنا بھی کافر سے جائز ہے، اس طرح سے کہ اول مقدمہ تو یہ ہو کہ سود اور زنا میں فرق نہیں، دوسرا مقدمہ ہے سود کافر سے حلال ہے، پس ان دونوں مقدموں کا نتیجہ ہے کہ زنا بھی کافر سے حلال ہے (حسن العزیز ۱/ ۶۳)۔

تیسری بات یہ کہ قائلین جواز کے نزدیک یہ قید لگی ہے کہ جواز صرف اس مسلمان کے حق میں ہے جو دار الاسلام کا باشندہ ہو اور اپنی کسی ضرورت سے امان لے کر دار الحرب میں آیا ہو، باقی جو شخص دار الحرب کا مستقل باشندہ ہو اس کے حق میں یہ جواز نہیں ہے، آج کل جو سوال اٹھ رہا ہے وہ دوسری قسم کے مسلمانوں کے حق میں ہے، دار الحرب سے متعلق تیسری صورت یعنی دار الحرب میں اسلام لانے والے اور وہاں سے ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کے درمیان سود کا جواز صرف امام صاحب کے نزدیک ہے، امام محمد کے نزدیک بھی نہیں، دوسرے یہ کہ یہ صورت بھی صادق نہیں آتی، اس لئے کہ دار الحرب میں مستقل سکونت رکھنے والے مسلمان یا تو ایسے ہیں کہ ان کے آباء واجداد دوسرے ملکوں سے بحالت اسلام یہاں آئے یا ان کے آباء واجداد کئی پشت پہلے اسلامی عہد میں مسلمان ہو چکے تھے، لہذا یہ مسلمان کسی طرح

جواز کا مصداق نہیں بن سکتے، اس کے بعد ملک کے ہندو باشندے ہیں جو پہلے ذمی تھے، اب حربی کہلائیں گے اور یا انقلاب کے بعد اسلام لانے والے تو امتیاز کہاں تک و کیسے ہوگا (جواز کی شرطوں کے لئے ملاحظہ ہو حضرت تھانوی کا رسالہ رافع الضنک، امداد الفتاوی ۳/ ۱۱۶، تحذیر الاخوان/ ۹ وغیرہ)۔

جواز کی قید کے ہی سلسلہ کی کڑی یہ ہے کہ جواز ہر کافر سے اور ہر دار الکفر میں نہیں ہے، اس لئے کہ جب دار الحرب میں امان لے کر جانے کی صورت میں اس کا پابند بتایا جاتا ہے کہ معاملہ کر کے ہی کچھ لیا جائے اگرچہ معاملہ غلط ہو ورنہ عہد شکنی لازم آئے گی، حالانکہ ان سے ہماری جنگ ہے تو جس دار الکفر سے ہماری جنگ نہیں، یعنی جو دار الحرب نہیں ہے کہ ہر دار الکفر دار الحرب نہیں ہوتا اور ہر کافر حربی نہیں ہوتا، ایسے دار الکفر میں اس قسم کا معاملہ جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ ان سے ہمارا امن و امان اور صلح و مسالمت کا فی الجملہ معاملہ ہوتا ہے اور کتابوں کی عبارتیں اور مسئلہ کی تصریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں، مودودی صاحب نے جو مولانا گیلانی کا تعقب لکھا ہے اس میں بار بار اس کی وضاحت کی ہے اور اس کو مدلل کیا ہے (سود ترتیب جدید/ ۳۰۲، ۳۰۶، ۳۰۷ وغیرہ)، بات سمجھ میں بھی آتی ہے، دیکھئے کہ عام دار الکفر کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر باہم معاہدہ نہیں بھی ہے تو بھی اگر پہلے سے دعوت اسلام و اعلان جنگ کے بغیر ان پر مسلمان حملہ کر دیں اور ان کی جان و مال ضائع کر دیں تو اگرچہ ضمان تو نہیں ہے مگر گناہ ہوگا (المبسوط ۱۰/ ۳۰)، اسی طرح دار الحرب کے اندر رہنے والے دو مسلمان ایک دوسرے کا نقصان کریں تو ضمان نہ ہوتے ہوئے گناہ ضرور ہوگا (المبسوط ۱۴/ ۵۸)۔

دار الحرب و دار الاسلام:

"دار الحرب اور دار الاسلام نی نی کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی کتابوں میں خود ائمہ احناف کا اختلاف منقول ہے، اس لئے فقہاء حتی کہ ہمارے فقہاء ہند بھی دو گروہوں میں ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں دو ہی بنیادی مذہب ہیں: اسلام، کفر یعنی اللہ کا نازل کردہ

آخری دین اور کفر یعنی دین محمدی کے ماسوا تمام ادیان و مذاہب خواہ ان کا کچھ نام ہو "لأن الكفر ملة واحدة" اس لئے انسان بھی صرف دو قوموں میں منقسم ہیں: مسلمان اور کافر یعنی دین محمدی پر ایمان نہ رکھنے والے خواہ وہ کسی دین و مذہب کو مانتے ہوں۔

اس لئے (دار) بھی دو ہی بنتے ہیں: (۱) دار الاسلام (۲) دار الکفر۔

دار الاسلام وہ ملک اور خطۂ زمین ہے جس میں اسلام کا بایں معنیٰ بول بالا ہو کہ اس کا اقتدار اور اس کی حکمرانی ہو اور اس کے پیش کردہ احکام و قوانین پر اس ملک کی حکومت کی اساس و بنیاد ہو، اور دار الکفر جس میں بایں معنیٰ بول بالا ہو کہ اس میں شریعت محمدی کے قوانین و احکام کے بجائے دوسرے قوانین اور نظام اسلام کے بجائے دوسرا نظام رائج و نافذ ہو، دار الحرب اور دار الامن دراصل اسی "دار الکفر" نی نی کے نام ہیں، عوارض کے اعتبار سے کہ اگر اس ملک نے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ رکھی ہے تو وہ دار الحرب ہے اور اگر اس نے مسلمانوں سے امن و امان کا معاملہ کر رکھا ہو تو دار الکفر ہو کر بھی دار الامن ہے، جیسے کہ کبھی کسی ملک کو اقتدار اعلیٰ کافروں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود اس لئے "دار الاسلام" کہد یا گیا یا کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے نظام و احکام کے لئے اس کا معاملہ دار الاسلام کا سا ہی ہوتا ہے کہ سیاسی نظم و انتظام ہے کفر کا مگر ان کے جملہ معاملات ان کے علماء و قضاۃ کے زیر سایہ اسی طرح شریعت محمدیہ کے مطابق انجام پاتے ہیں جیسے کہ خود ان کی اپنی حکومت میں۔

میرے خیال سے تو سابقہ تفصیل کے بعد "دار نی نی کی کوئی تیسری قسم نہیں بنتی اور کم از کم ایسے "جمہوری ملک نی نی جس کے نظام و آئین میں قرآن و سنت کی اساسی حیثیت کیا سرے سے کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہاں جو قانون پاس ہوتا ہے اپنے اور دوسروں کے تجربہ اور محض اپنی عقل و فکر کی بنیادوں پر وہ سب دار الکفر ہی ہیں، خواہ ان کے حالات کی بنا پر ان کو جو کہا جائے اور ان کے منشور و دستور میں جو بھی رعایتیں و آزادیاں مذکور ہوں، اس لئے کہ ایسے

ملکوں میں کفر کا ہی بول بالا اور عموماً اہل کفر کے لئے ہی اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے، باقی سب سیاسی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

اگر انگریزی اقتدار کا ہندوستان علماء محققین کی جماعت کے نزدیک دارالحرب ہوسکتا ہے جس نے حسب سابق نظام قضاء کو باقی رکھنے کی سعی و کوشش کی تھی اور گرفت و پکڑ ان ہی کی تھی جن کو باغی ثابت کیا تھا، تو وہ اقتدار جس میں دستور کی تمام تر رعایتوں کے باوجود شریعت محمدیہ کے خلاف مسلمانوں کے حق میں کوئی بھی قانون وتجویز پاس ہونے کے امکانات بلکہ واقعات ہیں، اس کو اس زمرہ میں شامل کرنے میں کیا تامل ہوسکتا ہے۔

مالٹا میں حضرت شیخ الہند سے سوال کیا گیا کہ ''ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام ہے؟'' حضرت نے فرمایا : ''علماء کا اختلاف ہے نی نی ،سوال کیا گیا آپ کی رائے ؟ فرمایا: میرے نزدیک دونوں صحیح، کہتے ہیں یہ اس لئے کہ دارالحرب دو معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں اس کے درجات ہیں جن کے احکام جدا جدا ہیں، ایک معنیٰ کی حیثیت سے اس کو دارالحرب کہہ سکتے ہیں، اور دوسرے اعتبار سے نہیں، فرمایا دارالحرب اس ملک کو کہتے ہیں جس میں کافروں کی حکومت ہو اور وہ اس قدر بااقتدار ہوں کہ جو حکم چاہیں جاری کریں، مسٹر برن نے کہا کہ یہ بات تو ہند میں ہے، فرمایا: اسی لئے ہندوستان دارالحرب ہے، اور دوسرے معنیٰ میں جس ملک میں علانیہ طور پر شعائر اسلام اور احکام اسلامیہ کے ادا کرنے کی ممانعت کی جاتی ہو وہ دارالحرب ہے، (اور اس سے ہجرت واجب ہے اگر استطاعت اصلاح نہ ہو)، اس نے کہا یہ بات تو ہند میں نہیں، فرمایا ''احتراز کرنے والوں نے غالباً اسی کا لحاظ کیا ہے نی نی (اسیر مالٹا/۱۷۹)۔

کافی میں ہے : ''دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جس میں امام المسلمین کا حکم چلتا ہو اور وہ اس کے زیر اقتدار ہو نی نی (تحذیر الاخوان/۱۵،۱۶)۔

جامع الرموز میں اس کے ساتھ مزید ہے'' دارالحرب وہ ملک ہے جس میں مسلمان

کافروں سے خوف محسوس کرتے ہوں نی نی (ہندوستان اور دارالحرب)۔

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں: احکام کفر کے جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ملکی مسائل، رعایا کے انتظام خراج وعشر کی تحصیل، تجارت و سیاست، چوری و ڈکیتی باہمی مقدمات کے فیصلوں نیز جرائم کی سزائیں کفار پورے طور پر حاکم ہوں (فتاوی محمودیہ ۴/۷ ۲۴)۔

اور حضرت گنگوہی فرماتے ہیں: کفار اپنا حکم علی الاشتہار جاری کردیں، کوئی خدشہ ان کو اور کوئی مانع نہ رہے تو دارالاسلام مغلوب ہوجائے گا اور قیاس بھی اسی کو چاہتا ہے کہ غلبہ اس کا ہی نام ہے کہ اپنا حکم جاری کریں تو کوئی مانع نہ رہے (تحذیر الاخوان ۱۵/ ۱۶)۔

اس سلسلہ میں نظام الفتاویٰ میں آئی ہوئی تفصیل لائق مطالعہ ہے (۲/ ۱۹۷ــ۲۰۰)۔

اسی میں آیا ہے: وہ مملکت جہاں مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو خواہ مسلمان وہاں ہر طرح امن واطمینان سے رہتے ہوں وہاں کے سیاسی اور غیر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہوں اس کو اپنا وطن سمجھتے ہوں اور باشندۂ ملک کی حیثیت سے اس کی حفاظت وترقی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہوں اس کے لئے ایثار اور قربانی بھی کردیتے ہوں مسلمان کی حیثیت سے یا مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کی بنا پر نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے وہ اقتدار اعلیٰ میں حصہ لے سکتے ہوں، مگر احکام اسلام جاری نہ کرسکتے ہوں جرم وسزا اور اقتصادی مسائل وغیرہ میں احکام اسلام کو قانون نہ بنا سکتے ہوں، بلکہ ان میں اس کے قوانین کے پابند ہوں تو وہ دارالاسلام نہیں ہے، یہ ملک دارالحرب ہوگا، لیکن ایک پر امن اور بہ حفاظت ملک کے لئے اس لفظ کو غیر مانوس سمجھا جاتا ہے، تو اس کو دارالامن کہہ دیا جاتا ہے نی نی (نظام الفتاوی ۲/ ۱۹۹، ۲۰۰)۔

اس تفصیل کے بعد یہی کہا جائے گا کہ کم از کم موجودہ ہندوستان نہ دارالحرب ہے اور نہ اس کے کافر حربی، جیسے کہ نہ دارالاسلام ہے اور نہ اس کے کافر، کافر ذمی، بلکہ وہ دارالکفر ہے جو کہ ہمارے لئے اپنے مخصوص دستور کی وجہ سے دارالامن ہے اور اس کے کفار دستور کی رو سے دارالامن کے غیر محارب کفار ہیں، مودودی صاحب نے دارالاسلام و دارالحرب پر گفتگو

کرتے ہوئے ہندوستان کے متعلق لکھا ہے:

"ہندوستان اس وقت دارالحرب تھا جب تک کہ انگریزوں سے جنگ جاری تھی، مگر جب ہندوستانی مغلوب ہو کر خاموش ہو گئے اور ان کی حکومت کو تسلیم کرلیا تو پھر دارالکفر بن گیا(سود از مودودی/۳۱۱، ۳۱۲) تو کیا ہندوستان کی آزادی کے بعد ہم مسلمانوں کے لئے ہندوستان کا معاملہ یہی نہیں ہے جو کہ انگریزوں کی حکومت کا ان کی حکومت کے مضبوط ہو جانے کے بعد تھا۔

بینک سے ملنے والے سود کا لینا:

(الف) بینک سے ملنے والے سود کا کیا حکم ہے، لیا جائے یا نہیں؟ ہمارے اکابر کا متفقہ فتوی ہے کہ اس کو ضرور لے لیا جائے، نہ لینے کی صورت میں نہ صرف امکان بلکہ واقع میں بھی ایسا ہوا ہے کہ اس کو ہماری مضرتوں اور ہمارے لئے تخریب، ہمارے اور دین محمدی کی بیخ کنی کے لئے اس کا استعمال ہوا اور ہوتا ہے وہ ہوگا، یہ فتویٰ غالباً ۱۹۲۸ء میں دیا گیا جیسا کہ نظام الفتاویٰ میں ایک موقع پر آیا ہے، اور حضرت تھانوی، مفتی عزیز الرحمن صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مدنی رحمہم اللہ سب سے منقول ہے اور بعد میں مفتی محمود وحسن گنگوہی، مفتی نظام الدین صاحب، مفتی عبد الرحیم صاحبؒ کا بھی اس پر اتفاق ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۱۳۳، فتاوی دار العلوم ۷/ ۸۔ ۲۹، ۳۳، فتاوی رحیمیہ ۳/ ۲۶۱ تا ۲۶۴، ۲/ ۱۹۹۲، ۱۹۶، ۱۹۹، محمودیہ ۴/ ۳۰۳، ۲۰۵، نظام الفتاوی ۱/ ۳۲۹، ۴۶۹، ۲/ ۴۴۹، ۴۶۶)، اعلاء السنن میں بھی اس کا تذکرہ آیا ہے اور ابی بن خلف کے ساتھ ہونے والے حضرت ابوبکر کے معاملہ کو اس کے لئے بطور اصل ذکر کیا گیا ہے (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۵۹)۔

لیکن بقول مفتی نظام الدین صاحب یہ حکم غیر مسلم حکومتوں کے بینکوں یا غیر مسلم بینکوں کا ہے، مسلم بینک وملک کا نہیں بلکہ اس میں چھوڑ دینا لازم ہے (نظام الفتاوی ۴/ ۴۴۹)۔ اس لئے

کہ جس خطرہ وخدشہ کے پیش نظر یہ حکم دیا گیا ہے وہ غیر مسلم ملکوں اور بینکوں سے ہی ہوسکتا ہے مسلم ملک و بینک سے کیا سوال۔

حضرت گنگوہی کے فتاوی سے کم از کم ہندوستان جیسے ملکوں میں ایک جہت اور سود کو وصول کر لینے کی نکلتی ہے، حضرت فرماتے ہیں: (سود لینے کا) ایک حیلہ شرعی یہ ہے کہ آدمی یہ خیال کرے کہ سرکار بہت سے محصول اپنے رعایا سے لیتی ہے کہ ہماری شریعت میں اس کا لینا جائز نہیں ہے گو قانون انگریزی سے وہ خلاف نہیں ہے، مگر شرع محمدی میں ظلم ہے اور ناجائز ہے اور مستحق رد ہے، سو یہ شخص یوں خیال کرے کہ جو غریب رعایا سے سرکار نے محصول شرع کے خلاف لیا ہے اس کو میں سرکار سے مسترد کراتا ہوں اور پھر اس کو وصول کر کے انہیں لوگوں پر تقسیم کردے جن سے سرکار نے بلا اذن شرع لیا تھا، اس نیت میں شاید اللہ تعالی مواخذہ نہ فرمائیں (فتاوی رشیدیہ ر ۵۰۵ طبع پاکستان)۔

مگر اس انداز کی توجیہ تو خود ان لوگوں کے حق میں لے کر استعمال کے جواز کو پیدا کرتی ہے جو کہ ناجائز ٹیکس بھرتے ہیں۔

(ب) سود کا مصرف:

جہاں تک سوال ہے حاصل کردہ سود کے مصرف کا، تو فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ معروف ہے، اور مولانا برہان الدین صاحب کے تفصیلی و تحقیقی مضمون کے مطابق یہ اتفاقی امر ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی ایسا مال ہے جس کو وہ اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا، اگر مالک معلوم ہے تو اس تک پہنچائے جیسے کے غصب کردہ مال یا لقطہ کا عام حکم ہے اور اگر مالک معلوم نہیں ہے اور اس کا حصول کسی عقد کے ذریعہ ہوا ہے، اگرچہ عقد غلط ہو جیسا کہ ایک موقع پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا ہے (ملفوظات عزیزی ۳۷، بلکہ اس انداز کی صراحت زاد المعاد میں ابن القیم نے بھی کی ہے ۲۴۲/۴) یا مالک معلوم ہے مگر اب کسی طرح اس تک پہنچانا ممکن نہیں کہ نہ وہ خود موجود ہے نہ اس کے ورثاء، تو ایسے مال کا حکم یہ ہے کہ اس کو صدقہ کردیا جائے، مولانا سنبھلی نے بواسطہ ابن تیمیہ حنابلہ سے، اور بواسطہ قرطبی مالکیہ سے بھی یہی حکم نقل کیا ہے، اور احناف کے یہاں تو یہ حکم ہے ہی، شامی وغیرہ میں لقطہ، غصب، رشوت سب کا حکم اسی قسم کا آیا ہے (شامی ۳۲۳/۳)، اور لقطہ یا غصب کا حکم مالک تک لوٹا دینے وغیرہ کا نصوص صریحہ صحیحہ سے ثابت ہے، اس لئے یہ حکم شوافع کے یہاں بھی ہے اور چونکہ سود کو غصب و لقطہ سے مناسبت ہے جو کہ ظاہر ہے، اس لئے بینک سے وصول کئے جانے والے سود کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کو لے کر صدقہ کیا جائے، اگرچہ مفتی عبدالرحیم صاحب نے لقطہ ہونے کی جہت کو یہ کہہ کر رد کیا ہے، اس کے مالک نامعلوم ولاپتہ بھی نہیں اور ان کو پہنچانا متعذر بھی نہیں ہے اور یہ رقم واجب الرد بھی نہیں ہے، پھر بینک میں دی ہوئی عین رقم تو واپس ہوئی ہی نہیں (فتاوی رحیمیہ ۲۶۵/۳، ۲۶۶)، مگر کہا جا سکتا ہے کہ اس کو (عین لقطہ) کون کہتا ہے، ظاہر ہے کہ غصب، رشوت، لقطہ، سود سب کے الگ حقائق ہیں، البتہ باہم ایک مناسبت اور قدر مشترک ہے جس کی بنا پر احکام میں توافق ہو سکتا ہے اور ہے، سود کے صدقہ کردینے کے حکم سے اصل کے طور پر مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ کو ذکر کیا ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا

گیا اور معارف السنن میں بواسطہ دار قطنی حضرت امام صاحب سے ایسے اموال کے حق میں ایک روایت کو اصل بتا نا نقل کیا گیا ہے، یہ روایت عاصم ابن کلیب کی ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ حضور ﷺ مع صحابہ ایک گھر میں مدعو تھے، کھانے میں بکری کا گوشت تھا، آپ ﷺ نے گوشت کی بوٹی منہ میں رکھنے کے بعد فرمایا: ''بکری مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے نی نی، تحقیق سے یہی ثابت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے قیدیوں کو کھلا دو (دارقطنی ۲/۵۴۵، ابوداؤد مع بذل المجہود ۱۴/۲۹۵، ۲۹۷)، ابوداؤد کی ایک دوسری روایت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے جس میں آپ ﷺ نے پچھنا لگانے کی اجرت کو بار بار استعمال میں لانے کی اجازت طلب کرنے پر فرمایا: ''اسے اپنے جانور یا غلام کو کھلا دو نی نی (بذل المجہود ۱۵/۹۰)، شاہ عبدالعزیز صاحب نے ذکر فرمایا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایسے مال کا یا تو تبادلہ کرے یا گھوڑے یا خادم کو کھلا دے یا کافر کو اجرت دیدے (ملفوظات عزیزی ۷/۳)، مگر یہ حدیث کہاں کی ہے اور کیسی ہے یا حدیث ہے بھی یا نہیں تحقیق نہیں ہو سکی۔

بہر حال نصوص صریحہ وصحیحہ سے ثابت اس اصل وقاعدہ کی بنا پر سود کا جو مصرف عموماً علماء نے تجویز کیا ہے وہ اس کو صدقہ کر دینا ہے، بقول مولانا سنبھلی جدہ کے اندر ۱۳۹۹ھ میں منعقد ایک فقہی وعلمی مجلس کے مختلف ملکوں کے شرکاء نے اس کو بالاتفاق طے کیا، اور ہمارے اکابر تو عرصہ سے یہ فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں، حضرت تھانوی سے لے کر موجودہ حضرات تک (بینک انشورنس اور سرکاری قرضے ۴۲، ۴۳، فتاوی رحیمیہ ۳/۲۶۱ وغیرہ)۔

رہا اس کا سوال کہ سود کا جیسے دینا حرام ہے لینا بھی حرام ہے، اور یہ کہ استعمال جیسے اغنیاء کو منع ویسے فقراء کو، شق اول کا جواب یہ ہے کہ جواز بر بناء ضرورت، اسلام ومسلمانوں کو ایسے ضرر شدید سے بچانے کے لئے ہے کہ جو سود لینے کے ضرر سے بڑھ کر ہے (نظام الفتاوی ۱/۳۲۹)، اور شق ثانی کا جواب یہ ہے کہ فقراء کے لئے حلت اس لئے ہے کہ سود کا مال اصلاً بینک کی ملک نہیں ہے، دوسرے سود دینے والوں کی ہے جو ہم کو معلوم نہیں، اب سود لینے

والا اصلی مالک کو تو لوٹا نہیں سکتا تو لقطہ کی طرح اس کی طرف سے صدقہ کر دیتا ہے (بینک انشورنس ر ۴۴ تا ۴۶)۔

اس صورت میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی غریب کو دے دے مسلمان ہو یا غیر مسلم یا یہ کہ مسلمان و مستحق زکاۃ کی تخصیص ہے؟ مفتی نظام الدین صاحب کا میلان یہ ہے کہ تخصیص ہے، انہوں نے بار بار مستحق صدقہ و مستحق زکاۃ کو دینے کی تصریح کی ہے (نظام الفتاوی ۱/۲۰۸، ۳۲۸، ۲/۴۴۹، ۴۶۱)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب نے اولی ضرور کہا ہے، مگر ضروری قرار نہیں دیا، باقی حضرات نے کوئی قید نہیں لگائی، بس یہ فرماتے ہیں کہ فقراء و مساکین و اہل حاجت کو دیدے (فتاوی رحیمیہ ۶/۱۴۱) جو احادیث بطور استدلال یا مناسبات ذکر کی گئی ہیں ان سے تو اس کی تائید ہوتی ہے کہ کوئی قید نہیں ہے، اس لئے کہ عاصم ابن کلیب کی روایت میں آیا ہے کہ قیدیوں کو کھلا دو اور وہاں قیدی کفار ہی ہوتے تھے اور دوسری روایت میں خادم کا ذکر ہے جو کہ غیر مسلم بھی ہوتے تھے، اگر چہ یہ کہا جا سکتا ہے بکری والے واقعہ میں بھی حلت کی جہت موجود تھی، قیمت دیدی گئی تھی جسے مالک کی بیوی نے وصول کیا تھا، صرف یہ کہ مالک (شوہر) بر موقع موجود نہ تھا، اور پچھنے کی اجرت جمہور کے نزدیک حلال ہے (بذل المجہود ۱۴/۲، ۷، ۲۶۷، ۱۵/۹۰) اور حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ میں مولانا ظفر احمد صاحب نے صدقہ کو تورع و تبرع پر محمول کیا ہے (اعلاء السنن ۱۴/۳۵۹)۔

یہ صحیح ہے کہ ایسے مال کا ایسی صورت حال میں صدقہ کرنا واجب ہے جس سے تخصیص کا خیال ہوتا ہے کہ صدقات واجبہ کا مصرف مسلمان ہی ہیں، صرف ذمی کو فطرہ مل سکتا ہے مگر یہاں ذمی کہاں، مگر مفتی عبدالرحیم صاحب نے حضرت تھانوی کی ''الطرائف والظرائف'' سے یہ نقل کیا ہے کہ صدقہ واجبہ اور تصدق واجب کے درمیان فرق ہے، اور دونوں کے مصرف کا

ایک ہونا ضروری نہیں ہے، غنی لقطہ کا محل ہے، جو کہ واجب التصدق ہے، مگر صدقہ واجبہ کا نہیں، ایسے ہی قربانی کی کھال اور اس کی قیمت کو صدقہ کرنے کا حکم ہے، مگر کھال کسی کو دے سکتا ہے (فتاوی رحیمیہ ۳/۲۶۶)، دوسرا مصرف اس وقت کے ہمارے تینوں اکابر اہل افتاء مفتی محمود حسن صاحب، مفتی نظام الدین صاحب، مفتی عبد الرحیم صاحب نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ اس رقم کو غیر شرعی سرکاری ٹیکس میں لگا دیا جائے، غیر شرعی کا معیار یہ ہے کہ ایسا ٹیکس جس کی بظاہر کوئی منفعت ہم کو نہ حاصل ہو رہی ہو، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس میں، لیکن واٹر ٹیکس وغیرہ میں نہیں، البتہ مفتی عبد الرحیم صاحب یہ درجۂ مجبوری جبکہ ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت نہ ہو یا بہت بوجھ ہو تب اس کی اجازت دیتے ہیں ورنہ نہیں (فتاوی رحیمیہ ۲/۱۹۹، ۶/۱۳۶، شاید یہ بات ملحوظ ہے کہ دینے والا کچھ نہ کچھ تو فائدہ حاصل کرتا ہے)۔

اور باقی دونوں حضرات کے نزدیک یہ مصرف صدقہ پر مقدم اور اس سے اولیٰ ہے (فتاوی محمودیہ ۴/۳۰۳)۔ اگرچہ اس مصرف میں لگانے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے: ''مال حرام بود بجائے حرام رفت'' نی نی مگر اصل بنا اس کی جو قاعدہ پیچھے گذر چکا ہے اس کی ایک شق پر ہے کہ مملوک غیر حتی الامکان مالک تک پہنچانا چاہیے، بینکوں سے ملنے والے سود میں اگرچہ یہ احتمال شامل ہے کہ بینک کے قرضداروں سے لئے ہوئے سود سے کھاتے داروں کو سود دیا جاتا ہے مگر بینک تجارت بھی کرتا ہے، پھر کھاتے دار کا معاملہ تو براہ راست بینک سے ہی ہے، اس لئے اس کا اصل مالک بینک اور حکومت ہی ہیں، تو کسی عنوان سے حکومت کو لوٹانا، اصل مالک کو لوٹانا ہے، جیسا کہ ایک موقع پر مفتی نظام الدین صاحب نے تصریح بھی کی ہے (نظام الفتاوی ۲/۲۶۱)، اور بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے۔

تیسرا مصرف جسے ان تینوں ارباب افتاء میں سے مفتی عبد الرحیم صاحب نے اپنے متعدد فتاویٰ میں ذکر کیا ہے، بلکہ ایک موقع پر اس کو مدلل و مبرہن کر کے پیش کیا ہے اور بظاہر یہ ان کے نزدیک ٹیکس سے مقدم ہے کہ اس سے پہلے اور اس کے مقابلہ میں توسع کے ساتھ

انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسے عام مسلمانوں ورفاہ عام کے کاموں میں استعمال کیا جائے یعنی دین کی نشرواشاعت، کوئی قومی وملی کام وخدمت، یتامی ومساکین کی امداد، طلباء کے وظائف، مسافرخانہ وکنواں کی تعمیر، سڑکوں کی روشنی، عوامی بیت الخلاء اگرچہ مسجد کا ہو وغیرہ میں اسے صرف کیا جاسکتا ہے۔

اس مضمون کے متعدد فتاویٰ مفتی کفایت اللہ صاحب سے، نیز مفتی سعید احمد صاحب (سہارنپور)، حضرت مدنی اور بعض علماء مرادآباد سے منقول ہیں اور مفتی عبدالرحیم صاحب نے اس کو اختیار کیا ہے اور اگرچہ انہوں نے لقطہ کے درجہ میں ہونے سے انکار کیا ہے، مگر کہا ہے کہ لقطہ بھی ہوتو بھی یہ مصرف ہوسکتا ہے کہ اسلامی بیت المال کے اموال میں ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے (فتاوی رحیمیہ ۳/۲۶۰ تا ۲۶۷)۔

ان حضرات نے اس کی اصل یہ قرار دی ہے جیسا کہ حضرت مدنی کے ایک فتویٰ (مکتوبات شیخ الاسلام ۲/۲۷) میں آیا ہے اور مفتی عبدالرحیم صاحب نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، فقہ حنفی کی کتابوں میں کتاب السیر کے مسائل کے تحت یہ مسئلہ آیا ہے، اہل حرب کا جو مال مسلمانوں کو، اہل حرب سے جنگ کے بغیر حاصل ہو جسے شریعت کی اصطلاح میں ''فے ئی ئی کہتے ہیں، اس کا مصرف مسلمانوں کے مصالح ہیں جس کے تحت یہ سارے امور آجاتے ہیں (فتاوی رحیمیہ ۳/۲۶۱، ۲۶۴، ہدایہ ۲/۵۶۷)۔

مولانا گیلانی نے ہندوستان یا دارالحرب میں سود لینے کے جواز کے سلسلہ میں جو مضمون لکھا ہے اس کی بناء ہی اسی پر ہے کہ یہ فے ہے، لہذا اس کو وصول کرنا چاہیے بلکہ اس کا نہ لینا قومی ووطنی جرم ہے (سود/۳۱۰ تا ۳۲۱)، مولانا گیلانی کے پورے مضمون کی تردید تو مودودی صاحب نے کردی ہے اور فقہ حنفی کی رو سے، لہذا وہاں دیکھنے کے لائق ہے۔

مگر یہاں یہ عرض ہے کہ عموماً جو ہمارے حضرات نے اس شق کو نہیں اختیار کیا ہے

☆مہتمم دارالعلوم مہذب پور، اعظم گڑھ یوپی۔

اس کا باعث یہ ہوسکتا ہے کہ ایسے کاموں میں صرف کرنے پر خود ایسی چیز سے براہ راست صرف کرنے والا بھی فائدہ اٹھائے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ اس کے لئے منع ہے، بقول مفتی نظام الدین صاحب اس کو تو حاصل کرنے والا نہ خود استعمال کرسکتا ہے اور نہ کسی طرح ضائع کرسکتا ہے، راستہ صدقہ ہی ہے (نظام الفتاوی ۱/۳۶۷) اور اصل بات یہ ہے کہ اس قول کی بنا اس پر ہے کہ ہم کو بینک سے جو سود مل رہا ہے وہ محض حکومت وغیر مسلم کا پیسہ ہے اور ملک چونکہ دار الحرب ہے، لہذا ان کی رضا سے اس کا لینا درست ہے، مگر یہ تفصیل پیچھے آچکی ہے کہ دار الحرب میں ان چیزوں کے قول جواز کی کیا حیثیت ہے اور یہ کہ یہ جواز ہر دار الکفر میں نہیں ہے اور ہند فی الوقت دار الحرب نہیں، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت بینک جو سود دیتا ہے اس میں ہم مسلمانوں کا مال بھی ہوتا ہی ہے تو اسے کیسے اہل حرب کے مال کے مواقع میں صرف کیا جاسکتا ہے (سود/۳۱۹)۔

مصرف کے سلسلہ میں لقطہ ہونے کی تقدیر پر یا اہل حرب کا مال ہونے کی تقدیر پر خود بھی استعمال کرنے کی شق نکلتی ہے مگر ایک تو عین لقطہ نہیں، دوسرے حلت وحرمت میں احتیاط کا مقتضی اجتناب ہے اور حربی کے متعلق تفصیل گذر چکی ہے۔

(ج) سرکاری وغیر سرکاری سود کا فرق:

''سود'' سود ہے، اس میں سرکاری وغیر سرکاری بینک کا کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ غیر سرکاری بینک یا افراد سے حاصل ہونے والا سود ٹیکس میں نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ اس کے جواز کی جو بناء ہے وہ اس میں نہیں پائی جاتی، مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں: پبلک بینک سے (سود کی) رقم مِل رہی ہے تو کل کی کل مستحقین صدقہ کو بطور صدقہ دے کر اپنی ملک سے نکال دینا چاہیے (نظام الفتاوی ۲/۴۴۹)۔

۵- سود کے لینے دینے کا فرق بالخصوص غیر اسلامی ملک میں:

''سود ورشوت نی نی ان دونوں کا لینا دینا حرام ہیں، نصوص دونوں کو عام ہیں:

''**لعن رسول الله ﷺ الراشي والمرتشي**'' (سنن ترمذی کتاب الاحکام)، دوسری حدیث میں ہے: ''**لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله**'' (مشکاۃ ر ۲۴۴)۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ سود ورشوت کا لینا حرام مال کا کمانا اور جمع کرنا ہے اور حرام کا کھانا اور استعمال میں لانا زیادہ سخت ہے، غالباً اسی لئے قرآن کریم میں سود کی حرمت کے سلسلہ میں دینے کے بجائے لینے اور کھانے کا ذکر آیا ہے۔

''**اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا**'' (سورۂ بقرہ ۲۷۸:)۔

''**يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَابَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا**'' (سورۂ بقرہ ۲۷۸:)۔

''**يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَاتَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافاً مُضَاعَفَةً**'' (سورۂ آل عمران ۱۳۰:)۔

دینے والا حرام فعل کا ارتکاب کرتا ہے، مگر حرام مال کو استعمال نہیں کرتا، اسی لئے فقہاء نے جو استثناءات ذکر کئے ہیں ان میں رشوت دینے یا سود دینے کا ذکر آیا ہے، ہاں حرام کے ارتکاب اور حرام پر تعاون کی وجہ سے اس جواز کو ضرورت کے ساتھ مقید کیا ہے۔

رشوت کے سلسلے میں شامی میں ہے: ''اگر اپنے دین کی حفاظت کے لئے رشوت دے تو جائز ہے، اسی طرح اگر کسی ظالم حاکم کو دے اپنی جان یا مال سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے اور اپنا حق لینے کے لئے تو یہ رشوت نہیں ہے (شامی ۵ر ۲۷۲)۔

اور سود کے متعلق الاشباہ کا یہ جزئیہ معروف ہے: ''**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**'' (الاشباہ والنظائر ر ۹۲) جب سودی قرض لینے اور سود دینے کے جواز کا مدار حاجت ہے، ضرورت ہے تو ضرورت وحاجت تو ایک خاص حالت کا نام ہے جو کہیں بھی پیش کر سکتی ہے، اس لئے نفس حکم میں تو اسلامی ملک اور غیر اسلامی ملک کے درمیان فرق کا سوال نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلم ملک میں چونکہ اسلامی نظام رائج ہوتا ہے اور اسلامی معاشرہ ہوتا ہے، اس لئے ضرورت مندوں کی ضرورت کی کفالت کی مختلف صورتیں موجود ہوتی ہیں، اعانت وامداد کے

قبیل کی بھی کہ ان کورقم کا مالک بنادیا جائے اور بغیر سود کے قرض کی بھی۔

مگر غیر اسلامی ملک میں نہ تو اسلامی نظام بیت المال اور عشر وخراج اور زکاۃ وصدقات وغیرہ ہیں اور نہ ہی اسلامی معاشرہ وایثار، اس لئے نہ بطور ملک آسانی سے ملنے کا سوال اور نہ بطور قرض، یوں بھی اب جو حالات ہیں ان میں افراد شخصی طور پر قرض دینے سے گھبراتے ہیں کہ بکثرت لینے والے نہ صرف یہ کہ دینے سے انکار کرتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ فساد کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

اسلامی ملک وغیر اسلامی ملک کے درمیان اس نمایاں فرق کی بنا پر ضرور یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر اسلامی ملک کے اندر رہنے والا مسلمان زیادہ اس بات پر مجبور ہوسکتا ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان بچانے کے لئے ایسا قرض لینے پر مجبور ہو جائے، چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب نے ہندوستان کی نسبت سے متعدد مواقع پر اس قسم کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۶—ضرورت کی بنا پر سودی قرض:

فقہ حنفی میں اس سلسلہ میں الاشباہ والنظائر کا یہ جزئیہ بہت معروف ہے جسے عموماً ارباب افتاء ذکر کیا کرتے ہیں ''حاجت مند کے لئے کچھ نفع کے عوض قرض کا لینا جائز ہے''(الاشباہ ر ۹۲)۔

لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ کہ وہ حاجت کیا ہے اور وہ محتاج کون ہے جس کے لئے یہ جواز ہے۔

دوسرا یہ کہ جواز جہاں اور جس کے لئے ہوگا کس حد تک؟

فقہ کی اصطلاح میں حاجت وضرورت کیا ہے اور اس کے احکام وتفصیلات تو الاشباہ اور اس کی شروح وغیرہ میں مذکور ہیں اور ارباب افتاء ذکر کرتے ہیں اور کریں گے، میں تو اس

موقع پر زیر بحث مسئلہ کی نسبت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سود کے جواز کا محتاج بقول استاذی مفتی محمود حسن صاحب ''ایسا شخص ہے جو کہ اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا اور بغیر قرض کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں اور قرض بغیر سود کے ملتا نہیں نی نی (محمودیہ ۴/۲۳۶، ۲۴۲، ۶/۳۰۷، رحیمیہ ۶/۱۳۶، نظام الفتاوی ۲/۴۶۴)۔

ا- یعنی یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس ضروریات زندگی کی صورت میں یا سامان کی صورت میں کوئی اثاثہ نہیں ہے اور نہ وہ کمانے پر قادر ہے۔

۲- یہ محتاج ایسا شخص ہے جس کے پاس ضروریات زندگی، مکان، کپڑے، ضروری برتن کی صورت میں اثاثہ ہے مگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نقد اثاثہ نہیں ہے اور ضروریات کا سامان بیچ دے تو عزت کے ساتھ سر وتن چھپانے کی صورت بھی جاتی رہے اور کمانے پر بھی قادر نہیں۔

۳- یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس مکان وغیرہ ضروریات کے ساتھ اتنی زمین ہے مثلاً کہ جس سے کسی طرح اس کی ضرورت کی بقدر غلہ کی یافت ہوسکتی ہے، مگر اس کے حصول کے لئے یعنی چیزیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً کھاد وبیج وسینچائی کے حق میں اور اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر مزدوری کے حق میں بھی زحمت ہوتی ہے کہ خود بدن سے محنت نہیں کرسکتا اور مزدوری کے پیسے نہیں پاتا۔

اور اس قسم کی صورت میں ایسے شخص کو غیر سودی قرض یا کوئی امدادی رقم کہیں سے حاصل نہیں ہوسکتی، تو وہ اس حد کے تحت آئے گا، اور خیال رہے کہ کمانے پر قادر نہ ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت وقوی کمزور ہوں بلکہ صحت وقوی کے ہوتے ہوئے آدمی خاندانی طور پر محنت ومشقت کا عادی نہیں ہے تو وہ بھی قادر نہیں شمار ہوگا (جیسا کہ فقہاء نے زکوۃ کے مصرف وسوال کے جواز کے حق میں اس کی صراحت کی ہے)۔

اور جیسے قدر کفاف روزی کے لئے آدمی کو محتاج قرار دیکر جواز ہوسکتا ہے، ایسے ہی اگر رہائش کے مسئلہ میں آدمی واقعی مجبور ہو کہ کرایہ گراں، پھر کرایہ داری مستقل زحمت، تو ضرورت

کے لئے کافی مکان بنوانے کی حد تک بھی اسے محتاج قرار دیا جا سکتا ہے (یہ تفصیل اساتذہ کے فتاوی سے ماخوذ ہے، بلکہ اس انداز کے امور ان میں صراحتاً آئے ہیں)۔

ایسا شخص کہ جس کے پاس ایک معقول ذریعۂ معاش ہے، جو بقدر کفاف روزی دیتا ہے، وہ اسے اور اچھا کرنا چاہے یا پھیلانا چاہے تو وہ محتاج نہیں ہے جیسے کہ رہائش کے ایک مکان کے علاوہ اگر مزید ایک مکان ہے جس کے کرایہ کو استعمال کرتا ہے مگر نا کافی ہے تو وہ محتاج نہیں ہے، اسے مکان بیچ کر ذریعۂ معاش اپنانا چاہیے، اسی طرح زائد از ضرورت، گھر کے سامان ہوتے ہوئے انسان محتاج نہیں کہلائے گا، حضرت گنگوہی نے ایک فتوی میں فرمایا کہ مکان اگرچہ نقصان کے ساتھ بیچنا پڑے مکان بیچ لے مگر سود نہ دے (رشیدیہ/۵۰۶)، جیسے کہ احتیاج کے تحت اس کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس وسیع کاروبار ہے، کاروبار پھیلانے و بڑھانے کے لئے وافر سرمایہ موجود ہے لیکن اگر وہ اپنی ضروریات کے لئے اپنے سرمایہ کو سامنے لاتا ہے تو سرکاری قوانین کے سامنے اس کو جواب دہ ہونا پڑے گا، بلکہ مجرم کے کٹہرہ میں کھڑا ہونا پڑیگا اور بڑی زحمتیں اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے، اب وہ مجبور ہو کر اپنی جائز کمائی کو بچانے اور چھپانے کے لئے اگر ایسا اقدام کرے تو اس کو بھی حد ضرورت میں شمار کیا جا سکتا ہے (نظام الفتاوی ۱/۳۳۹، ۳۴۰) جیسے کہ کاروبار وغیرہ کے انشورنس کے حق میں اہل افتاء کہتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ چونکہ یہ جواز مخصوص حال وحاجت کی بنا پر ہے، اس لئے صرف اسی حد تک ہوگا کہ جس سے یہ حاجت آدمی کی پوری ہو جائے یعنی معقول صورت میں کہ جو گذارہ کے لئے واقعی کافی ہو اور اس کی ضرورت کی حالت ختم ہو جائے جیسا کہ جواز کے فتاوی کے ساتھ اکابر نے تصریح کی ہے اور فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے: ”الضرورة تتقدر بقدر الضرورة“۔

۷—ترقیاتی اور اسکیمی قرضے:

مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے فتاوی میں بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے متعلق قرضوں کی حیثیت عام ضرورتوں کے تحت لئے جانے والے قرضوں سے مختلف ہے، حکومت کا مقصود ایسے قرضوں سے بالخصوص زراندوزی وتحصیل زر نہیں ہے بلکہ ملک کے معاشرہ کی فلاح وصلاح ہی ہوتی ہے۔

اور اس کے تحت انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ ایسے قرضے کہ جن میں گورنمنٹ اصل دی ہوئی رقم پر کچھ چھوٹ دے کر واپسی کا مطالبہ کرتی ہے اور ایک وقت مقررہ پر ادا نہ کر سکنے کی صورت میں اضافہ کرتی ہے، حتی کہ اضافہ شدہ رقم کے ساتھ باقی ماندہ رقم اصل کے برابر اور بعد میں اس سے زائد بھی ہو جاتی ہے۔

ایسے قرضے سودی قرض کے تحت اس وقت تک نہ آئیں گے جب تک کہ قرض لینے والے کو واپسی میں اصل رقم سے کچھ زائد دینے کی نوبت نہ آئے، اس لئے اس سے پہلے جو کچھ دے گا اس پر سود کی تعریف صادق نہ آئے گی اور سود کہنے سے رقم سود نہ بن جائے گی۔

دوسرے ایسے قرضے کہ جن میں حکومت بنیادی طور پر ضرورت مندوں کو نقد رقم فراہم کرنے کے بجائے ضرورت کے مطابق اسباب مشینری وغیرہ فراہم کرتی ہے اور اس کے ساتھ کام چلانے کے لئے معمولی رقم دیتی ہے، وہ بھی عام سودی قرضوں کے تحت نہیں آئیں گے، اس لئے کہ واپسی میں جو زیادتی دی جائے گی اس میں دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ ہم نے گورنمنٹ سے پیسہ لے کر مشین نہیں خریدی بلکہ گورنمنٹ نے ہم کو خرید کر دی، اب اگر وہ اپنی دی ہوئی رقم پر ہم سے زائد لیتی ہے تو گویا وہ مشین کی قیمت لیتی ہے جو کہ گورنمنٹ و کمپنی کے درمیان کم ہے اور ہمارے و گورنمنٹ کے درمیان زیادہ، دوسرے یہ کہ یہ زائد رقم جو دی جائے گی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کو اپنا نظام چلانے اور عوام کی ایسی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے وسیع عملہ اور دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے یہ زائد رقم انتظامی اخراجات کے لئے

بطور اجرت وفیس کہی جاسکتی ہے۔

یعنی ایسے قرضوں میں زائد دی جانے والی رقم کے حق میں یہ توجیہ کی جاسکتی ہے، مفتی نظام الدین صاحب نے فرمایا: بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں اگرچہ ان کا یہ قصد نہ ہو، مگر ضرورت کی بنا پر جیسے حضرت تھانوی نے منی آڈر کی فیس میں توجیہ فرمائی ہے جواز کی شق نکالنے کے لئے، ایسے ہی یہاں بھی ہوسکتی ہے، اور یہ توجیہ اس قسم کے معاملات اور ضروریات کے عام ہونے کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے، مفتی صاحب موصوف نے اس جہت سے بڑی تفصیلی اور واضح ومدلل گفتگو فرمائی ہے اور قواعد کی بنیاد پر توجیہ کی ضرورت ومناسبت کو ثابت کیا ہے۔

اور دوسری جہت وہ بھی سوچی جاسکتی ہے جس کو سوالنامہ میں ذکر کیا گیا ہے، کہ جب یہاں اسلامی بیت المال، زکوٰۃ وصدقات نہیں، نہ غیر سودی قرضے، اور رعایا ہونے کی بنا پر ہمارا بھی حق، اور سود دینا ہی وسیلہ ہے اس حق کے وصولنے کا، تو اس کو مجبوری کے درجہ میں اس رشوت کی حیثیت دی جائے جو کہ اپنا حق وصول کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔

بہر حال ایسے قرضوں میں یہ دونوں جہتیں سوچی جاسکتی ہیں، دل جس پر مطمئن ہوجائے، یا پھر کوئی دوسری ہی رائے اختیار کی جائے، اور ان دونوں قسم کے ماسواء قرضے جن میں کوئی معافی نہیں، یا یہ کہ نقد ہی نقد یا وافر مقدار میں نقد لیا جاتا ہے عام حالات میں ان کا جواز نہیں ہوگا۔

۸— معافی والے قرضے:

بظاہر تو یہ صورت جائز ہے کہ اس پر کم از کم اس وقت تک سود کی تعریف صادق نہیں آتی جب تک کہ مقروض کی طرف سے واپس کی جانے والی رقم اصل سے زائد نہ ہو جیسا کہ گذشتہ بار بار آچکا ہے، البتہ ایک اشکال یہ ہے کہ ابتداء معاملہ میں یہ بات بھی بہر حال سامنے آتی ہے کہ اگر مقررہ وقت پر مطلوبہ باقی ماندہ رقم ادا نہ کرسکے تو پھر اس حساب سے مزید دینا ہوگا جو کہ بڑھتے

بڑھتے اصل سے زائد ہوسکتی ہے۔

۹ــ بینک کے واسطے سے سود کے ساتھ تجارت:

مفتی نظام الدین صاحب نے بینک کے ذریعہ تجارت کی صورتوں کی تنقیح کرنے کے بعد جو تفصیل کی ہے اس کے مطابق اگر مال منگانے والا یا بھیجنے والا اپنے اختیار سے بینک سے اس قسم کا معاملہ کرتا ہے، بالخصوص مال منگانے کی صورت میں اور صورت یہ ہوتی ہے کہ خریدار پوری قیمت بینک سے قرض لے کر ادا کرتا ہے یا یہ کہ بینک سے معاملہ کر کے اس کے ذریعے ادا کرتا ہے تو یہ سودی معاملہ کہلائے گا۔ اور ضرورت کے بغیر اس کا جواز نہ ہوگا، ضرورت کا مطلب یہ ہے: قانونی مجبوری ہو کہ واسطہ بنایا جانا ضروری ہو یا غیر سودی قرض نہ ملے یا ملے مگر زیادہ شرح کے ساتھ (نظام الفتاوی ۱/ ۴۴) اور اگر سود لینے کی صورت بینک کو واسطہ بنانے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اہون ہے کہ اس میں آدمی کو سود دینا نہیں ہے، ملتا و لیتا ہے جسے حاصل کر کے مستحق کو دے کر اس سے بری الذمہ ہو جائے گا۔

بہر حال از روئے اصول و گذشتہ تفصیلات مفتی صاحب کی توضیح و تفصیل معقول معلوم ہوتی ہے۔

۱۰ــ شخصی و حکومتی بینکوں کے سودی فرق:

بظاہر دونوں قسموں کے بینکوں سے قرض لے کر سود ادا کرنا یکساں حیثیت رکھتا ہے۔

۱۱ــ سرکاری زحمتوں سے بچنے کے لئے شخصی سودی قرضے:

بظاہر یہ شق ''اہون البلیتین'' ہی کے تحت آتی ہے، دیکھا یہ جائے گا کہ حکومت سے معاملہ کرنے کی صورت میں اگر اس کو واقعی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا ہے، سود بہر حال لگتا ہے، مزید رشوت بھی دینی پڑتی ہے اور اپنی حلال و محفوظ کمائی کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے تو پھر جن ضرورتوں

کے تحت سرکاری قرض لیا جاسکتا ہے اس کی بھی گنجائش ہو سکے گی۔

جوابات ضمیمہ سوالات:

تمہید:

(الف) سود ایک شرعی حقیقت ہے جہاں صادق آئے گی وہی اعتبار ہوگا۔

(ب) شرعی حقیقت کے مطابق سود محض قرض کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

(ج) اور جانبین سے مالی معاملہ میں ایک طرف سے شرط کے ساتھ زیادتی کا حاصل ہونا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حق سے زائد کچھ ملے مگر مشروط نہ ہو تو سود نہیں ہے۔

جوابات:

۱— مذکورہ دونوں صورتیں بظاہر سود کے تحت نہیں آتیں، اس لئے کہ مدعی کا یہاں اس انداز کا کوئی معاملہ نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنے واجبی وواقعی حق کا مطالبہ ہے جس پر عدالت تصفیہ کر کے اسے ایک رقم دلاتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ اس کی طلب کے عین مطابق ہو تو اگرچہ حکومت اس کو دو حصوں میں کر کے دو عنوانوں سے دلائے مگر ہم مجموعے کو مجموعی طور پر اس کا حق اور اس کی زمین کی قیمت کہہ سکتے ہیں، عدالت کی تعبیر سے ایسے ہی فرق نہیں پڑے گا جیسے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ میں اضافہ ہے۔

۲— مفتی نظام الدین صاحب نے ایسی فلاحی قرضے جن میں نقد برائے نام اور اصلاً اشیاء کی فراہمی ہوتی ہے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے اس انداز کی توجیہ کو معقول قرار دیا ہے، اس تقدیر پر کہ زائد رقم اصل مال کی قیمت میں بھی شمار ہو سکتی ہے کہ ہم نے مشین حکومت سے لی ہے، اور حکومت نے کارخانہ سے اور انتظامی اخراجات میں بھی شمار کی جاسکتی

ہے۔

ایسی کسی نیت سے فرق نہیں پڑے گا یہ نیت تو ہر جگہ چل سکتی ہے، جواز کے لئے معاملہ کی مجموعی صورت کو اصول شرع کے مطابق ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی صورت میں بھی پہلی صورت کے مطابق توجیہ ہوسکتی ہے۔

☆☆☆

سودی کاروبار کا عموم

مفتی حبیب اللہ قاسمی ☆

ربوا ایک معاشرتی لعنت ہے جس کی اقتصادی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ہی غریب کے لہو سے سرمایہ داری کی آبیاری کی ہے اور غربت کے سسکتے وجود سے سرمایہ داری کی ہوس کو غذا بخشی ہے، اسی وجہ سے خداوند قدوس نے بھی ایسوں کے دلوں کو ہلا دینے والا چیلنج کیا ہے: ”**فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ**“ اور حضور ﷺ کی کم وبیش چالیس حدیثیں اس کی مذمت پر مشتمل ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ربوا کو وجود پذیر ہوئے اتنا طویل زمانہ گذر چکا ہے کہ اس کی جڑوں کو کھود کر پھینکنا اور معاشرہ کو اس کی گندگی سے پاک کرنا گویا کہ محالات کے قبیل سے ہو چکا ہے، بلکہ اب تو ربوا کی مختلف شکلوں نے معاشرہ ومعیشت کو اپنے احاطہ میں اس طرح لے لیا ہے کہ اس سے نکلنا خرط قتاد کے مترادف ہے، اس کے باوجود ایسے دیندار ہر زمانے میں رہے جنہوں نے اختیاری درجہ تک اس لعنت سے بچنے ودور رہنے کی مکمل کوشش کی اور نتیجہ کے طور پر اگر کچھ لوگ ناکام رہے تو کچھ کامیاب بھی رہے اگرچہ عصر حاضر میں ملکی اعتبار سے ایمان والے بعض ایسی شکلوں کے شکار ہیں جس نے اختیار کو اضطرار سے بدل دیا ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اہلِ افتاء پیدا ہونے والی نئی شکلوں کے سلسلہ میں متفقہ طور پر کوئی ایک راہِ عمل متعین کر کے امت کو اس سے باخبر کریں، اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب کو کہ انہوں نے اس موضوع کو اٹھا کر جہاں امت مسلمہ کو سنبھالا ہے وہیں اہل علم وافتاء کے لئے یکجہتی کی ایک راہ بھی ہموار کر

دی ہے، اس مختصر سی تمہید کے بعد اب سوالات کے سلسلہ میں کچھ معروضات سپرد قرطاس ہیں:

۱— ربوا کے لغوی معنیٰ زیادتی، بڑھوتری کے ہیں، اصطلاح فقہاء میں ربوا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو کسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہو تقریباً سارے ہی حضرات فقہاء قدرے الفاظ کے تفاوت کے ساتھ یہی فرماتے ہیں:

"الربوا هو فضل خال عن عوض" (ملتقی الابحر ۲/ ۸۳)۔

لیکن لفظ سود ربوا کے پورے مفہوم کی ادائیگی سے قاصر ہے، اس لئے سود اور ربوا کو الفاظ مترادفہ میں سے سمجھنا غلط ہوگا، منطقی اعتبار سے دونوں میں عموم خصوص مطلق کا فرق ہے، ربوا اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور سود اس کی ایک شاخ ہے، اس لئے ہمارے عرف میں جو سود رائج ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے: روپیہ ایک متعین مدت کے لئے قرض دے کر معین شرح کے ساتھ زیادتی لینا۔

ربوا کی ساری صورتوں اور شکلوں کے تجزیہ کے بعد ربوا کی پانچ قسمیں سمجھ میں آتی ہیں اور اسی سے مختلف معاملات میں پھیلاؤ کا انداز معلوم ہوتا ہے، گو یہ قسمیں استقرائی ہیں:

۱— "ربوا قرض نی نی: اس کا حاصل قرض خواہ کا قرضدار سے حسب شرط متعینہ میعاد کے بعد اصل مال پر کچھ زائد لینا ہے۔

۲— "ربوا رہن نی نی: بلا کسی مالی معاوضہ کے وہ نفع جو مرتہن کو راہن یا شئی مرہون سے حاصل ہو۔

۳— "ربوا شرکت نی نی: ایک شریک اپنے دوسرے شریک کے لئے نفع متعین کر دے اور اس کے جملہ نقصانات و منافع کا خود مستحق بن جائے۔

۴— "ربوا نسیہ نی نی: دو چیزوں کے باہم لین دین میں یا خرید و فروخت میں ادھار کرنا اور اس ادھار کو تحصیل منافع کا ذریعہ بنانا۔

۵— "ربوا فضل نی نی: دو چیزوں کا کمی بیشی کے ساتھ باہم لین دین کرنا جب کہ اس

میں کمی بیشی درست نہ ہو، اس قسم کا تعلق خاص طور پر بیع صرف سے ہے۔

اس کے بعد یہ عرض کرنا غالباً خارج از موضوع نہ ہوگا کہ جن چیزوں سے معاملات کا تعلق ہوتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں، گو یہ بھی استقرائی ہیں: کیلی، وزنی، غیر کیلی غیر وزنی۔

کسی چیز کے مکیل یا موزون ہونے کی صفت کو اصطلاح فقہاء میں قدر کہتے ہیں اور اس کی حقیقت کو جنس کہتے ہیں، پھر اشیاء کی جنس وقدر کے اعتبار سے چار قسمیں ہیں:

۱- متحد الجنس، متحد القدر جیسے گیہوں اور جو۔

۲- غیر متحد الجنس، غیر متحد القدر جیسے بکری کی بیع بکری سے۔

۳- متحد الجنس، غیر متحد القدر جیسے کپڑے کی بیع کپڑے سے کہ جنس ایک ہے، لیکن نہ کیلی ہے اور نہ وزنی۔

۴- غیر متحد الجنس، متحد القدر جیسے گیہوں کی بیع نمک سے۔

ان اقسام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم میں سواء بسواء اور یداً بید دونوں واجب ہے، نہ یدا بید "فبیعوا کیف شئتم" میں داخل ہے اور تیسری قسم میں یدا بید واجب ہے سوائً بسواء واجب نہیں۔

ان تفصیلات وتصریحات فقہاء سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اصناف کے معاملات ایسے ہیں کہ اگر ان شرعی اصولوں کے مطابق نہیں کیا گیا تو ربوا لازم آئے گا، اس کے برخلاف سود کا پھیلاؤ اس اعتبار سے محدود در محدود ہے۔

۲- دار الحرب میں جو حضرات سود کو جائز قرار دیتے ہیں ان حضرات کی منتہائے نظر "لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" ہے۔ امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں اس کے غریب ہونے کی صراحت کی ہے، بعض طرق میں عن مکحول عن رسول اللہ ﷺ ہے، اس صورت میں اس کا منقطع ہونا متعین ہے، اس لئے کہ مکحول صحابی نہیں، اور اگر واسطہ مان لیا جائے حضور ﷺ اور مکحول کے درمیان ہو تو وہ واسطہ مجہول ہے، نیز غریب کے ساتھ "لیس

بثابت“ اور ”لا حجة فيه“ کی بھی تصریحات اس کے بارے میں ملتی ہیں، صحاح ستہ میں مذکور نہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے قابل استدلال مان لیا جائے تو اس کا مطلب وہ نہیں جو عموماً ذہنوں میں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر رہنے لگے، اس کے بعد عقود فاسدہ ربویہ کے ذریعہ مال حاصل کرے اور وہ مال لے کر دارالاسلام آجائے تو اس کے مال سے بیت المال کا حق خُمس متعلق نہ ہوگا، اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کے دارالحرب سے دارالاسلام انتقال کی صورت میں اموال محصّلہ فی دارالحرب پر اسی کی ملکیت ثابت رہے گی (ردالمحتار ۴/۱۸۸، مجمع الأنہر ۲/۹۰)۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مسلم مستامن دارالحرب میں رہتے ہوئے حربیوں سے عقود فاسدہ ربویہ کے ذریعہ جو مال حاصل کرتا ہے اس پر ربوا کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ جس طرح اشیاء مباحہ حطب، حشیش وغیرہ پر محض استیلاء موجب ملک ہے، اسی طرح یہاں بھی: البتہ غدر وخیانت سے بچنے کے لئے رضامندی ضروری ہے اور یہ بصورت عقد حاصل ہے اگرچہ عقد موجب ملک نہیں بلکہ موجب ملک تو استیلاء ہی ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/۱۹۲)۔

الحاصل اتنی بات تو درست ہے کہ سود کے تحقق کے لئے بدلین کا معصوم ومتقوم ہونا ضروری ہے اور اہل حرب کے اموال معصوم ومتقوم نہیں، لیکن اس پر یہ نتیجہ مرتب کرنا کہ پھر ہندوستان میں رہنے والے کافروں سے سود لینا جائز ہونا چاہیے، اس نتیجہ کو مرتب کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟

۳— ہندوستان کا دارالحرب ہونا یا نہ ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ قطعیت کے ساتھ فیصلہ بہت ہی دشوار ہے، اس لئے اس مسئلہ میں جہاں تک اپنے اسلاف کی آراء کا سوال ہے تو ان کی آراء دونوں خانوں میں منقسم ہیں، گو بعض رائے کے بارے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی رائے اس وقت کی ہے جب انگریزوں کا تسلط تھا اور ان کے ظلم واستبداد کی زد میں پوری انسانیت تھی لیکن جب حالات نے کروٹ لیا تو کیا اب بھی وہی حکم باقی رہے گا، یا وہ حکم بدل گیا؟ یہ مستقل

حل طلب امر ہے، جہاں تک حضراتِ فقہاء کی تصریحات کا سوال ہے تو اس سلسلے میں علاؤ الدین حصکفیؒ فرماتے ہیں:

"تنبیہ" ومن مهمات هذا الباب معرفة الإمام والدارين (الی ان قال) ودار الإسلام ما يجری فيها حكم إمام المسلمين ودار الحرب ما يجری أمور رئيس الكافرين (الكافی)۔۔۔۔ولا خلاف أن دار الحرب تصير دار الإسلام بإجراء بعض أحكام الإسلام فيها" (سکب الانہر ۱/ ۶۳۴)۔

ان تعریفات کی روشنی میں اگر ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہندوستان دارالحرب ہے، اس لئے کہ یقینا موجودہ صورت حال ایسی ہی بن گئی ہے کہ مسلمان کافروں سے خائف ہیں، فتاویٰ بزازیہ میں اس کی تفصیل موجود ہے (الفتاوی البزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/ ۶۱۲)۔

اس باب میں حلوانی کی عبارت خاصی واضح ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی دار کے دارالحرب ہونے کی تین شرطیں ہیں:

۱- کافروں کے احکام کا اجراء علی العلانیہ ہو اور حکّام کفر کی بنیادوں پر فیصلہ کرتے ہوں۔

۲- اس دار کا کسی دارالحرب سے اس طور پر متصل ہونا کہ دارالاسلام سے مدد پہنچنے کی کوئی امکانی صورت نہ ہو۔

۳- ایمان وامان موجب حفاظت نہ ہو، بلکہ کافروں کا امان اصل ہو، منطقی اعتبار سے ان شرائط کی حیثیت مانعۃ الخلو کی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر پہلی شرط بھی مفقود ہوگئی تو وہ دارالحرب نہیں کہلائے گا، بلکہ اس پر دارالاسلام کا اطلاق کیا جائے گا جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت: **"ألا يرى أن دار الحرب تصير دار الإسلام بمجرد إجراء أحكام الإسلام إجماعاً"** سے ظاہر ہے اور علامہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

"وقال شيخ الإسلام والإمام الإسبيجابی إن الدار محكومة بدار الإسلام

ببقاء حکم واحد فیها کما فی العمادیة وغیرها"(سکب الانہر بہامش مجمع الانہر ار ۶۳۴)۔

اور آگے فرماتے ہیں:

"**فالاحتیاط أن تجعل هذه البلاد دار الإسلام وإن کانت الید فی الظاهر للملاعنین ولهؤلاء الشیاطین**"(سکب الانہر ار ۶۳۴)۔

اس سے ظاہر یہی ہے کہ احتیاطاً اس دار کو دارالاسلام ہی کہا جائے گا جو کہ کافروں کے زیر تسلط ہو، اور اگر شرائط ثلاثہ جس کا تذکرہ امام کردری نے "الجامع الوجیز" نی میں اور علامہ علاؤالدین حصکفی نے "سکب الانہر" نی میں کیا ہے، ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہر شرط فی الجملہ ہندوستان پر غیر منطبق معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ قانونی و دستوری نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو بلا تفریق مذہب وزبان وعلاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملکی وسائل سے انتفاع کا حق دیا گیا ہے اور بنیادی طور پر ہر ایک مذہب والا اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرنے میں خودمختار ہے، چنانچہ مساجد ومراکز وخانقاہوں کا وجود وقیام، اعیاد واضحیہ و دیگر شعائر اسلام پر قانونی اعتبار سے کوئی پابندی نہیں، مذہب کا اشتہار وشیوع بشکل تبلیغ یا تقریر یا تحریر ہر مذہب والا کرسکتا ہے، چنانچہ ہو رہا ہے، دستوری اعتبار سے مسلم پرسنل لاء کا تحفظ بھی موجود ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے دلائل وشرائط کا تعارض تسلیم کرلیا جائے کہ ممکن ہے کسی کے پاس اس کے دارالحرب ہی ہونے کے دلائل وشرائط ہوں تب امام کردریؒ کے اس قول کو فیصل مان لیا جائے۔

" **وعند تعارض الدلائل والشرائط یبقی ما کان علی ما کان أو یترجح جانب الإسلام احتیاطاً**"(البزازیہ بہامش الہندیہ ۶ر ۳۱۲)۔

گو حضرات فقہاء نے دار کو دارالاسلام اور دارالحرب میں منحصر کیا ہے، جیسا کہ

☆ سابق نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ بہار۔

عبارات فقہاء سے ظاہر ہے، لیکن وجدانی طور پر دار کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے:

(۱) دارالاسلام (۲) دارالکفر اور پھر دارالکفر کی دو قسمیں ہونی چاہئیں: (۱) دارالامن، (۲) دارالشر والفساد جس کا دوسرا نام دارالحرب قرار دیا جائے اور پھر دارالامن کو امن وامان کی بنیاد پر دارالاسلام کا حکم دیا جائے اور دارلشر والفساد کو شر وفساد کی بنیاد پر دارالحرب قرار دیا جائے اور اس کی نظیر اس کو بنا سکتے ہیں کہ مکۃ المکرمہ سے حبشہ بہت سے صحابہ ہجرت کر کے گئے باوجود یہ کہ حبشہ دارالاسلام نہیں تھا، لیکن اس کو دارالحرب بھی نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ صحابہ پورے شعائر کے ساتھ رہے، بلکہ اس کو دارالکفر کہنا چاہیے، اس لئے کہ زمام کار مسلمان کے ہاتھ میں نہیں تھا اور مکہ مکرمہ بھی اس وقت دارالکفر ہی تھا، اس لئے کہ زمام کار کافروں کے ہاتھ میں تھا، لیکن صحابہ کے لئے حبشہ دارالامن تھا اور مکہ مکرمہ دارالشر والفساد تھا، اس تقسیم میں کافی وسعت ہے، لیکن اسلاف کے کلام سے تائید نہیں ملتی، اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس تقسیم کے اعتبار سے تو دارالاسلام کی بھی دو قسمیں ہونی چاہیے: (۱) دارالامن، (۲) دارالشر والفساد، اس لئے کہ حالات حاضرہ اس کے متقاضی ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دارالاسلام چاہے اپنے ساکنین کے لئے دارالامن ہو یا دارالشر اگر اسلامی قوانین، حدود وقصاص کا اجراء ہو رہا ہے تو وہ دارالاسلام ہی رہے گا، دارالشر والفساد ہونے سے دارالاسلام ہونے سے خارج نہیں ہوگا جیسے مدینہ طیبہ میں منافقین آئے دن شر وفساد پھیلاتے رہتے تھے، لیکن وہ دارالاسلام ہی رہا، دارالاسلام سے خارج نہیں ہوا۔

۴— اگر گھر میں حفاظت کی کوئی شکل ہو تو بینک میں روپیہ نہیں رکھنا چاہئے، بدرجہ مجبوری رکھنے کی اجازت ہے، اس لئے کہ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ بینک کا سارا نظام سودی ہے اور جتنا روپیہ جاتا ہے وہ سب اس نظام کے تحت استعمال کیا جاتا ہے اور نص قطعی ہے: **"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"** اور یہ سب روپیہ بینک میں رکھنے کی صورت میں تعاون علی الاثم لازم آئے گا جو ممنوع ہے، اسی وجہ سے حضرت گنگوہی وحضرت تھانوی نے اپنے فتاوی میں بینک

میں روپیہ جمع کرنے کو نا درست قرار دیا ہے، لیکن گھر میں غیر محفوظ علی شرف الخطر ہونے کی صورت میں "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اس صورت میں بھی کوشش اس کی ہو کہ "لاکرنی" لیکر اس میں رکھ دیا جائے یا پھر کرنٹ اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کر دیا جائے، لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہیں اپنائی گئیں بلکہ چالو کھاتہ کھول کر رقم جمع کیا ہے پھر اس پر سود ملے اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے، خواہ سرکاری ادارہ ہو یا غیر سرکاری، اس لئے کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اسے استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی تعاون علی الاثم کے دائرہ میں داخل ہے اور اگر اس سے اپنی عبادت گاہ وہ نہ بنائیں تو یقیناً وہ پیسہ کسی دوسرے راستے سے اسلام دشمنی پر خرچ ہوگا، یا اس سے اپنی پوزیشن وہ مضبوط کریں گے جو نتیجہ کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا، اس لئے "اذا ابتلی ببلیتین فلیختر أهو نهما"، ضابطہ کے اہون یہی ہے کہ اسے لے لے، بینک میں نہ چھوڑے۔

اب دوسرا سوال اس کے مصارف کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے کہ اسے کہاں صرف کیا جائے؟ اس کے مصارف کی تعیین سے قبل یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ اس مال کی حیثیت کیا ہے؟

تو اس کے سود ہونے کی وجہ سے مال حرام ہونا تو متعین ہے اور مال حرام کا صدقہ کرنا واجب ہے: "إذا حصل بسبب خبيث وهو التصرف فى مال الغير وما هذا حاله فسبيله التصدق" (ھدایہ)۔

لہذا سود کا واجب التصدق ہونا متعین ہو گیا، اب اس کے مصارف تین ہیں:

۱- فقراء کو دینا۔

۲- غیر واجبی ٹیکس اس سے ادا کرنا۔

۳- رفاہ عام کنواں، نل، بیت الخلاء وغیرہ میں لگانا، ان مصارف ثلاثہ میں سے مصرف اول یعنی فقراء کو دینا تو متفق علیہ ہے، اس میں اکابر و اصاغر کا کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی فرماتے ہیں: "الفقراء مصرفه عند جهل أربابه" (درمختار ۳/

۳۲۳)۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ ومفتیانِ دارالعلوم دیو بند تحریر فرماتے ہیں کہ فقراء پر صدقہ کردینا چاہئے، لیکن فقراء کو دینا بھی لا بشرط شئ نہیں ہے، بلکہ بشرط شئ ہے، اب ان شرائط کو عرض کرتا ہوں:

۱— فقراء مسلمین ہوں غیر مسلمین نہ ہوں، اس لئے کہ جب اس کا واجب التصدق ہونا متعین ہوگیا تو واجب التصدق اموال جیسے زکوۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ جس طرح غیر مسلم کو دینا جائز نہیں اسی طرح سود بھی غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے۔

۲— بلا نیت ثواب دیا جائے، اس لئے کہ مال حرام بہ نیت صدقہ دینا بہت خطرناک ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

”**رجل دفع إلیٰ فقیر من المال الحرام شیئاً یرجو به الثواب یکفر**“ (ردالمحتار کتاب الزکوۃ ۲/ ۲۹۳)۔

صدقہ کرنے والا تو صرف فراغِ ذمہ وسبکدوشی کی نیت سے دیدے۔

”**والظاهر أن المتصدق بمثله یبتغی أن ینوی به فراغ ذمته ولا یرجو به المثوبة**“ (معارف السنن ۱/ ۳۴)۔

۳— ان اعزاء کو نہ دیا جائے جن کو زکوۃ وغیرہ دینا جائز نہیں، الغرض واجب التصدق اموال کی طرح سود کی رقم میں بھی شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا۔

مصرف ثانی:

غیر واجبی ٹیکس میں سود کی رقم کو دینا ہے، اس ملک میں بہت سے ٹیکس غیر واجبی ہیں ان میں سود کی رقم دی جاسکتی ہے، اب تک ناکارہ کے علم میں اس مصرف کے بارے میں بھی کسی کا اختلاف نہیں اور غیر واجبی ٹیکس میں دینے کی اجازت یہاں سے ملتی ہے کہ مالِ حرام کا مالک

اگر معلوم نہ ہو اور نہ معلوم کرنا ممکن ہو تب فقراء پر تصدق واجب ہے، اور اگر معلوم ہو تو مالک کو پہنچانا ضروری ہے، اگر مالک زندہ نہ ہو تو اس کے ورثاء کو دیدے، چنانچہ علامہ علاؤ الدین حصکفی فرماتے ہیں:

"علیه دیون و مظالم وجهل أربا بها ویئس من معرفتهم فعلیه التصدق بقدرها من ماله" (ردالمحتار باب اللقطة ۴/ ۲۸۳)۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تصدق اسی وقت واجب ہے کہ مالک کا سراغ لگنا مشکل ہو جائے، سود کی رقم جب بینک سے حاصل ہوتی ہے تو اس اعتبار سے مالک معلوم ہے کہ بینک حکومت کی ملکیت ہے، اس لئے کہ جب بینک کا نقصان ہوتا ہے تو اس کی تلافی حکومت ہی کرتی ہے، کھاتہ داروں سے اس کو کوئی مطلب نہیں اور جو نفع ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ حکومت کے خزانہ کا ایک جز ہوتا ہے، لہذا حکومت پر رد غیر واجبی ٹیکس کی ادائیگی کے ذریعہ کر دیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ہی کے ذریعہ حکومت کے خزانہ میں یہ رقم پہنچائی جائے بلکہ اسے بینک ہی میں چھوڑ دیا جائے تو اس کا جواب اس سے پہلے آچکا ہے کہ اس کے ذریعہ غیر مسلمین کی پوزیشن مضبوط کی جائے گی یا اسے ایسی جگہ استعمال کیا جائے گا جس میں اسلام یا مسلمانوں کا نقصان ہو یا پھر وہ سودی کاروبار کا جز بنے گا، یہ بھی تعاون علی الاثم کے تحت ممنوع ہے، اب اگر یہ سوال ہو کہ یہ تو اچھا نسخہ ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ادا کرنے کی نیت سے بینک میں رقم جمع کرادی جائے اور جب سود ملے تو اس سے غیر واجبی ٹیکس ادا کر دیا جائے؟ تو اس کا جواب بھی ابھی نمبر ۴ ہی کے تحت گذر چکا ہے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ بینک میں رقم ہی جمع نہ کی جائے، لیکن بدرجۂ مجبوری گھر میں حفاظت کی شکل نہ ہونے کی صورت میں بینک میں جمع کرنے کو جائز کہا گیا ہے، اسی وجہ سے فکس ڈپوزٹ کو ناجائز کہا گیا ہے کہ بلا ضرورت متعین میعاد تک کے لئے رقم جمع رکھنے کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رقم دوگنی ہو کر

ملے گی، غرض کہ شروع ہی سے نیت سود لینے کی ہوتی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ایسا ہو جس کا تعلق حکومت کے خزانہ سے ہو، یعنی اس مد کی رقم حکومت کے خزانہ میں جاتی ہو۔

لیکن غیر واجبی ٹیکس میں بھی اس سودی رقم کو دے سکتے ہیں جو ایسے بینک سے حاصل ہوئی ہو جو شخصی اور غیر سرکاری نہ ہو بلکہ سرکاری ہو، اگر غیر سرکاری بینک ہے تو اس رقم کا غیر واجبی ٹیکس میں دینا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں مالک پر عود نہیں ہو سکے گا، اس لئے غیر سرکاری بینک سے حاصل ہونے والی سودی رقم کا مصرف اول یعنی فقراء پر تصدق متعین ہے، لیکن سود کی رقم لینے کے سلسلے میں سرکاری وغیر سرکاری دونوں بینکوں کا حکم ایک ہے، اس لئے کہ تعاون علی الاثم وتعاون علی مخالفۃ الاسلام وتقویۃ اعداء اسلام دونوں صورتوں میں لازم آئے گا، لہذا بینک سرکاری ہو یا غیر سرکاری سود بینک میں ہرگز نہیں چھوڑا جائے گا۔

مصرف ثالث:

رفاہی چیزوں میں سود کے پیسوں کا استعمال ہے، لیکن یہ مصرف شدید اختلافات کا شکار ہے، چنانچہ خود اکابرین کی دو طرح کی مطبوعہ رائیں ملتی ہیں، لیکن ناکارہ کے نزدیک راجح دلیل کے اعتبار سے رفاہِ عام میں خرچ کرنے کا عدم جواز ہے، اس لئے کہ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ سود حرام ہے اور مال حرام کا مالک نہ ملنے کی صورت صدقہ کرنا واجب ہے اور صدقہ کی حقیقت ''العطیۃ نی نی ہے اور اس کا رکن نفس الاداالی المصرف ہے جس کا حاصل فھی التملیک کالزکاۃ ہے، اور رفاہی کاموں میں لگانے کی صورت میں تملیک کا تحقق نہیں ہو پائے گا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''إذا كانت لقطة أوغصبا أو رشوة ... والفقراء مصرفه عند جهل أربابه'' (ردالمحتار کتاب اللقطۃ ۴/ ۲۸۳)۔

نیزامام کردریؒ کے اس جزئیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو''الجامع الوجیز ثانی'' میں ہے، نیزامام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الآثار ثانی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اسی وجہ سے مفتی محمد شفیع صاحب، مہدی حسن صاحب اور حضرت مفتی محمود حسن صاحب مدظلہ ودیگر اکابرین بھی اسی کے قائل ہیں کہ سود کے پیسے کو مدارس کی تعمیر، کنواں، راستہ، نل رفاہ عام میں لگانا جائز نہیں۔

اور اگر اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو ''**إذا اجتمع الحلال والحرام فغلب الحرام**'' یا ''**إذا اجتمع المبيح والمحرم فغلب المحرم**'' سے بھی جانب عدم جواز احوط معلوم ہوتا ہے۔

دلائل کے اعتبار سے ناکارہ کے نزدیک راجح تو یہی ہے کہ رفاہی کاموں میں سود کے پیسوں کو استعمال نہ کیا جائے لیکن اکابرین کے اس اختلاف سے بچنے کے لئے اب تک ناکارہ اس صورت کو مختلف فیہ قرار دیکر متفق علیہ پر عمل کے ارجح ہونے کا فتویٰ دیتا رہا۔

حدیث: ''**لعن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم اكل الربا وموكله**'' (مشکوۃ المصابیح ۱؍ ۲۴۴) کا عموم سود لینے دینے والے کو یکساں طور پر شامل ہے، لہٰذا جس طرح سود لینے والا گنہ گار ہے، اسی طرح سود دینے والا بھی گنہگار ہے، یہاں البتہ کاروباری لائن میں بعض شکلیں ایسی ہیں جن میں مجبوراً سود دینا پڑتا ہے اور زبردستی سود کے نام پر رقم وصول کرلی جاتی ہے مثلاً ایک کاشتکار نے بوائی کے وقت دوسرے کاشتکار سے ایک من غلہ لیا وہ کٹائی کے وقت اس کے بدلہ ڈیڑھ من لیتا ہے جبکہ آدھا من زائد سود ہوا، لینے والا گنہ گار ہوگا دینے والا نہیں (محمودیہ ۴؍ ۲۴۳)، اسی طرح بیمہ کو ناجائز کہا گیا ہے، اس لئے کہ وہ سود وجوا پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن اگر بغیر بیمہ کے بغیر مال کی حفاظت نہ ہوسکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو جائز قرار دیا گیا ہے، جس طرح پگڑی کے مسئلہ میں بھی گنجائش نکل سکتی ہے اور جس طرح سود حرام ہے، اسی طرح رشوت بھی حرام ہے لیکن بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں رشوت دینے والا گنہگار نہیں ہوتا جس کی تفصیل ردالمحتار میں ہے،

اسی طرح سود کے مسئلہ میں اس صورت کا وجود مستبعد نہیں، البتہ سود لینے والا ہر حال میں گنہگار ہوگا، الّا یہ کہ اضطرار کی حالت ہو لیکن سود دینا کن صورتوں میں نا جائز ہے اور کن صورتوں میں گنجائش نکل سکتی ہے اس کی تعیین کے لئے اصولی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک واقعہ سامنے نہ ہو اور اس کے تمام اجزاء پر مع مالہ وما علیہ گہری نظر نہ ڈال لی جائے۔

۶ — ہاں البتہ سودی قرض لینے کی حضرات فقہاء نے بعض صورتوں میں اجازت دی ہے اور اس باب میں سرمایۂ کل علامہ حموی کا ذکر کردہ وہ جزئیہ ہے جو الاشباہ مع الحموی (ص ۱۴۹) پر مذکور ہے: **"یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"** جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محتاج سودی قرض لے سکتا ہے، لیکن محتاج کی کوئی توضیح وتشریح نہیں کی، ظاہر یہی ہے کہ محتاج سے مراد ایسا شخص ہے جو کمائی پر قدرت نہ رکھتا ہو، بغیر قرض کے گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو، اور قرض بغیر سود کے ملتا نہ ہو، چونکہ ایسا شخص مجبوری کی حد تک معذور ہے اس لئے گنہگار نہیں ہوگا۔

لیکن کیا وہ لوگ جو صاحبِ ثروت ہیں لیکن قانونی گرفت سے اس قدر مجبور ہیں کہ بلاواسطہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے، اگر کارخانہ لگانا ہے، فیکٹری بنانی ہے، جیپ یا ٹریکٹر خریدنا ہے تو بغیر بینک کے واسطہ کے نہیں خرید سکتے اور ہرگز نہیں خرید سکتے، اگر خرید لیا تو لینی کی دینی پڑ جاتی ہے اور اگر براہ بینک آپ وہ کام کرتے ہیں تو جھک مار کے آپ کو سود دینا ہوگا ورنہ قرقی ہو جائے گی۔ اب ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امت مسلمہ کو صرف یہ کہہ دینے سے علماء ومفتیان کرام بری ہو جائیں گے کہ کیا ضرورت ہے ٹرک وٹریکٹر وجیپ لینے کی، اور کیا ضرورت ہے کارخانہ لگانے کی۔

جبکہ اس گئے گذرے دور میں بھی ایسے افراد ہر جگہ موجود ہیں جو جائز طریقہ کے متلاشی ہیں، اور ان کی نگاہیں مفتیان کرام کے قرطاس وقلم پر جمی ہوئی ہیں، کیا ایسا ممکن نہیں کہ جس طرح

تصویر کھینچوانا حرام ہے لیکن جب قانونی طرز پر تصویر لازمی قرار دیدی گئی تو تصویر کھینچوانا جائز ہو گیا۔

اور بیمہ، سود و جوا کی وجہ سے حرام ہے، لیکن قانونی مجبوری کی وجہ سے بیمہ جائز ہو گیا کہ بغیر انشورنس کے گاڑی روڈ پر نہیں آسکتی، جیسا کہ اکابرین کے فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے، تو کیا کاروباری لائن میں براہِ بینک کاروبار کو عملی شکل دینے کی شرط قانونی مجبوری کے تحت داخل نہیں اور کیا ایسا صاحب ثروت کاروباری مجبوری کی حد تک معذور نہیں، ناکارہ کے فہم ناقص کے مطابق تو ان جزئیات سے جواز کے اشارے ملتے ہیں، لیکن ناکارہ کو اس پر اصرار نہیں، تاہم یہ پہلو رجحان سے خالی بھی نہیں ہے، اربابِ افتاء کی خصوصی توجہ درکار ہے، البتہ ایسا شخص جس کا کاروبار بقدر کفاف ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زائد ہے اور کاروبار ایسا ہے کہ اس میں بینک کا کوئی واسطہ نہیں، لیکن بر بنائے حُبِّ دنیا اس کاروبار کو وہ پھیلانا چاہتا ہے، لیکن اس کی موجودہ پونجی موجودہ کاروبار میں مشغول ہے، اگلے پروگرام کو وجود دینے کی اس پونجی میں سکت نہیں، اس نے اس موقع پر بینک کا سہارا لیا اور سودی قرض (لون) لے کر اگلے پروگرام کو بڑھایا تو ایسے شخص کو سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، چونکہ یہ شخص نہ محتاج ہے کہ "یجوز للمحتاج۔۔۔" جزئیہ کا ترتب ہو سکے اور نہ مجبور ہے کہ " الضرورات ۔۔۔" کلیہ کے تحت اسے معذور قرار دیا جاسکے۔

۷— اس سوال کا جواب بھی سوال نمبر ۶ کے جواب کے ضمن میں آچکا ہے کہ اگر محتاج ہے تو جائز ہے اور اگر مجبور ہے تو بدرجۂ مجبوری بوقت مجبوری معذور ہے، اور اگر نہ محتاج ہے نہ مجبور ہے تب گنہگار ہوگا، تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ جہاں تک فی نفسہ قرض کی بات ہے اس کا لینا تو قرض کے درجہ میں جائز ہے، لیکن چونکہ یہ قرض مفضی الی امرحرام ہے، اس لئے ایسے قرض کا لینا ہی ممنوع قرار دیدیا گیا، الّا یہ کہ محتاج یا مجبور ہو جس طرح حضرات فقہاء نے جوان کو روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینے سے منع کیا ہے کہ بوسہ فی نفسہ حرام نہیں بلکہ جوان ہونے

کی وجہ سے اس کا بوسہ حرام کام کی طرف مفضی ہوسکتا ہے، اس لئے بوسہ ہی سے روک دیا گیا، بخلاف بوڑھے کے کہ اس کے لئے ممنوع نہیں۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: سوال: گورنمنٹ کی طرف سے کاشت کاروں کو بونے کے لئے سود پر غلہ اوکھ فصل پر دی جاتی ہے، فصل کٹنے پر جتنا دیا جاتا ہے اس سے زیادہ مقررہ مقدار میں لے لیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سود ہے۔ جواب: کاشت کار کو جو ملا ہے وہ قرض ہے سود نہیں پھر اس سے جو مقدار زائد واپس لی گئی ہے وہ سود ہے (۴/۲۴۲)۔

۸ــ اگر سرکاری چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں سود دینے کی نوبت نہ آئے تو اس کے لینے میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں، چاہے وہ اپنے یہاں چھوٹ والی رقم کو جس نام سے درج کرے۔

۹ــ اس کا جواب بھی سوال نمبر ۶ کے جواب کے ضمن میں آچکا ہے، ناکارہ کی ناقص سمجھ کے اعتبار سے تو غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں حکومت جو سود لیتی ہے شرعاً حکومت کو اس کا کوئی حق نہیں، لیکن بدرجۂ مجبوری جس طرح انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ دینا پڑتا ہے، اسی طرح حکومت سود کے نام پر گویا کہ بیرونی ملک سے تجارت کا ایک ٹیکس لیتی ہے، گو اس کے بعد اصل ٹیکس بھی وصول کرتی ہے لیکن اس کی بھی حیثیت ٹیکس ہی کی ہے، گو حکومت کی اصطلاح میں اس کا نام سود ہے، اس لئے بیرونی ملک سے تجارت کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۱۰ــ بینک خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری اگر مقدار قرض سے زیادہ وہ ادارہ قرض خواہ سے وصول کرتا ہے تو "کل قرض جر نفعا فهو حرام" (رد المحتار ۴/۱۷۴) کے تحت دونوں کا حکم ایک ہی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں، البتہ سود کی رقم کی ادائیگی میں فرق ہوگا، جس کی تفصیل سوال نمبر ۴ کے جواب میں آچکی ہے۔

۱۱ــ جن کمپنیوں کا تذکرہ سوال نمبر ۱۱ میں ہے ان کمپنیوں کے واسطہ سے ٹرک وغیرہ

خریدنے کی اجازت نکل سکتی ہے، اس طور پر کہ خریدار اپنا پیسہ اپنے پاس محفوظ رکھے اور کمپنی سے رابطہ قائم کر کے اس سے کہے کہ مجھے ایک ٹرک لینا ہے، فرض کیجئے اس کی قیمت تین لاکھ ہے، لیکن اس پر کمپنی سود کے نام سے جو رقم لے گی وہ تیس ہزار ہے، تو کمپنی والے اپنی اس زائد رقم کو اصل قیمت کے ساتھ شامل کر کے کل ثمن ۳رلاکھ ۳۰ ہزار قرار دیں اور خریدار سے کہیں ہم آپ کو ۳رلاکھ ۳۰ ہزار میں ٹرک دیں گے اور خریدار اس کو منظور کر لے، اب گویا کہ ۳رلاکھ ۳۰ ہزار میں خریدار نے ٹرک خریدا ہے جب ۳۰رہزار کو ثمن کا جز قرار دے دیا جائے گا تب خریدار سود دینے والا نہیں کہلائے گا اور ٹرک حاصل ہونے کے بعد ایک مشت خریدار کو رقم ادا کردے گا، لیکن یہ اسی شخص کے لئے ہے جس کے پاس پوری رقم موجود ہو، لیکن قانونی مجبوری کی وجہ سے ٹرک نہ خرید سکتا ہو، ایسے شخص کے لئے بینک کا واسطہ لینے سے یہ بہت اَہون ہے، اس لئے کہ یہ مشکل جو اوپر جواز کی ذکر کی گئی، بینک میں اس کا اجراء مشکل ہے، اس لئے کہ بینک سے تو ضرورت ظاہر کر کے قرض لینا پڑتا ہے جب کہ یہ شخص ضرورت مند نہیں ہے، پھر یہ سود کیسے دے سکتا ہے، بخلاف کمپنی کے واسطہ کے کہ وہاں قرض لینے کی ضرورت نہیں، صرف اپنی پونجی کی حفاظت کے لئے اور کمپنی کے واسطہ کو بطور ''شونی'' کے استعمال کر رہا ہے، ہاں اگر اتنی رقم نہ ہو جس سے ٹرک خرید سکے اس کو بہر حال قرض لینا ہے، اب یہ چاہے بینک سے قرض لے کر بینک کو سود ادا کرے یا پرائیویٹ کمپنی سے قرض لے کر سود ادا کرے، بہر حال اس کو سود ادا کرنا ہے اور یہ نہ محتاج ہے نہ مجبور، اس لئے اس کے لئے یہ جائز نہ ہوگا۔ الا یہ کہ یہ شخص وہی صورت اختیار کرے یعنی جز ثمن کل رقم کو قرار دے کر کمپنی ہی سے ٹرک لے اور کمپنی والے پوری رقم کو ثمن قرار دیں تب اہل افتاء کے لئے یہ صورت بھی محل غور ہوگئی اور اصل ثمن سے زائد رقم جس کو کمپنی سود کا نام دے رہی ہے خریدار اس کو حق المحنت یا دلّالی کے دائرہ میں داخل کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس پر غور وفکر کی ضرورت ہوگی۔

☆☆☆

سودی معاملات
شریعت کی نظر میں

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوریؒ ☆

۱– ربوا کی لغوی تعریف:

ربوا لغت میں مطلق زیادتی اور اضافہ کو کہتے ہیں (درمختار علی ہامش الطحطاوی ۳/۱۰۷)۔

صاحب معجم لغۃ الفقہاء ربوا کی لغوی تعریف کرتے ہوئے تحریری فرماتے ہیں:

"الرّبا :بکسر الرّاء من رِبا الشئی یربو ربواً :إذا زاد" (معجم لغۃ الفقہاء/۲۱۸ مطبوعہ بیروت)۔

رِبا راء کے کسرے کے ساتھ ربا الشئی یربو ربواً سے ماخوذ ہے، یہ جملہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی چیز میں اضافہ ہوتا ہے، علامہ ابوالقاسم الحسین بن محمد راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) مفردات القرآن میں ربوا کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"الرّبا :الزیادۃ علی رأس المال لکن خص فی الشرع بالزیادۃ علی وجہ دون وجہ" (مفردات القرآن/۱۸۷ مطبوعہ بیروت) (ربوا لغت میں راس المال پر زیادتی کا نام ہے، اور شریعت میں ایک مخصوص زیادتی کو ربوا کہا جاتا ہے)۔

ربوا کی اصطلاحی تعریف :

صاحب معجم لغۃ الفقہاء نے ربوا کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :"کل

زيادة مشروطة فی العقد خالية عن عوض مشروع" (معجم لغۃ الفقہاء/۲۱۸) ربوا ہر وہ زیادتی ہے جو عقد میں مشروط ہو اور عوض مشروع سے خالی ہو۔

فقہاء نے ربوا کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی ہے: "اموالِ ربویہ میں سے کسی چیز کا ہم جنس کے ساتھ تبادلہ کرنے کا معاملہ کیا جائے اور اس میں کسی ایک جانب سے بلاعوض اضافے کا دینا بھی مشروط ہو یعنی اضافہ کی شرط بطور جزو معاہدہ ہو۔" اس طرح کے معاملے کے نتیجے میں جو اضافہ ہوگا وہ "ربوانی نی کہلائے گا (بینک انشورنس اور سرکاری قرضے/۱۷، نیز دیکھئے: درمختار علی ہامش الطحطاوی ۳/۱۰۷، مجموعۃ الفتاوی ۲/۱۳۹)۔

ربوا کا دائرہ:

ربوا کی تعریف صادق آنے کے لئے چار اسباب کا پایا جانا ضروری ہے:

۱—ہم جنس چیز کے تبادلہ کا معاملہ ہو۔

۲—وہ جنس "اموال ربویہ نی نی میں سے ہو۔

۳—اضافہ ایک ہی جانب سے ہو یعنی دوسری جانب سے اس کا کوئی واقعی ایسا بدل نہ ہو، جسے شرعاً بدل قرار دیا جا سکے۔

۴—اس اضافہ کا لینا دینا عقد معاملہ کرتے وقت ہی بطور لازمی جز کے طے ہو چکا ہو۔

اگر ان میں سے ایک چیز بھی موجود نہ ہوگی تو وہ اضافہ شرعاً "ربانی نی نہیں کہلائے گا، اور اس کا لینا دینا جائز قرار پائے گا۔

چنانچہ اگر کوئی شخص دوسرے کسی شخص سے قرض لیتا ہے اور قرض کا معاملہ کرتے وقت اضافہ کی نہ شرط لگائی تھی، نہ نیت کی تھی، لیکن اگر اس صورت میں بوقت ادائیگی کچھ زیادہ دیتا ہے تو اس اضافہ کا لینا اور دینا دونوں جائز ہوگا، کیونکہ "ربوانی نی کے چار اسباب میں سے ایک سبب (اضافہ بوقت عقد مشروط ہو) نہیں پایا گیا۔

ربوا کا تحقق کب ہوگا؟

''ربوانی نی کے وجود وتحقق کے لئے مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ فقہاء نے چند شرطیں بھی لکھی ہیں، ان شرطوں کے پائے جانے کے بعد ہی ''ربوانی نی کا تحقق ہوسکے گا، وہ یہ ہیں:

۱۔ بدلین کا معصوم (معصوم سے وہ مال مراد ہے جو کسی کی ملک میں ہو اور اس پر دوسرے کا قبضہ اور تصرف جائز نہ ہو اور ایسا کرنا باعث گناہ ہو اور اس کو ضائع کرنے کی صورت میں ضمان واجب ہوتا ہو) **اور ذی قیمت ہونا۔**

۲۔ ہر دو بدل کا متعاقدین میں سے کسی ایک کی ملکیت میں نہ ہونا۔

۳۔ ہر دو بدل کا اس مشترک مال میں سے نہیں ہونا جس میں ہر دو فریق عنان (اس میں نہ تو سرمایہ کا برابر ہونا ضروری ہے اور نہ نفع میں برابری شرط ہے، اس میں ہر شخص شریک ہوسکتا ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) **یا مفاوضہ** (شرکت مفاوضہ میں سرمایہ اور نفع میں برابری ضروری ہے، اس میں شرکاء میں سے ہر ایک کو دوسرے کے مال میں تصرف (خرید وفروخت) کرنے، کرایہ پر لینے اور دینے کا حق حاصل ہوتا ہے) **کے شریک ہیں۔**

لہذا حربی (کافر) یا وہ مسلمان جس نے دارالحرب سے ہجرت نہیں کی اس کا مال اس مسلمان کے لئے جو دارالاسلام میں رہتا ہے اور قید ہو کر دارالحرب چلا گیا ہے، یا وہ مسلمان جو اجازت (ویزا) لے کر دارالحرب میں تجارت کے لئے گیا ہے، اس کے لئے معصوم اور متقوم نہیں، اس لئے اگر معاملہ میں کوئی غدر ودھوکہ نہ کیا جائے تو اس قیدی اور تاجر کے لئے جس کا بیان اوپر ہوا حربی (کافر) اور مسلم غیر مہاجر کا مال ''ربوانی نی کی صورت میں بھی لینا جائز ہوگا، اس لئے کہ یہ صورتاً تو ''ربوانی نی ہے، لیکن شرط موجود نہیں ہے، اس لئے ''ربوانی نی کا تحقق نہیں ہوگا، اسی طرح غلام اور اس کے آقا کے درمیان اور باہم شرکت مفاوضہ یا شرکت عنان رکھنے والے دو شخصوں کے درمیان مال شرکت میں ''ربوانی نی کا تحقق نہیں ہوتا، علامہ

شامی شرنبلالیہ کے حوالہ سے ''ربوانی نی کی شرائط ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:
''ربوانی نی کے متحقق ہونے کی شرطوں میں سے یہ ہے کہ عوضین مال معصوم ہوں اور ضائع ہونے پر ان دونوں کا تاوان واجب ہوتا ہو، لہذا صرف ایک طرف کے عوض کا معصوم اور غیر متقوم ہونا اس معاملے کے جواز کے لئے مانع نہ ہوگا، لہذا قیدی یا تاجر کا حربی یا دارالحرب کے ایسے مسلمان کا مال جس نے ہجرت نہ کی ہو، اسی جنس کے مال کے بدلے میں اضافہ کے ساتھ خریدنا درست ہے، ربوا کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ عوضین فریقین میں سے کسی ایک ہی کی ملک نہ ہوں، جیسے آقا کا معاملہ اپنے غلام کے ساتھ (کہ غلام کی طرف سے جو عوض ہے اس کا مالک بھی آقا ہی ہے، کیونکہ غلام خود کسی شئی کا مالک نہیں ہوتا ہے) اور نہ فریقین میں شرکت عنان یا شرکت مفاوضہ کا معاملہ ہو (شامی ۴/ ۲۴۴)۔
مذکورہ بالا اسباب اور شرائط کے پائے جانے کے بعد ہی ''ربوانی کا تحقق ہوگا۔

دارالحرب میں سودی معاملات کی شرعی حیثیت:

حضرت اماا عظم ابوحنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا درست ہے، اور دارالحرب میں سودی معاملات، حقیقۃً سود قرار نہیں دیئے جاسکتے، اس لئے کہ اہل حرب کے اموال معصوم اور قابل ضمان نہیں، اور سود کے تحقق کے لئے بدلین کا معصوم ومتقوم ہونا ضروری ہے، لہٰذا اس شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے حقیقۃ ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ اگرچہ صورۃ وہ معاملات سودی ہوں، حضرت امام ابو یوسف، ائمہ ثلاثہ: حضرت امام شافعی، امام مالک اور امام احمد دارالحرب میں بھی سودی معاملات کو نا جائز قرار دیتے ہیں (دیکھئے: الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ۴/ ۲۶۱)۔

حربی اور امان لے کر آنے والے مسلمان کے درمیان سود نہیں، اگرچہ وہ مال، عقد فاسد، یا قمار کے ذریعہ ہی کیوں نہ حاصل ہو، اس لئے کہ اس کا مال مباح ہے، لہذا اس کی رضا سے لینا مطلقا بغیر کسی غدر اور دھوکہ کے بھی جائز ہوگا، بخلاف امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ

کے، اور اس شخص کا حکم جس نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا اور ہجرت نہیں کی حربی ہی کا ہے، مسلمان کے لئے اس سے سودی معاملہ کرنا جائز ہے، بخلاف صاحبین کے، اس لئے کہ اس کا مال معصوم نہیں ہے، پھر اگر وہ ہجرت کر کے ہمارے پاس آ گیا پھر ان کی طرف لوٹ گیا تو بالا تفاق اس سے سودی معاملہ جائز نہ ہوگا، نیز حضرت امام حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک دار الحرب میں مسلمانوں کے لئے وہاں کے حربی باشندوں سے سود و قمار کے ذریعہ بلا غدر و دھوکہ رقم حاصل کرنا جائز ہے، سود دینا مسلمانوں کے لئے دار الحرب میں بھی جائز نہیں ہے، صاحب فتح القدیر علامہ ابن الہمام ''ولا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب'' کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ظاہر یہ ہے کہ اباحتِ ربوا مسلمان کے لئے زیادتی کے حصول کا فائدہ دیتی ہے اور اصحاب درس علماء کا اس پر اصرار ہے کہ ربوا اور قمار کے جواز سے مراد یہ ہے کہ جب اس کے ذریعہ اضافی رقم مسلمان کو حاصل ہو، علت ربوا پر نظر ڈالتے ہوئے اگرچہ جواب کا اطلاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دار الحرب میں مطلقاً سودی معاملات جائز ہیں'' (فتح القدیر ۶/۱۷۸)۔

امام ابو حنیفہ کا مستدل :

حضرت امام ابو حنیفہ دار الحرب میں سودی معاملات کے جواز پر اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں حربی اور مسلم کے درمیان ''ربوا'' کی نفی کی گئی ہے اور جسے مکحول جناب نبی کریم ﷺ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں اور چونکہ مکحول ثقہ ہیں، اس لئے ان کے مراسیل حجت تسلیم کئے جاتے ہیں، جو لوگ دوسری رائے رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر روایت کو ثابت تسلیم کر بھی لیا جائے جب بھی ''لا ربوا'' میں ''لا'' کو بمعنی نہی و ممانعت لیا جا سکتا ہے، جیسا کہ نصوص شرعیہ میں بکثرت وارد ہے، مثلاً: ''فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج''، ''ای لا ترفثوا ولا تفسقوا ولا تجادلوا''، اور اس صورت میں ''ولا ربوا بین المسلم

والحربی فی دار الحرب" کا مفہوم یہ ہوگا کہ دار الحرب میں بھی حربی اور مسلمان کے درمیان سود حرام اور ممنوع ہے۔

نیز اس روایت کو محقق ابن الہمام نے غریب قرار دیا ہے، امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ روایت ثابت ہی نہیں ہے، ابن ہمام نے فتح القدیر میں حدیث اور اس سے استدلال پر تفصیلی بحث کی ہے (فتح القدیر ۶/۱۷۸)۔

حضرت امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ کے مسلک کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ نصوص قرآن اور نصوص حدیث علی الاطلاق سود کی حرمت وشناعت پر دلالت کرتی ہیں، اموال کے بارے میں بھی کوئی تفصیل موجود نہیں ہے کہ فلاں قسم کے اموال میں سود متحقق ہوگا اور فلاں میں نہیں، نیز شریعت کے احکام کسی مکان وزمان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، مثلاً جھوٹ، زنا، غصب، غیبت، شرب خمر اور سرقہ جس طرح دار الاسلام میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے حرام ہیں، اسی طرح دار الحرب اور صحرا و بیابان میں رہنے والے مسلمانوں پر بھی حرام ہیں۔

اور مختلف دلائل کے علاوہ جو ان کے مسلک کو سب سے قوی بنا دیتی ہے یہ حقیقت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے جس وقت سود کے خاتمہ کا اعلان فرمایا تھا، اس وقت حضرت عباس بن عبد المطلب اور دوسرے مسلمانوں کے سودی کاروبار کا بڑا حصہ کافروں سے متعلق تھا، مگر ہر قسم کے سود یک قلم منسوخ کر دیئے گئے، اور ایسا کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، اگر دار الحرب میں سودی معاملات جائز ہوتے، اور دار الحرب کے حربی سے مسلمانوں کے لئے سود لینا جائز ہوتا، تو آپ ﷺ کبھی بھی مسلمانوں کی ان سودی بقایا کے خاتمہ کا اعلان نہیں فرماتے جو غیر مسلموں سے متعلق تھیں، قرآن کریم میں مسلمانوں سے کہا گیا:

"وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" (سورۂ بقرہ ۲۷۸:) (جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو)، اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی سودی بقایا جات چھوڑ دیں، چاہے وہ بقایا غیر مسلموں کے ذمہ ہوں یا مسلمانوں کے۔

پس حاصل یہ ہے کہ سودی معاملات چاہے دارالاسلام میں کئے جائیں یا دارالحرب اور دارالکفر میں، اور مسلمان چاہے دارالاسلام میں سود لے یا دارالحرب میں، ہر جگہ اس کے لئے سودی معاملہ کرنا ناجائز ہے، اس لئے کہ بحیثیت مسلمان ہر جگہ وہ احکام اسلام کا پابند ہے، المبسوط للسرخسی میں ہے:

"ولأن المسلم ملتزم بحكم الإسلام حيث ما يكون" (المبسوط للسرخسی ۱۲۸/۴)

(اور اس لئے کہ مسلمان حکم اسلام کا پابند ہے چاہے جہاں بھی رہے)۔

دارالحرب میں سودی معاملات کے جواز کا مفہوم:

اس سے قبل یہ بات گذر چکی ہے کہ دارالحرب میں صرف مسلمانوں کے لئے سود لینا جائز ہے، دینا جائز نہیں ہے، نیز حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک دارالحرب میں سودی معاملات کا جواز صرف اس مسلمان کے حق میں ہے جو دارالاسلام سے امان (ویزا) لے کر دارالحرب آیا ہو، ایسے مسلم مستامن کے لئے دارالحرب کے غیر مسلموں سے سود وقمار کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز ہے، درمختار میں ہے: **"ولا بين حربي و مسلم مستامن"** (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲۶۱/۴)۔

۳- دار کی قسمیں:

دستوری قانون کی رو سے اسلام دنیا کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے، ایک دارالاسلام، دوسرے دارالحرب۔

دارالاسلام: دارالاسلام دنیا کا وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو، اور شریعت اسلامی کے احکام وقوانین اس ملک میں نافذ ہوتے ہوں، حدود وقصاص کا اجراء ہوتا ہو اور وہاں کا نظام مملکت اصول اسلام پر استوار ہو (دیکھئے: ہندوستان اور مسئلہ امارت ۴)۔

دارالاسلام میں چاہے شخصی حکومت ہو یا شورائی ہر دو صورت میں اس کا نظام قوانین

خداوندی کے مطابق ہوتا ہے، حضرات خلفاء راشدین کے عہد میمون میں اسلام کا نظام مملکت ''شوری نی نی کی مضبوط بنیادوں پر قائم تھا، اور خلفائے راشدین کے بعد نظام مملکت شخصی ہو گیا، دونوں نظاموں میں فرق یہ ہے کہ شورائی نظام میں امور مملکت اراکین شوری کے باہمی مشوروں سے طے پاتے ہیں، جو شریعت اسلامی کی نظر میں بے حد مستحسن ہے اور جسے قرآن نے ''وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ'' کہہ کر سراہا ہے، اس کے برخلاف شخصی حکومت میں امور سلطنت خود حاکم اعلیٰ اپنی آراء سے طے کرتا ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔

دارالکفر :

دارالکفر دنیا کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں اقتدار اعلیٰ کافروں کو حاصل ہو، اور اس کے احکام وقوانین ملک میں نافذ ہوتے ہوں، چاہے اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنے مذہب اور شعائر اسلام پر عمل پیرا ہونے کی آزادی حاصل ہو، مولانا عبدالصمد رحمانی دارالکفر کی تعریف میں تحریر فرماتے ہیں:

دارالکفر دنیا کے اس حصہ ملک کو کہتے ہیں جہاں غیر مسلموں یعنی کافروں کا غلبہ ہو اور اس کے قوانین و احکام ملک میں نافذ ہوتے ہوں، خواہ ان کی کوئی باضابطہ آئینی حکومت ہو یا غیر آئینی، جمہوری ہو یا شخصی اور اسی قسم کے ملک کو فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالحرب بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس قسم کے ملک میں احکام اور قوانین الٰہی کی تنفیذ کے لئے حرب و جنگ بھی ہوسکتی ہے، اگرچہ کسی وقت مجبوراً یا مصلحۃً اس ملک کے حاکم کفار سے جنگ نہ ہو اور بظاہر امن و امان ہو (ہندوستان اور مسئلہ امارت ر ۴)۔ مولانا مودودی کے الفاظ میں وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی قانون نافذ نہیں، دارالکفر ہے (سود ر ۳۷۴)۔

دارالحرب:

دارالکفر کا وہ ملک اصطلاح فقہاء میں دارالحرب کہلاتا ہے، جہاں کی حکومت کافرہ،

حکومتِ اسلامیہ سے برسر پیکار ہو۔

دارالحرب کے متعلق مولانا مودودی لکھتے ہیں: دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل ہماری جنگ برپا ہو (سود ر ۳۸۹)۔

دارالامن:

دارالکفر کا وہ ملک ''دارالامن فی نی کہلاتا ہے جہاں مسلمانوں کو امن وامان حاصل ہو اور انہیں اپنے مذہب اور شعائر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت ہو، ان کی تہذیب وثقافت اور تمدن اسلامی میں دخل اندازی نہ کرتی ہو، جیسا کہ زمانۂ نبوت میں ملک حبشہ دارالکفر تھا، وہاں کی باگ ڈور نجاشی کے ہاتھ میں تھی جو عیسائی مذہب کے پیرو تھے، مگر اس ملک میں ہر مذہب کے لوگوں کو امن وامان حاصل تھا۔

دارالمعاہدہ:

دارالکفر کا وہ ملک جس سے حکومت اسلامی کا معاہدہ ہو، اسے دارالمعاہدہ کہا جاتا ہے، اور اس معاہدہ کی وجہ سے کفار کی جان ومال محفوظ رہتے ہیں، دوران معاہدہ مسلمانوں کے لئے ان سے جنگ وحرب جائز نہیں ہوتی۔

جمہوری ملک :

فقہاء اسلام کے دور میں صرف دو قسم کے ملک تھے: ایک وہ ملک جس میں مسلمانوں کی حکومت تھی اور اس ملک میں ان کے احکام وقوانین نافذ ہوتے تھے، اسے دارالاسلام سے تعبیر کیا گیا، دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا ہے، اور ایک وہ ملک جس میں غیر مسلموں کی حکومت تھی اور اس کے احکام وقوانین اس ملک میں نافذ ہوتے تھے پھر اگر وہاں غیر مذہب کے لوگوں کو امن وامان حاصل ہو اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی

حاصل ہوتو اسے دارالامن کہا گیا، اور اگر وہ حکومت اسلامی حکومت سے برسر پیکار ہوتو اسے دارالحرب سے موسوم کیا گیااور اگر وہاں کی حکومت سے حکومت اسلامیہ کا کوئی معاہدہ ہوتو اسے دارالمعاہدہ کہا گیا۔

دارالخوف:

اگر دارالکفر میں مسلمانوں کو امن وامان حاصل نہ ہو، اور انہیں تحفظ حاصل نہ ہوتو وہ ملک دارالکفر ودارالخوف قرار پائے گا۔

فقہاء کے زمانے میں دار، یا تو دارالاسلام تھا یا دارالحرب، مگر اب اس دور میں دار کی ایک اور قسم ہے، جس میں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے اور نہ غیر مسلموں کی بلکہ جمہوری اور سیکولر نظام ہے، جس میں خود حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس میں ہر مذہب وفرقہ سے تعلق رکھنے والے افراد شریک ہوتے ہیں اور اس ملک میں ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے، ان کے مذہبی معاملات میں حکومت کو دخل دینے کا حق نہیں ہوتا، اور قانونی اور دستوری نقطۂ نظر سے بلاتفریق مذہب وزبان وعلاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کے وسائل آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق ہوتا ہے، اس طرح کا ملک میرے نزدیک دارالاسلام نہیں ہے بلکہ دارالکفر کی قسم دارالامن ہے۔

دارالکفر کب دارالاسلام بنتا ہے:

ہمارے نزدیک دارالکفر اس وقت دارالاسلام بنتا ہے، جبکہ اس میں احکام اسلام علی سبیل الاشتہار جاری کئے جائیں، اور احکام اسلام سے مراد راقم السطور کے نزدیک صرف عبادات، نماز، روزے، جمعہ وعیدین نہیں ہیں، بلکہ حدود وقصاص کا اجراء بھی ہے۔

"اعلم أن دارالحرب تصير دارالإسلام بشرط واحد وهو إظهار حكم الإسلام فيها" (فتاوی ہندیہ ۲؍۲۳۳ طبع بیروت) (دارالحرب صرف ایک شرط کی وجہ سے دارالاسلام بن جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کے احکام جاری ہونے لگیں)۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:۔ہمارے اصحاب کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دارالکفر محض احکام اسلام کے اجراء سے دارالاسلام بن جاتا ہے (بدائع ۹؍۴۳۷۳ طبع قاہرہ)۔

دارالاسلام کے دارالکفر بننے کی شرطیں:

حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ دارالاسلام محض احکام کفر وشرک کے اجراء سے دارالکفر بن جاتا ہے، اور احکام کفر کے اجراء سے مراد یہ ہے کہ مقدمہ ملک داری اور رعایا کے بندوبست اور مال تجارت سے ٹیکس اور چورڈکیتوں کے انتظام، لڑائی جھگڑے کے فیصلے اور جرائم کی سزا کے معاملہ میں کفار اپنے طور پر حاکم ہوجائیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ دارالاسلام تین شرطوں کے ساتھ دارالکفر بنتا ہے:

۱– اس ملک میں کفار کے احکام کا برملا اظہار و اجراء ہونے لگے اور احکام اسلام میں سے کوئی حکم اس میں باقی نہ رہے۔

۲– وہ ملک دارالحرب سے اس طرح متصل ہوجائے کہ اس کے اور دارالحرب کے درمیان دارالاسلام کا کوئی شہر حائل نہ ہو۔

۳– اس ملک میں کوئی مسلمان اور ذمی اس امان کی وجہ سے مامون باقی نہ رہے جو استیلاء کفار سے پہلے مسلمان کو اسلام کی وجہ سے اور ذمی کو عقد ذمہ کی وجہ سے حاصل تھا، جب یہ شرطیں دارالاسلام میں پائی جائیں گی تو وہ دارالاسلام، دار الکفر بن جائے گا (فتاوی ہندیہ

۲/ ۲۳۲، بدائع الصنائع ۹/ ۴۳۷۳)۔

ابوالیسر کی سیر الاصل میں ہے:

''دارالاسلام، دارالحرب اس وقت تک نہیں بنتا جب تک کہ وہ تمام باتیں ختم نہ ہو جائیں جن سے دارالاسلام بنا ہے، اس لئے کہ حکم جب کسی علت کی وجہ سے ثابت ہو گیا تو علت کا جب تک کچھ بھی حصہ باقی ہے تو حکم باقی رہے گا''۔

علامہ شمس الائمہ حلوانی نے ذکر کیا ہے:

''دارالحرب احکام کفر کے جاری کرنے سے بنتا ہے اور یہ کہ احکام اسلام میں سے اس میں کوئی حکم باقی نہ رہے اور دارالحرب سے متصل ہو جائے اور کوئی مسلم اور ذمی امان اوّل سے مامون نہ رہے، پس یہ سب شرطیں جب پائی جائیں گی اس وقت دارالحرب بنے گا اور دلائل وشرائط کے تعارض کے وقت جیسا ہے ویسا ہی رہے گا، یا احتیاطی طور پر جانب اسلام کو ترجیح دی جائے گی الخ (بحوالہ فتاوی محمودیہ ۶/ ۳۰۲)۔

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت:

ہندوستان کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے مختلف ادوار اور اس کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں پھر اس کی روشنی میں ہندوستان کے بارے میں اپنی حتمی رائے اور فیصلہ کا اظہار کریں، راقم الحروف کے نزدیک ہندوستان تین دوروں سے گذرا ہے اور ہر دور میں اس کی حیثیت جُدا جُدا رہی ہے۔

۱ — ہندوستان کا پہلا دور وہ ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت اور اقتدار تھا اور وہ اس کے تاج شاہی کے مالک تھے، سالہا سال مسلم حکمراں بڑی شان وشوکت کے ساتھ یہاں حکومت کرتے رہے۔

۲ — دوسرا وہ دور ہے جب انگریز اس ملک پر قابض ہو گئے اور اس کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے۔

۳- تیسرا دور آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اب تک چل رہا ہے۔

پہلے دور میں بلا شبہ ہندوستان دارالاسلام ہے، اس دور میں اس کے دارالاسلام ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، دوسرا دور جبکہ انگریز اس ملک پر قابض تھے، علماء ومشائخ کے درمیان مختلف فیہ ہے، کچھ علماء اس وقت کے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیتے ہیں اور علماء کی اکثریت اسے دارالحرب مانتی ہے، راقم السطور کے نزدیک اس دور میں ہندوستان دارالحرب تھا، مولانا مودودی اس دور کے ہندوستان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان عام معنی میں اس وقت دارالکفر ہو گیا ہے جب سے مسلم حکومت کا یہاں استیصال ہوا، جس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جواز سود کا فتویٰ دیا تھا، اس زمانہ میں واقعی یہ مسلمانان ہند کے لئے دارالحرب تھا، اس لئے کہ انگریزی قوم مسلمانوں کی حکومت کو مٹانے کے لئے جنگ کر رہی تھی نی نی (سود ر۴۲۹)۔

تیسرے دور میں ہندوستان (یعنی موجودہ ہندوستان) میرے نزدیک ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے جس میں ہندوستان کے ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنی تہذیب وثقافت کی حفاظت کا قانوناً حق حاصل ہے، لہذا ہندوستان کو اصطلاح فقہاء میں دارالامن کہا جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد ہندوستان کے بارے میں علماء کی فقہی آراء حسب ذیل ہیں:

سید نذیر حسین محدث دہلوی کی رائے:

سید نذیر حسین محدث دہلوی کی رائے یہ ہے کہ انگریزوں کے تسلط وقبضہ کے بعد بھی ہندوستان دارالاسلام رہا، اس کا دارالاسلام ہونا انگریزوں کے برسر اقتدار آجانے کی وجہ سے ختم نہیں ہوا، اور دارالاسلام ہونے کو انہوں نے مختلف فقہی عبارات اور علماء کے اقوال سے ثابت کیا ہے (پوری تفصیل فتاوی نذیریہ ۲ر ۱۹۴ میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کی تحقیق:

مولانا عبدالحیٔ لکھنوی بھی ہندوستان کو انگریزی دورِ اقتدار میں ''دارالاسلام'' قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے غیر مسلموں سے سودی لین دین کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''لیکن بلادِ ہند جو قبضہ نصاریٰ میں ہے دارالحرب نہیں ہے، ان میں کافر سے سود لینا جائز نہیں ہے'' (مجموعہ الفتاوی ۱/ ۲۴۶، نیز دیکھئے ۱/ ۱۷۰، ۲/ ۲۴۵، بحوالہ فتاوی محمودیہ ۶/ ۲۹۶)۔

مولانا کے ان فتاویٰ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کو دارالاسلام، اور یہاں کے غیر مسلموں کو ذمی کے حکم میں قرار دیتے ہیں، اسی وجہ سے اُن سے سودی لین دین کو حرام سمجھتے ہیں، کیونکہ دارالاسلام میں مسلمانوں کے لئے ذمیوں سے سُود لینا امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

مولانا عبدالباری لکھنوی کا رجحان:

ہندوستان کے مایہ ناز عالمِ دین مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے اور انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے اس کا دارالاسلام ہونا ختم نہیں ہوا، بلکہ جس طرح دورِ مغلیہ اور اس سے پہلے مسلم حکام کے زمانے میں ہندوستان دارالاسلام تھا، انگریزوں کے اقتدار کے بعد بھی دارالاسلام ہی رہا (دیکھئے: مجموعہ رسالہ ہجرت و قربانی گاؤ/ ۳۳، بحوالہ فتاوی محمودیہ ۶/ ۳۰۲)۔

نواب صدیق حسن کا بھی یہی مسلک ہے کہ ہندوستان انگریزوں کے دورِ اقتدار میں بھی دارالاسلام ہی رہا ہے، دارالحرب نہیں بنا۔

قائلین دارالحرب:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتوی:

جب ہندوستان کی قسمت اور اس کے تاج شاہی کی مالک بدیسی قوم انگریز بن گئی تھی، اور انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہو گئے تو مفکر اسلام شاہ عبدالعزیز تڑپ اٹھے، اور بلاخوف لومتہ لائم یہ فتوی دیا کہ ہندوستان انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے دارالحرب بن گیا ہے، اور مختلف دلائل وشواہد سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کو ثابت فرمایا، غالباً حضرت شاہ صاحب وہ پہلے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا نہایت مفصل فتوی صادر کیا (دیکھئے: فتاوی عزیزیہ ۱/۱۷)،

شاہ صاحب نے اپنے فتویٰ میں ہندوستان کی شرعی حیثیت کی تعیین کے ساتھ ساتھ بہت سارے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی کئے ہیں، اور دارالحرب کی تعریف بیان فرما کر واضح کیا کہ محض بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین، تلاوت اور گاؤ کشی پر پابندی عائد نہ کرنے کی وجہ سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بنتا جن لوگوں نے انگریزوں کے دور اقتدار میں بھی ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا ہے ان سب نے اسی سے استدلال کیا ہے کہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین ہندوستان میں اس وقت بھی باقی وجاری تھے اور جب تک کسی ملک میں اسلام کے کچھ احکام بھی جاری رہیں گے وہ ملک دارالحرب نہیں بنے گا، شاہ صاحب نے اس کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اقتدار اور ملک کی باگ ڈور غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے اور اس میں اس کے احکام جاری ہوتے ہیں تو وہ ملک دارالحرب قرار پائے گا، چاہے اس میں اسلام کے بعض احکام جاری ہوں۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا خیال:

جب ہندوستان پر انگریز قابض ہو گئے تو انہوں نے بھی ہندوستان کے اکثر حصہ کو دارالحرب قرار دیا، اور صرف دارالحرب قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزوں کے خلاف

سینہ سپر ہو گئے اور سید احمد شہید کی قیادت میں مختلف محاذوں پر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر بالا کوٹ کے تاریخی معرکہ میں جام شہادت نوش کر کے ہمیشہ کے لئے آسودۂ خاک ہو گئے، انہی اکابر کی بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں ہندوستان میں آزادی کا سورج طلوع ہوا، مولانا شہید ہندوستان کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''بلکہ ہندوستان کا حال اس وقت ۱۲۳۳ھ میں یہ ہے کہ اس کا اکثر حصہ دارالحرب ہو گیا نی نی (صراط مستقیم/ ۱۰۵)۔

مفتی کفایت اللہ دہلوی کی تحقیق:

جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب اور انگریزوں کو محارب قرار دیا، مگر پھر جب ہندوستان آزاد ہوا اور اس میں جمہوری نظام جاری ہوا تو پھر مولانا نے ہندوستان کو ایک جمہوری اور سیکولر ملک قرار دیا نی نی (کفایت المفتی ۱/ ۲۰)۔

اکابر دیوبند کا رجحان:

اکابر دیوبند کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ ہندوستان انگریزوں کے دور حکومت میں دارالحرب ہے، چنانچہ مفتی محمد شفیع دیوبندی سابق مفتی اعظم پاکستان ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان موجودہ زمانہ میں ہمارے حضرات کے نزدیک دارالحرب ہے اور دارالامان اگرچہ دارالحرب کی کوئی قسم نہیں، لیکن دارالحرب والوں سے صلح ومسالمت شرعاً جائز ہے اور مسالمت کی صورت میں امن قائم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے اگر کوئی دارالحرب کو بحالت مسالمت دارالامان کہہ دے تو مضائقہ نہیں نی نی (امداد المفتین مع فتاوی دارالعلوم قدیم

۶۶/۶)۔

موجودہ ہندوستان کے بارے میں فیصلہ کن رائے:

میرے نزدیک موجودہ دور میں ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، جو تمام شہریوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر قائم ہے اور قانونی نقطۂ نظر سے بلاتفریق مذہب وزبان وعلاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کے ذرائع آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق حاصل ہے، حکومت کو کسی بھی قوم کے مذہبی امور، ان کی تہذیب وتمدن اور ان کے ملی مسائل میں دخل اندازی کا حق نہیں پہنچتا، لیکن اقتدار اعلی غیر مسلموں کو حاصل ہے اور حکومت ہند کی بنیاد اصول اسلام پر قائم نہیں ہے، اور نہ قوانین اسلام کا نفاذ ہے، اس لئے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینا تو ممکن نہیں ہے، البتہ آئین ودستور کے لحاظ سے یہاں کے مسلمانوں کو جان ومال کا تحفظ حاصل ہے اور انہیں احکام اسلام پر عمل کی آزادی بھی حاصل ہے، اس لئے اسے دارالامن قرار دیا جاسکتا ہے۔

مگر چونکہ ادھر کئی سالوں سے فرقہ وارانہ فسادات میں خود ارباب حکومت کا ملوث ہونا اور مسلمانوں کے جان ومال کو برباد کرنا ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے ہندوستان کا دارالامن ہونا مشکوک ہورہا ہے، ایسی صورت حال میں اسے دارالخوف بھی کہا جاسکتا ہے، راقم الحروف کے نزدیک آئین ودستور کے اعتبار سے دارالامن ہے، اور موجودہ حالات کے پیش نظر دارالخوف ہے۔

۴— بینک میں روپئے جمع کرنے کے بعد مخصوص تناسب سے اس پر جو اضافی رقم اور نفع ملتا ہے وہ سود ہے، اور اس کے سود ہونے پر تقریباً تمام ہی علماء کا اتفاق ہے، بینک سے ملنے والے سود کو بینک میں چھوڑنا درست نہیں ہے، کیونکہ معتبر ذرائع سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی سودی رقم بینک سے لینے سے انکار کردیتا ہے تو اس سودی رقم کو

بینک کے منتظمین ایسے مواقع پر خرچ کر دیتے ہیں جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطعاً نامناسب اور بسا اوقات مضر ہوتے ہیں، بلکہ تجربہ یہ بھی ہے کہ تخریب اسلام کے لئے قائم شدہ بعض اداروں پر اُسے خرچ کر دیا جاتا ہے اور اس کی بکثرت نظیریں موجود ہیں، برطانوی ہند میں بینکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جمع کردہ رقم کے سود سے ''گرجا نی نی بنوا دیا گیا، یا عیسائی مشنریوں کو تبلیغ عیسائیت اور تخریب اسلام کے لئے دے دیا گیا، اور آج اگر'' گرجا نی نی نہیں تو مندر کی تعمیر میں یا کسی اور خلاف شریعت منصوبہ میں اس سودی رقم کو لگایا جاتا ہے، اس لئے اپنی سودی رقم بینک میں چھوڑنا گویا گرجا، مندر بنانے یا تخریب اسلام میں حصہ لینے کے برابر ہوگا، اور'' تعاون علی الاثم والعدوان نی نی ہوگا جس سے مسلمانوں کو سختی سے روکا گیا ہے، ہندوستان کے نامور علماء مفتی کفایت اللہ دہلوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، مفتی محمد شفیع سابق مفتی اعظم پاکستان، مولانا حسین احمد مدنی اور عالم اسلام کی معروف شخصیت علامہ مصطفی الزرقاء وغیرہم کا فتوی یہی ہے کہ اگر ضرورت کے تحت بینکوں میں رقمیں رکھی جائیں تو اس کا سود بینکوں میں نہ چھوڑا جائے، کیونکہ سُودی رقم کو بینک کے منتظمین تبلیغ عیسائیت اور اسلام کی تخریب کاری میں صرف کرتے ہیں، بلکہ اسے لے کر فقراء مسلمین پر بلانیت ثواب صدقہ کر دیا جائے (دیکھئے: فتاوی دارالعلوم قدیم، بحوالہ بینک، انشورنس اور سرکاری قرضے ر ۴۲، امداد الفتاوی ۳ر ۱۳۳، فتاوی رحیمیہ ۳ر ۲۶۲، ۲۶۵)۔

بینک کے سود کا مصرف:

بینک سے ملے ہوئے سود کو اپنی ذات پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اسے بینک سے نکال کر اگر اس پر حکومت کی طرف سے کوئی ناجائز ٹیکس عائد ہوتا ہو تو اولاً اس کی ادائیگی کرے، پھر اگر اس سے بچ جائے تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے مسلم فقراء پر بلانیت

ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہے، کیونکہ سود میں ملنے والی رقم بلاشبہہ مالِ حرام ہے اور مال حرام کا اس کے مالک تک لوٹانا اگر ممکن نہ ہوتو اس صورت میں اس کا فقراء ہی پر صدقہ کر دینا ضروری ہے، عام مصرف خیر اور رفاہ عام کے کاموں میں اسے صرف نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے ایک رسالہ میں بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ مالِ حرام جس کی واپسی اس کے مالک تک ممکن نہ ہو اسے فقراء ہی پر صدقہ کر دینا ضروری ہوگا، کسی اور طرح کے مصرف خیر میں خرچ کرنا، مثلاً مسجد بنانا، مدارس و مکاتب کی تعمیر اور مدرسین کی تنخواہ ہوں میں خرچ کرنا پل سرائے وغیرہ بنانا جائز نہ ہوگا، مفتی صاحب کا یہ رسالہ جواہر الفقہ جلد سوم میں عارف کمپنی دیوبند سے شائع ہو چکا ہے، علمی اعتبار سے یہ رسالہ بڑا قیمتی اور وقیع ہے، اس میں مفتی صاحب نے مختلف دلائل و براہین سے تصدق کو ضروری قرار دیا ہے اور مخالف اعتراضات و احتمالات کے اطمینان بخش جوابات دیئے ہیں، بعض علماء نے عام مصارف خیر میں بھی اس طرح کے مال کو صرف کرنے کی اجازت دی ہے، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مفتی عبد الرحیم لاجپوری اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا اسی طرف رجحان ہے، راقم الحروف کے نزدیک پہلی رائے راجح اور قوی ہے، اور میرے نزدیک اس طرح کی رقموں کو عام مصارفِ خیر میں صرف کرنے کی اجازت نہیں ہے، اکابر دارالعلوم دیوبند، مفتی عزیز الرحمن، حضرت تھانوی، حضرت مفتی محمد شفیع اور موجودہ مفتیان دارالعلوم دیوبند، سودی رقم کے تصدق کو ضروری قرار دیتے ہیں اور رفاہ عام کے کاموں (مثلاً کنواں کھودنا، تالاب بنانا) میں صرف کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں، البتہ اگر رقم کسی محتاج کو دے کر اُسے مالک بنا دیا جائے اور پھر وہ اس سے پل بنائے یا مدرسہ کی تعمیر کرے تو درست ہوگا۔

سرکاری اور غیر سرکاری بینکوں سے سود لینے کا حکم:

سود چاہے سرکاری بینکوں سے وصول کیا جائے یا غیر سرکاری بینکوں سے، ہر صورت

میں حرام ہے، اور سود حاصل کرنے کی نیت سے نہ تو سرکاری بینکوں میں روپیہ جمع کرنا درست ہے اور نہ غیر سرکاری بینکوں میں، اور کسی بھی صورت میں اس سود کو اپنی ذات پر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، میرے نزدیک سود لینے میں سرکاری اور غیر سرکاری بینکوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کا حکم یکساں ہے۔

۵— سود لینا ایک مسلمان کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے اگر وہ سود لیتا ہے تو گویا خداوند قدوس کو مبارزت کی دعوت دیتا ہے اور اپنے کو خدا اور اس کے رسول کی لعنت کا مستحق ٹھہراتا ہے، البتہ ہندوستان جیسے ملک میں بعض حالات میں واقعی مجبوریوں کے تحت سودی قرض لینے اور اس پر سود کی ادائیگی کی گنجائش ہوگی، اگر ایک مسلمان اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سودی قرض لئے بغیر نہ کر سکے اور اسے غیر سودی قرض نہ ملے تو ایسی حالت میں بقدر مجبوری سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

۶— سود لینا اور دینا دونوں ہی معصیت اور غضب الٰہی کا موجب ہے، اس لئے اصولی طور پر ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا درست نہ ہوگا، مگر یہ حقیقت واقعہ ہے کہ کبھی ایسے قرضے لینا ضرورت بن جاتی ہے، اور خورد ونوش، تجارت، کاشت اور صنعت وحرفت کے لئے ایسے قرضے لینا ناگزیر ہوجاتا ہے، ان حالات میں بدرجۂ مجبوری سودی قرضے لینے کی درج ذیل شرائط کے ساتھ گنجائش ہوگی:

۱— انسان سودی قرض لینے پر اس طرح مجبور ہوجائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعۂ معاش فراہم نہ ہو اور بنیادی ضروریات (کھانا، کپڑا اور مکان) کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے۔

۲— اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو۔

۳— یہ قرض محض تعیش، آرام طلبی اور اپنا معاشی معیار بلند کرنے کے لئے نہ لیا جائے۔

ان شرائط کے ساتھ بقدر ضرورت وحاجت سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی، ایسے

حالات میں سودی قرض کا جواز قاعدہ فقہیہ " **الضرورات تبیح المحظورات**" (الاشباہ/۱۲۱) سے ثابت ہوتا ہے، اگر ایسے حالات میں بھی سودی قرض کی اجازت نہ دی جائے تو انسان حرج وتنگی میں مبتلا ہو جائے گا جو دین حنیف کی سہولت بخشیوں کے خلاف ہے، علامہ ابن نجیم محتاج کیلئے سودی قرضے کا جواز ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :"**ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**"(الاشباہ/۱۱۵) ضرورت مند کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے۔

سرکاری اور غیر سرکاری قرض کا فرق:

یہ عام سودی قرضوں کا حکم ہے جس میں سرکاری بینک بھی داخل ہے، اس سلسلے میں بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ سرکاری قرضہ جات جن کا اصل مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا ہے، بلکہ ملک کی غربت دور کرنا اور لوگوں کی ضروریات کی تکمیل مقصود ہوتا ہے، عام حالات میں بھی ایسے قرضے لینے کی گنجائش ہوسکتی ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب سرکاری اور غیر سرکاری قرضوں کے مابین فرق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سرکاری قرضہ جات جس کا اصل مقصود خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ ملک کا افلاس دور کرنا مقصود ہوتا ہے اور سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہے، بہت معمولی ہوتا ہے اور اس میں مزید سہولت ہے، عام حالات میں بھی ایسے قرضے لینے کی گنجائش ہے، گو کہ اس کو سود کا نام دے دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس شعبے کے ملازمین اور عملہ کی اُجرت پر بھی محمول کرسکتے ہیں نی نی (جدید فقہی مسائل ۱/۲۵۱)۔

۷— ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، اس کا خزانہ اور سرمایہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق ہندوستانی عام شہریوں کی طرح یہاں کے مسلمانوں کو بھی حاصل

ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی فروغ اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے اور بے کاروں کو کارآمد بنانے کے لئے جس قدر بھی رقم حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک ہندوستانی مسلمان کا اسی طرح حق ہے جس طرح ہندوستان کے دوسرے شہریوں کا، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جب مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لئے آگے بڑھتا ہے تو حکومت جس نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے، اس کا یہ فیصلہ مسلمانوں کو اپنے جائز حق کی تحصیل سے روکتا ہے، ایسی صورت حال میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے:

"مسلمانوں کو اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجۂ مجبوری سود دینا اور سود دے کر اپنا حق حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب راقم السطور کے نزدیک اثبات میں ہے، اور یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو اجازت ہے کہ بدرجۂ مجبوری سود دے کر اپنا حق حکومت سے وصول کریں نی نی۔

شریعت اسلامی میں اس کی نظیر موجود ہے، شریعت کا عام اصول اور ضابطہ تو یہ ہے کہ "ما حرم أخذه حرم إعطاءه" یعنی جس چیز کا شرعا لینا حرام ہے، شرعاً اس کا دینا بھی حرام ہے، اس اصول کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لیکن ایسی صورت میں جبکہ اپنے جائز حق کا حصول بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، صاحب الاشباہ والنظائر علامہ ابن نجیم مصری قاعدہ فقہیہ " **ما حرم أخذه حرم إعطاءه**" کے ذیل میں "**الرشوة لخوف على ماله أو نفسه**" کا استثناء کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے، رشوت لینے والے کے حق میں ہر حال میں حرام ہے، بعض لوگوں کو اس فرق پر تنبہ نہ ہوسکا ہے، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ

صورت بھی مستثنیٰ ہو کہ کوئی محتاج شخص سود پر قرض حاصل کرلے کہ یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ البحر الرائق میں اس کی تشریح کردی گئی ہے، لیکن قرض دینے والے کے لئے سود کی شرط پر قرض دینا حرام ہوگا نی نی (الاشباہ مع الحموی ۶/۱۷)۔

۸— اگر حکومت کسی قرض پر چھوٹ دیتی ہے اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہے اور اس چھوٹ کا تناسب سود میں ادا کی جانے والی رقم سے کم یا اس کے مساوی ہے تو قرض کی یہ شکل شرعاً جائز ہے، کیونکہ اس میں قرض میں لی ہوئی رقم سے زیادہ دینا نہیں پڑتا، گویا یہ حکومت کی طرف سے ایک قسم کی امداد ہے، استاد محترم مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب صدر مفتی دار العلوم دیوبند نے بھی اس صورت میں سودی قرض کی اجازت دی ہے (دیکھئے: نظام الفتاوی ۱/۲۷۴)۔

۹— آج جب ہم دنیا کے نظام اور ممالک کے احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا کا پورا نظام ''سود نی نی میں گھرا ہوا ہے، ہر کام کے لئے انسان کو ''بینک نی نی کا تعاون لینا پڑتا ہے، بینکوں کے توسط کے بغیر نہ تو کوئی بڑی تجارت اور صنعت وحرفت ممکن ہے اور نہ ہی فریضہ حج کی ادائیگی، غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں سود ادا کئے بغیر چارہ نہیں، ان سب کو قطعاً حرام اور قابل ترک قرار دینا کیا واقعی شریعت اسلامی کے ''یسر نی نی اور ''دفع حرج نی نی کے اصول اور شریعت کی سہولت بخشیوں کے مطابق ہوگا، اور کیا عملاً اس طریقہ کار کا ترک ممکن ہوگا؟ اور ہمیں اس ضمن میں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر واقعی سب مسلمان تاجر بیرونی تجارت سے دست بردار ہوجائیں تو آج کل کیا یہ ممکن ہے؟ کیونکہ جدید ترقیات اور ایجادات واختراعات کی وجہ سے دنیا گویا ایک بڑے مکان کا آنگن بن گئی ہے، اور دنیا کے سارے انسان مختلف اسباب ومصالح کی وجہ سے ایک کنبہ کے افراد کی طرح ہوگئے ہیں، اب کوئی ملک دوسرے ملک سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، کوئی قوم دوسری قوم سے الگ تھلگ رہ

کر بسااوقات اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات کی تکمیل بھی نہیں کرسکتی، اس زمانہ میں عملاً دنیا کی حالت یہ ہے کہ ضروری اشیاء صرف جن پر مدارِ حیات ہے بعض ملکوں کو دوسرے ممالک فراہم کرتے ہیں (مثلاً اکثر عرب ممالک اپنی غذائی ضروریات تک میں دوسرے ممالک کے محتاج ہیں) اگر وہ فراہم نہ کریں تو اکثر لوگوں کی غذا کی نایابی کی وجہ سے بھوک سے ہلاک ہوجانے کا اندیشہ ہے، اس طرح بیرونی تجارت سے کنارہ کشی ایک ہی فرد کی نہیں بلکہ پورے ملک اور قوم کی ہلاکت کا ذریعہ بن جائے گا، تو کیا ایسی صورت کو بھی ''ضرورت ثانیہ نہ کہا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی صورت کو یقیناًئی ئی ضرورت ثانی کا درجہ حاصل ہے، اور اگر بینک کے توسط کے بغیر ایسی تجارت ممکن نہ ہو تو بھی تجارت ضروری ہوگی، اور بینک کا توسط اختیار کرنا'' ضرورت ثانی کی بنا پر جائز ہوگا، اور اس ضرورت کی وجہ سے سود دینے کی بھی گنجائش ہوگی، البتہ ایک مسلمان تاجر کو دیگر ممالک کو مال برآمد کرنے کی صورت میں بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت جو سود ملے گا اس کا حکم بھی عام سود کا ہوگا، اور اپنی ذات پر صرف کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ فقراء مسلمین پر اس کا تصدق واجب ہوگا۔

۱۰— بینک دوطرح کے ہیں: ایسے بینک جس کے مالک اشخاص و افراد ہوتے ہیں، دوسرے سرکاری بینک جو حکومت کی ملک ہیں ان دونوں قسم کے بینکوں میں نوعیت کے لحاظ سے بڑا فرق ہے، اور دونوں کی حقیقت جُدا جُدا ہے، وہ بینک جس کے مالک اشخاص و افراد ہوتے ہیں ان کا مقصد بینکوں کے قیام سے خود معاشی فائدہ اٹھانا اور لوگوں کی دولت سمیٹنا ہے، وہ افراد ان بینکوں کے ذریعہ غریب مزدوروں، کاشتکاروں اور قلیل المعاش افراد کا خون چوستے ہیں، لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح کے بینک قرض محض اس وجہ سے لوگوں کو دیتے ہیں تاکہ انھیں ''سود ثانی کے نام پر معقول رقم بغیر محنت ومشقت کے مل جائے، اس لئے اس طرح کے بینک ''سود ثانی سرکاری بینکوں کی بہ نسبت زیادہ عائد کرتے

ہیں، اس کے برخلاف سرکاری بینکوں کے قیام وتاسیس کا مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ ملک کی غربت وافلاس دور کرنا اور ملک وافراد کی تعمیر وترقی مقصود ہوتی ہے، سودی قرض دے کر بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا جاتا ہے اور بے کار افراد کو کارآمد بنایا جاتا ہے، اور ملک کی صنعت وحرفت اور تجارت کو فروغ دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہے وہ بہت معمولی ہوتا ہے، بلکہ بہت ساری اسکیموں کے تحت حکومت لوگوں کو قرض چھوٹ دے کر فراہم کرتی ہے اور اس پر سود بہت معمولی عائد کرتی ہے جس کی ادائیگی اس چھوٹ سے ہو جاتی ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کے بینکوں کا مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہے اور جو سود لیا جاتا ہے اسے اس شعبے کے ملازمین اور عملہ کی اجرت پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے، اس کو بنیاد بنا کر بعض علماء نے ان دونوں قسموں کے بینکوں سے قرض لینے میں فرق کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر سرکاری بینکوں سے سودی قرض لینے کا جواز اسی وقت ہوگا، جبکہ آدمی اس کے لینے پر اس طرح مجبور ہو جائے گا کہ اگر نہ لے تو کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو اور اس کی بنیادی ضروریات کھانا، کپڑا اور مکان کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے اور اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو تو اس طرح کی مجبوری میں اسے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی، اور سرکاری بینکوں سے عام حالات میں بھی ایسے قرض لینے کی گنجائش نکل سکتی ہے، مولانا خالد سیف اللہ کا رجحان اسی طرف ہے، حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے بلا ضرورت سرکاری بینکوں سے بھی سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی ہے اور اسے عام قرضوں سے زیادہ خطرناک بتایا ہے (دیکھئے: نظام الفتاوی ۱ر ۲۷۴)۔

راقم الحروف بھی بلا ضرورت حکومت سے قرض لینے کو جائز نہیں سمجھتا۔

۱۱— اس صورت میں اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ بلا ضرورت سود کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے، اور شریعت میں جس طرح سود لینا سخت گناہ ہے اسی طرح سود دینا بھی بڑا گناہ اور حرام ہے، البتہ اسے مذکورہ کمپنیوں سے سودی قرض نہ لینے کی صورت میں کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو تو بقدر

ضرورت اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

☆☆☆

سود کی حقیقت شرعی

مولانا عبید اللہ کوثی، اعظم گڑھ

سود کی حقیقت:

مؤلف ہدایہ نے سود کی یہ تعریف کی ہے : "هُوَ الْفَضْلُ الْمُسْتَحقُ لِاَحَدِ الْمُتَعَاقِدَيْنِ فِي الْمُعَاوَضَةِ الْخَالِيْ عَنْ عِوَضٍ شُرِطَ فِيْهِ" (مالی لین دین کے معاملات میں ایک فریق کی طرف سے پیش کیا جانے والا وہ قدر زائد جس کے مقابلہ میں دوسری جانب سے مال کا کوئی حصہ نہ ہو اور یہ قدر زائد معاملہ میں مشروط بھی ہو)۔

سوالنامہ کے دوسرے مندرجات کے پیش نظر یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عنایہ شرح ہدایہ میں "فی محل مخصوص" کی شرط بھی مذکور کی ہے، یعنی مالی لین دین میں قدر زائد، اس وقت سود قرار دیا جائے گا جب وہ محل مخصوص (دارالاسلام) میں ہوا ہو۔

دارالحرب کے اعتبار سے سود کا حکم:

دارالحرب میں غیر مسلم سے یہ معاملہ سود نہ ہوگا، اس مسئلہ کا تعلق دراصل عقود فاسدہ سے ہے جس کی بنیاد یہ آیت ہے:

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

"فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وهو مُومِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُومِنَةٍ" (خطبہ صدارت ۲۶، ۲۷ علامہ انورشاہ کشمیری اجلاس جمعیۃ پشاور)۔

متعدد احادیث سے بھی دارالحرب میں عقود فاسدہ کی یہ نوعیت واضح ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا رِبَا بَيْنَ اَهْلِ الْحَرْبِ وَ الْإِسْلَامِ" (کنوز الحقائق علی ہامش الجامع الصغیر ۱۶۶/۲)۔

مذکورہ حدیث مرسل ہے مگر امام طحاوی نے مشکل الآثار (باب الربا ۲۴۱/۴) میں اسی مفہوم کی دوسری روایت نقل کی ہے جو مسند ہے۔

امام طحاوی نے مشکل الآثار میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے حضرت عباسؓ جو پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں مقیم تھے غیر مسلموں کے ساتھ سودی لین دین کرتے تھے، فتح مکہ کے موقع پر جب کہ یہ جگہ بھی دارالاسلام بن گئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی معاملات کے خاتمہ کا اعلان فرمایا، مدینہ طیبہ میں ۷ھ ہی میں سود کی حرمت کا حکم نازل ہو چکا تھا۔

سورہ "الم غلبت الروم فی" کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکرؓ نے مکہ میں غیر مسلموں سے رومیوں کے دوبارہ غلبہ پانے کی خوشخبری سنائی، اس پر ان سے دوطرفہ شرط بھی لگ گئی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدت اور معاوضہ میں توسیع فرمائی، غزوہ بدر کے موقع پر وہ واقعہ پیش آیا جس کی قرآن مجید میں خبر دی گئی تھی، صلح حدیبیہ کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے ۱۰۰ اونٹ، شرط کے مطابق حاصل کرلئے۔

دارالکفر اور دارالحرب کے مابین صرف لفظی فرق ہے:

امام مالک کے نزدیک دارالحرب سے اگر معاہدہ صلح ہو تو وہ اس کے غیر مسلموں کے ساتھ ربوی معاملات کے عدم جواز کے قائل ہیں ورنہ نہیں، چنانچہ ان سے پوچھا گیا کہ مسلمان دارالحرب جائے تو اس کے اور حربی کے درمیان ربا ہوگا؟ انھوں نے پوچھا تمہارے

اور ان کے درمیان صلح ہے؟ سائل نے جواب دیا نہیں، فرمایا تو اس صورت میں ربوی معاملات جائز ہوں گے (المدونۃ الکبریٰ)۔

لیکن امام ابوحنیفہ اور امام محمد ہر ایک، دارالکفر کو دارالحرب ہی مانتے ہیں، ان کے نزدیک صلح سے دارالکفر کے ساتھ، عقود فاسدہ کے جواز پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، چنانچہ شرح السیر الکبیر میں ہے:

''صلح کی وجہ سے دارالحرب، دارالاسلام، نہیں بن جاتا، مسلمانوں کے لئے بھی دارالحرب (کے غیر مسلم) باشندوں کا مال ان کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے، کیونکہ اس میں غدر پایا جاتا ہے، البتہ ان کی خوشی سے یہ معاملہ ہوتو یہ غدر نہ ہوگا اور ان سے لیا ہوا مال مباح ہوگا نی (شرح السیر الکبیر ۳/ ۲۲۸)۔

۳— ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز دہلوی (فتاویٰ عزیزیہ میں ان کے سات فتوے موجود ہیں) اور مولانا رشید احمد گنگوہی، وغیرہ نے غیر مسلموں کے ساتھ، ان کی رضا مندی پر ربوی معاملات کو جائز قرار دیا ہے، مولانا گنگوہی کے فتویٰ کی متعدد نقلیں (فوٹو کاپیاں) مختلف افراد کے پاس موجود ہیں، مولانا محمد علی تھانوی اور علامہ انور شاہ کشمیری کی بھی یہی رائے تھی۔

فقہائے حنفیہ نے اپنی کتابوں میں دو ہی دار بیان کئے ہیں: دارالکفر اور دارالاسلام اور مولانا انور شاہ صاحب نے دار کفر کی دو قسمیں دارالامن اور دارالخوف بیان کی ہیں، لیکن ربوی معاملات میں ان کے نزدیک دونوں کا حکم یکساں ہے (ملفوظات مولانا انور شاہ کشمیری ر ۱۱۹—۱۷۳)۔

دارالاسلام کے دارالحرب بن جانے کے لئے صاحبین کے نزدیک صرف اقتدار کی منتقلی کافی ہے، البتہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین باتیں پائی جانی ضروری ہیں:

۱— احکام کفر کا علی الاعلان جاری ہونا۔

۲— دارالحرب سے متصل ہونا۔

۳— اسلام کے دیئے ہوئے امان کا مسلمانوں اور ذمیوں سے اٹھ جانا۔

ہندوستان جس میں دستوری حیثیت سے مسلمان بھی شریک ہیں اور ان کو قانوناً برابر کا حق دیا گیا ہے، اس لئے دارالحرب کی جملہ شرطیں یہاں موجود نہیں، کیونکہ مسلمان بھی اس میں شریک حکومت ہیں، قانون سازی اور نفاذ قانون دونوں میں حصہ لینے کے مواقع ان کو حاصل ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ اقلیت میں ہیں، جمہوری طرز حکومت کی وجہ سے قانون کے مواقع ان کو حاصل ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ اقلیت میں ہیں، جمہوری طرز حکومت کی وجہ سے قانون سازی کی نوعیت مختلف ہے اور کثرت آراء سے قوانین بنائے جاتے ہیں، اس لئے مسلم اقلیت کے احکام ومسائل کو پھر سے زیر بحث لانے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، مگر میرا خیال یہ ہے کہ ایسے حالات میں بھی یہاں عقود فاسدہ کے جواز کا حکم دیا جانا انسب ہے۔ خواہ دارالامن ہی کیوں نہ ہو، جو سہولتیں میسر ہیں ان کی وجہ سے عقود فاسدہ کی نوعیت اور ان کے جواز کی ضرورت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال نمبر ۴ تا ۱۱:

اس لئے سوالات نمبر ۴ سے نمبر ۱۱ تک کی تمام صورتوں میں غیر مسلموں، سے حکومتوں سے ان کے بینکوں سے وہ سارے معاملات جائز ہوں گے جن کے بارے میں سوالات میں تفصیل دی گئی ہے۔

چنانچہ مفتی اعظم دیوبند مولانا عزیز الرحمن صاحب نے بینکوں سے سود لینے کے جواز کا فتویٰ دیا اور اجلاس جمعیۃ علماء سورت میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور دیگر علماء کی موجودگی واتفاق سے ہندوستان میں سودی لین دین کے جواز کا اعلان کیا گیا۔

۷— استرداد حق بھی اپنی شرطوں کے ساتھ ایک عملی صورت ہے، دارالحرب میں قائلین جواز کا مسلک واضح ہے۔

۸— قرض لے کر اس میں چھوٹ مل جاتی ہو، ادا کی ہوئی رقم مع سود اس کے مساوی ہو تو یہ

حقیقت میں سود نہیں، صورت کا اعتبار نہیں۔

۹ — بین الاقوامی تجارت میں مذکورہ صورت ضرورت شدیدہ کے ذیل میں آتی ہے اور **الضرورات تبیح المحظورات**، دفع ضرر اور مصالح کلیہ کا حصول بھی ضرورت شدیدہ ہے۔

۱۰، ۱۱ — حکومت یا افراد کے بینکوں میں، دار کے فرق سے حکم بدل جائے گا، کمپنیوں کے بارے میں بھی مذکورہ اصل، مدار احکام ہے۔

سود کا مسئلہ

مولانا محفوظ الرحمن قاسمی

ابن العربی نے احکام القرآن میں فرمایا: ”**الربوا فی اللغة الزیادة والمراد به فی الآیة کل زیادة لا یقابلها عوض**“ کہ ربوا کے معنیٰ لغت میں زیادتی کے آتے ہیں اور آیت میں ربوا سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلے میں کوئی مال نہ ہو بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو۔

امام جصاص رازی احکام القرآن (۱/۶۹۴ باب البیع) میں ربوا کے معنی فرماتے ہیں: ”**هو القرض المشروط فیه الا جل و زیادة مال علی المستقرض**“ کہ کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اصل مال سے کچھ زائد رقم ادا کرے گا۔ ربوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”**کل قرض جر نفعاً فهو رباً**“ کہ ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو ربوا ہے (جامع صغیر ماخوذ من معارف القرآن)۔

خلاصۂ حقیقت سود۔ ایسے قرض پر روپیہ دینا جس پر نفع کے نام سے کچھ زیادتی وصول کی جائے (اسلام کا اقتصادی نظام/ ۲۷۴)۔

'احکام القرآن میں امام جصاص رازی نے ربوا کی دو قسمیں بیان کی ہیں ۱۔ ایک بیع وشراء کے ذریعے ۲۔ دوسرے بغیر بیع وشراء کے ذریعہ۔

امام رازی نے بھی اپنی تفسیر میں ربوا کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کے کلمات یہ ہیں:

ایک معاملات بیع وشراء کے اندر ربوا، دوسرے ادھار معاملات کے اندر ربوا، زمانہ جاہلیت کا ربوا یہی ادھار معاملات کے اندر تھا یعنی قرض میں بحساب میعاد نفع لیا جاتا تھا۔

ابن جریر طبری آیت ربوا :یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ کسی ایک میعاد معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصل راس المال سے زائد مقررہ زیادتی وصول کرنا اور اگر میعاد پر وہ قرض ادا نہ کرسکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دینا کہ سود میں اضافہ نہ کیا جائے۔یہی جاہلیت میں جاری تھا۔

معاملات بیع وشراء کے اندر ربوا نبی کریم ﷺ کے بیان کرنے سے معلوم ہوا جو خاص اقسام بیع وشراء میں کمی زیادتی یا ادھار کا نام ہے، اس کو عرب کے لوگ ربوا نہیں سمجھتے تھے، رسول اکرم ﷺ نے ربوا کے مفہوم میں ان کو بھی داخل فرمایا، وہ اشیاء جو منصوص علیہ ہیں وہ سونا، چاندی، کھجور، گیہوں، جو اور نمک ہیں، ان چھ چیزوں کے بیع وشراء میں یہ حکم نافذ کیا کہ جب ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو دست بدست اور برابر سرابر ہونا چاہیے کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی ربوا ہے۔اسی اصول کے تحت عرب میں معاملات کی چند صورتیں جو محاقلہ اور مزابنہ کے نام سے رائج تھیں ان کو ربوا میں شامل فرما کر اس معاملہ کے کرنے سے منع فرما دیا۔ جب آیت ربوا نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قانونی خصومات میں نافذ کیا۔جس سے ثابت ہوا کہ ربوا الفضل یعنی ادھار دے کر میعاد کے عوض اس پر نفع لینا اصل ربوا کا مصداق ہے۔اور اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام اور اشتباہ نہیں۔البتہ جن چیزوں کی بیع وشراء میں کمی زیادتی اور ادھار کو ربوا میں شامل کیا گیا اس میں یہ بات بھی قابل غور تھی کہ ربوا ان چھ چیزوں میں محدود ہے یا ان کے علاوہ اور اشیاء اس میں داخل ہیں اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے۔کن کن چیزوں کو داخل ربوا سمجھا جائے۔یہی اشکال حضرت عمر فاروقؓ کو پیش آیا جس کی بنیاد پر فرمایا: ان آیة الربوا أخر ما نزل من القرآن وان النبی ﷺ قبض قبل ان یبینه لنا فدعوا الربوا والریبة۔یعنی آیت ربوا نزول کے اعتبار

سے آخری آیت ہے نبی کریم ﷺ اس کی وضاحت کرنے سے قبل ہی وفات دیئے گئے ربوا کو چھوڑنا ہی ہے جس میں ربوا کا شبہ ہو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے (احکام القرآن للجصاص ۱؍۴۶۴)۔

ربوا کی اس قسم کے حرام ہونے پر احادیث متواترہ بھی وارد ہیں مگر پوری تفصیلات نہ ہونیکی وجہ سے اس میں صحابہ کرام کو اشکالات پیش آئے اور فقہاء کے مابین اختلافات ہوئے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اموال ربویہ میں قدر وجنس کے اتحاد کے وقت تفاضل ونسیئہ دونوں حرام اور کسی ایک کے اختلاف کے وقت نسیئہ حرام یعنی امام ابوحنیفہ نے علت قدر مع الجنس اخذ کیا۔ اور امام شافعیؒ نے علت جنس اور ثمینۃ اثمان میں اور طعم مطعومات میں اخذ کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلویؒ نے فرمایا کہ ربوا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ ہے جو بحکم ربوا ہے۔ حقیقی ربوا قرض پر زیادتی لینے کا نام ہے اور بحکم ربوا وہ ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کا نام ربوا ہے، اور ایک حدیث میں جو یہ ہے کہ الربوا فی النسیئہ کہ ربوا صرف ادھار میں ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور مشہور ربوا جس کو عام طور پر ربوا سمجھا جاتا ہے وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے، اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب حکمی ربوا میں داخل ہیں۔ آج کل جو ربوا انسانی معیشت کا مدار سمجھا جاتا ہے اور مسئلہ سود میں زیر بحث ہے وہ یہی ربوا ہے جس کی حرمت قرآن اور چالیس احادیث میں وارد ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

حقیقی ربوا (قرض پر زیادتی لینا) اور بحکم ربوا (جس کا ثبوت حدیث نبوی سے ہوا) دونوں قسمیں دارالحرب کے اندر دارالحرب میں موجود کچھ لوگوں کے لئے اور اس طرح کے دوسرے معاملات امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے جائز قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیل بشمول اقوال ائمہ مندرجہ ذیل ہے:

۲— سودی معاملات دارالاسلام میں کرنا مطلقاً یا دارالحرب میں مسلم اصلی یا ذمی یا اس حربی سے جس نے اسلام لانے کے بعد ہجرت کی اور پھر دارالحرب کی طرف لوٹ گیا ہو اس سے سود

لینا یا دینا بالاتفاق حرام ہے اور دارالحرب میں کافرحربی مسلمان ہوکر دارالحرب میں رہتا ہو دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کی ہواس سے سود لینا، اسی طرح جمیع بیوع فاسدہ سے جس میں اس کی رضا ہواس کا مال لینا جائز ہے (درمختار ر ۲ بحوالہ تحذیر الاخوان)۔

دارالحرب میں جن مذکورافراد کے ساتھ سودی معاملات کرنے کی اجازت امام محمد اورامام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے اس جواز کے سلسلے میں اس بات کی تحقیق بھی ضروری ہے کہ یہ معاملات حقیقۃً سودی قرار دیئے جائیں گے یا صورۃً سودی معاملات ہوں گے اس سلسلے میں فتح القدیر میں :

یعنی دارالحرب میں حربی کا مال مسلم مستامن کے لئے غیر معصوم ہونے کی وجہ سے حلال ہے اور حلال ہونے کی علت چاہتی ہے کہ یہ سودی معاملہ بھی جائز ہو بشرطیکہ ملنے والی زیادتی مسلمان کے حق میں ہو۔ حالانکہ ربوا اس سے عام ہے کیونکہ جب دو درہم مسلم کی طرف سے یا کافر کی طرف سے ہوں ہر ایک کو شامل ہے، اس مسئلے کا جواب یہ ہے کہ حلت دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ مذکورہ دونوں عبارتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دارالحرب میں سودی معاملات صورۃ سود ہوتے ہیں حقیقۃً سود نہیں ہوتے۔ بعض لوگوں نے حقیقۃً سود نہ ہونے کی یہ علت بیان کی ہے کہ دارالحرب میں حربی کا مال اور مال کے متقوم اور معصوم ہونے کی بنیاد دارالاسلام پر رکھا ہے۔

دوسری طرف **لا ربوا بین المسلم والحربی** کی علت **لان ماله ثمه مباح** میں یہ مذکور ہے کہ : **فلا یستلزم اباحة المال اباحة العقد** یعنی مال کی حلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ عقد سودی نہ ہو کیونکہ مال کا حلال ہونا علیحدہ چیز ہے اور عقد کا جائز ہونا علیحدہ چیز ہے جس کی نظیر فقہ میں موجود ہے۔ مثلاً کوئی مقروض مستقرض سے اپنی دین نہ وصول کرسکے وہ یہ ہے کہ ایک حر (آزاد) کو اس کے ہاتھ بعوض ثمن مساوی دین کے بیع کرکے روپیہ پر قبضہ کرے تو یہ معاملہ حرام ہوگا اور مال حلال نیز حربی اور مسلم کے مابین ہونے والے معاملات کے جواز

کی کسی نے تشریح نہیں کی بلکہ مال کو صرف طیب کہا ہے، سیر کبیر میں ہے **إذا دخل المسلم دار الحرب بأمان فلا باس بأن یاخذ أموالھم بطیب أنفسھم بأی وجہ کان، لأنہ إنما اخذ المباح علی وجہ عری عن الغدر فیکون ذٰلک طیباً لہ** کہ مسلمان جب امان لے کر دار الحرب میں داخل ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ ان کا مال لے ان کی مرضی سے جس طرح سے ہو، اس لئے کہ مباح چیز کا لینا اس طرح کہ جو غدر میں داخل نہ ہو طیب اور بہتر ہے اور اس کی تائید بھی اس بات سے ہوتی ہے کہ بیع فاسد میں مشتری بائع کی اجازت سے سامان پر قبضہ کر لے تو یہ سامان مشتری کی ملک میں ہو جاتا ہے، یہ بیع فاسد حقیقۃً بیع ہوتی ہے۔ یعنی اس بیع کے سبب نعمت ملک حاصل ہوتی ہے (ہدایہ ۳/ ۶۳)۔

رکن بیع ایجاب وقبول اس کے اہل (متعاقدین) سے صادر ہوا اور ایسے محل کی طرف مضاف ہے جس میں محل عقد ہونے کی صلاحیت ہے، چنانچہ مبیع تو اس میں مال ہے ہی، ثمن بھی من وجہ مال ہے اس معنی کر کے خمر، اور خنزیر کی طرف بعض لوگوں کی طبیعت کا میلان ہے، صرف اتنی بات ہے کہ وہ متقوم مال نہیں تو لامحالہ اصل بیع منعقد مانا جائے گا اور نفس بیع کے ذریعہ نعمت ملک حاصل ہوگی، یہیں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ربوا کے تحقق کے لئے مال کا معصوم ومتقوم ہونا جو لازمی تھا وہ اگر کسی وجہ سے مفقود ہو جائے تو اسے سودی معاملات سے خارج نہیں مانا جائے گا۔ جیسا کہ اس بیع فاسد کے معاملہ میں کہ شریعت نے خمر وخنزیر کی اہانت کا فیصلہ کیا اور وہ غیر متقوم ہوا لیکن بعض لوگوں کا میلان ہونے کی وجہ سے اسے مال متصور کیا گیا، اسی طرح سے مسلمانوں کے اموال متقوم اور معصوم ہیں اور غیر مسلم کے اموال ان کے حق میں بھی متقوم اور معصوم ہیں اگرچہ مسلمانوں کے لئے جائز ڈھنگ سے ان کے اموال کو غیر متقوم اور غیر معصوم قرار دیا گیا اور یہ ضابطہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ **المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث ما یکون** (سیر کبیر ۵/ ۱۱۸) کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں اسلامی احکام کا پابند ہوگا اور فتح القدیر کی عبارت: **انما یقتضی حل مباشرۃ العقد اذا کانت الزیادۃ للمسلم**

سے سودی معاملات کی کوئی دلیل نہیں بنتی، اس لئے کہ اس عقد کا جواز اس شرط کے ساتھ موقوف ہے کہ زیادتی مسلمان کو حاصل ہو جس میں احتمال اباحت مال کا بھی ہے جیسا کہ ہدایہ میں مذکور ہے کہ ان کا مال دارالحرب میں مباح ہے۔

۳— دارالحرب میں سودی معاملات کا جواز امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے مذہب پر ہونے کی وجہ سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دار کتنے ہیں اور ان کے احکامات کیا ہیں؟

دار فقہاء کے نزدیک دارالاسلام اور دارالحرب میں منحصر ہے۔ عینی شرح ہدایہ کتاب السیر (۲/ ۸۶۲) میں ہے :**الدار عندنا دار الاسلام و دار الحرب۔**

دارالاسلام: وہ ملک ہے جہاں حکومت کا مذہب اسلام ہو اور مسلمانوں کو کلی طور پر اقتدار حاصل ہو، قوانین میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار ہو۔ شرح سیر کبیر (۴/ ۳۰۲) میں ہے:

لأن الدار انما تکون دار الاسلام باجراء احکام المسلمین فیھا۔ اور فتح القدیر (۴/ ۳۱۱) میں ہے: **وھذا لان دار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء الاحکام وثبوت الا من للمقیم من المسلمین فیھا۔** ایسے ہی وہ ملک بھی دارالاسلام ہوگا جہاں مسلمانوں کو اقتدار کلی حاصل نہ ہو مثلاً امور خارجہ میں خود مختاری نہ ہو فوجی اختیارات حاصل نہ ہو جزا و سزا کے قوانین بنانے کا مجاز بھی نہ ہو، لیکن سماجی و عائلی مسائل میں خود مختار ہوں اور ان کا پرسنل لاء بھی محفوظ ہو۔ ردالمحتار (۳/ ۲۷۵) میں ہے:

”کل مصر فیه وال مسلم من جھة الکفار یجوز منه إقامة الجمعة و الأعیاد وأخذ الخراج تقلید القضاء و تزویج الایامیٰ“۔

دارالحرب: ایسا ملک جہاں اسلامی احکامات کا بالکلیہ نفاذ نہ ہو اور مسلمانوں کو امان لئے بغیر اس میں رہنے کا حق حاصل نہ ہو اور دارالحرب سے اس کی سرحدیں ملتی ہوں۔

”لا یصیر دار الاسلام دار حرب إلا بامور ثلٰثة باجراء أحکام أھل الشرک وباتصالھا بدار الحرب وبأن لا یبقیٰ فیه مسلم و لا ذمی أمنا بالامان الاول علی نفسه۔

وقالا بشرط واحد لا غير وهو اظهار حكم الكفر وهو القياس هنديه ردالمحتار۔قوله باجراء احكام اهل الشرک ای علی الاشتهار وأن لايحكم فيها بحكم الاسلام هنديه وظاهره انه لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرک لا يكون دارالحرب"۔

محققین کی اس تحقیق پر کہ ہندوستان نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالاسلام بلکہ بین ہے، اب اس بات کا تعین ضروری ہے کہ اس درمیانی دار کو کونسا دار کہا جائے کہ اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے علاوہ کوئی اور دار ہے، نظام الفتاویٰ (ج ۲ ص ۲۰۹) میں دار کی تقسیم دارالحرب اور دارالاسلام کی تحقیق کے ضمن میں دار کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں ۱۔ دارالاسلام ۲۔ دارالحرب، پھر دار کی بنیادی اصولی طور پر چار قسمیں بیان کی ہیں : ۱۔ دارالحرب یا دارالمحاربہ ۲۔ دارالمعاہدہ والمسالمہ ۳۔ دارالامن ۴۔ دارالشر والفساد۔

اس تقسیم کی وجہ یہ بیان کی کہ دارالاسلام کا محاربہ دارالحرب سے ہوگا یا نہیں اگر ہوگا تو اس کا نام دارالحرب، یا محاربہ ہوگا اگر نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں۔ آپس میں دونوں داروں اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو اس کو دارالمعاہدہ یا دارالمسالمہ کہیں گے اور اگر معاہدہ نہ ہوگا تو پھر دو حال سے خالی نہیں یا تو اس ملک کے باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ ہوں گے، یا مامون ومحفوظ نہ ہوں گے اگر مامون محفوظ رہتے ہوں گے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ملک حبشہ تھا تو اس ملک کو دارالامن کہا جائے گا۔ اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دارالشر والفساد کہا جائے گا جیسے فتح سے قبل مکہ مکرمہ۔

اس تقسیم سے ہندوستان یا اس طرح کے جمہوری ممالک اور ان کے قوانین کو دیکھا جائے دار کی تو دارالاسلام اور دارالحرب کے علاوہ جو قسمیں بیان کی گئی ہیں وہ بے سود نظر آتی

ہیں، ہندوستان کا دستور اور قانون دیکھا جائے مثلاً مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصہ لینے کا مساوی حق اور باشندوں کی طرح ہے اور مذہب پر عمل کرنے، تبلیغ احکام کی مکمل آزادی اور مسلم پرسنل لاء بھی محفوظ ہے اور ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی میں برابر کا شریک سمجھنا اور امن وسکون سے رہنا جماعت کی کثرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک شہری ہونے کی بنیاد پر ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملک کے اہم عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر یہ سب باتیں سامنے رکھتے ہوئے دارالحرب کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ دارالاسلام ہی ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا کیونکہ دارالاسلام کی جو تعریف کی گئی ہے کہ **کل مصر فیہ وال مسلم من جھة الکفار یجوز منہ اقامة الجمعة والاعیاد واخذ الخراج الخ** اس پر صادق آتی ہے۔

۵— سود کے متعلق قرآن وحدیث میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کی روشنی میں بینک میں جمع شدہ رقوم پر سود لینا بھی حرام ہے۔ لیکن اس سود کو بینک میں چھوڑ دیا جائے تو مسلمانوں ہی کے خلاف اس کا استعمال ہوتا ہے، اس لئے حیلہ شرعی کے تحت اس کو نکال لے کہ سرکار بہت سے محصول وصول کرتی ہے جو شریعت کی رو سے ظلم ہے، یہ شخص یہ خیال کرے کہ غریب رعایا سے سرکار نے جو محصول خلاف شرع لیا ہے اسی کو میں سرکار سے وصول کررہا ہوں اور وصول کرنے کے بعد فقراء ومساکین اور رفاہِ عام میں بلانیت ثواب خرچ کردے جن سے سرکار نے بلا اذن شرع ٹیکس لیا تھا اس کے تصدق سے ربوا پر جو مواخذہ ہے ہوسکتا ہے کہ اس سے بچ جائے **کل مال حصل بطریق محذور فسبیلہ التصدق**۔

۵،۶— سود لینا اور دینا دونوں یکساں درجہ میں حرام ہیں۔ قباحت وحرمت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، حدیث میں ہے: "**لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ**"۔

الاشباہ والنظائر ۱۷۶/ پر القاعدۃ الرابعۃ عشرۃ میں فرمایا : "**ماحرم أخذہ حرم إعطاہ کالربوا**" کہ جس کا لینا حرام اس کا دینا بھی حرام جیسے ربوا۔

سود دینا غیر اسلامی مما لک میں کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ یہ اعانت علی المعصیة ہے اور سودی قرض بھی لینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ ایسا شخص جس کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور سودی قرض لینے کے سوا کوئی سبیل نہ ہو مثلاً مزدوری کا کام بھی نہیں ملتا اور بزنس کے لئے بلا سود قرض بھی نہیں ملتا تو اس کے لئے بقدر ضرورت گنجائش دی جاسکتی ہے وہ جلد از جلد اس سے نجات کی کوشش کرے۔ الاشباہ والنظائر کی شرح میں فرماتے ہیں: **"وینبغی ان یستثنیٰ الآخذ بالربو اللمحتاج فانه لا یحرم کما صرح به المصنف"۔**

۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱— سرکاری وغیر سرکاری بینکوں اور انفرادی و شخصی یا اجتماعی پبلک تنظیموں اور اداروں کی طرف سے امداد باہمی اور ترقی کے نام پر جاری منصوبے اور اسکیمیں اور اشیاء کی درآمد برآمد پر ایسے ٹیکس لگانا جو سوسائیٹیوں کے چلانے میں معاون ثابت ہوں اسلامی اقتصادی نظام سے اگر متضاد اور مخالف ہوں لیکن یہ مخالفت منصوص علیہ اور غیر مجتہد فیہ مسائل میں نہ ہو تو کسی عادلانہ متبادل نظام کے قائم ہونے تک ان اسکیموں میں شریک ہونے کی اجازت ایسے مما لک میں دی جاسکتی ہے جو غیر اسلامی اقتدار کے زیر اثر ہوں، لیکن ہندوستان میں آباد مسلم وغیر مسلم کے درمیان سودی لین دین کی کوئی گنجائش نہیں دی جاسکتی مثلاً کاروبار یا تعمیر مکان کے لئے سودی قرض لینا یا لاٹری اور قمار میں شرکت کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ یہ احکامات منصوص علیہ اور غیر مجتہد فیہ ہیں۔

☆☆☆

ربوا کی شرعی حقیقت

مولانا محمد زید☆

۱— شریعت کی اصطلاح میں ربوا اس زیادتی کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو **المراد کل زیادة لایقابلها عوض** (احکام القرآن لابن العربی ۱۰۱/۲)، فقہاء اس کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔ **وشرعا فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال بمعیار شرعی وهو الکیل أو الوزن فی الجنس** (بدائع ۱۸۳/۵، شامی ۱۷۷/۴، بحر ۱۳۵/۶)، یعنی ربا ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جو مالی لین دین میں بغیر کسی عوض کے شرعی دائرہ کے اعتبار سے ہو۔

شریعت اسلامیہ میں ربا تین قسموں پر مشتمل ہے: ۱۔ وہ ربا جو جاہلیت عرب میں رائج تھا ۲۔ مکیلی موزونی (یعنی ناپ تول کر بیچنے والی اشیاء) میں اتحاد جنس کی صورت میں زیادتی کا ربا۔ ۳۔ ربا کی دو علتوں میں سے ایک کے پائے جانے کی صورت میں نساء (ادھار) کا ربا (احکام القرآن للجصاص ۴۶۰/۱)، جاہلیت عرب میں جو ربا جائز تھا اس کی صورت یہ تھی، مدت معینہ کے لئے ادھار رقم دے کر باہم رضامندی کے ساتھ اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھتی جاتی اتنا ہی سود بڑھاتے جاتے، (طحاوی شریف ابواب الصرف ابن جریج ۶۲/۳، احکام القرآن ۴۶۵/۳) ربوا کی بقیہ دونوں قسموں سے اہل عرب ناواقف تھے اسلام نے آکر ان دونوں صورتوں کو بھی داخل فرمادیا جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

ربوا کے حدود اور اس کا دائرہ:

ربوا کا دائرہ محدود ہے، چند شرائط وعلل کے ساتھ جب وہ شرائط پائے جائیں گے تب تو ربوا کا تحقق ہوگا۔ ورنہ ایک شرط کے بھی فوت ہو جانے سے ربوا اپنے دائرہ سے خارج ہو جائے گا اور وہ شرائط وعلل کتب فقہ میں مذکور ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱– مال کی زیادتی ایسی ہو کہ اس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو۔

۲– وہ زیادتی شرعی معیار کے تحت ہو یعنی کیل ووزن میں داخل ہو خواہ حقیقتاً ہو یا حکماً۔

۳– جن اشیاء میں لین دین ہو رہا ہو وہ سب متحد الجنس ہوں۔

۴– نفس معاملہ میں وہ زیادتی مشروط ہو خواہ صراحۃً خواہ دلالۃً وعرفاً۔

۵– زیادتی کی شرط متعاقدین (معاملہ کرنے والوں) میں سے کسی ایک کے لئے ہو زیادتی کی شرط اگر کسی ثالث کے لئے ہوگی تو ربوا نہ ہوگا البتہ شرط باطل ہوگی۔

۶– زیادتی کی شرط مبادلات ومعاوضات میں ہو تبرعات میں ربوا نہیں۔

۷– متعاقدین کا مال ایسا ہو کہ شریعت نے ان کو معصوم قرار دیا ہو یعنی مباح المال نہ ہوں (جیسے کسی حربی کا مال)

۸– متعاقدین کا مال ایسا ہو کہ شریعت نے ان کو معصوم ہونے کے ساتھ متقوم (یعنی مضمون) بھی قرار دیا ہو۔

۹– متعاقدین کا مال کسی ایک ہی عاقد کی ملکیت نہ ہو ورنہ ربوا نہ ہوگا جیسے سید وعبد کے مابین، مذکورہ بالا شرائط ہی ربوا کا دائرہ ہیں اس دائرہ میں رہتے ہوئے ربوا کا تحقق ہوگا۔ ایک شرط کے فوت ہو جانے سے بھی ربوا اپنے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ البتہ دوسری اور تیسری شرط میں سے صرف ایک کے پائے جانے سے ربوا النساء کا تحقق ہو جائے گا۔

یہ تمام شرائط بدائع اور شامی سے ماخوذ ہیں (بدائع ۵/ ۱۹۲)۔

۳— دارالحرب ودارالاسلام کی بحث:

دارالحرب، دارالاسلام کی تعریف اور اس میں امام صاحب وصاحبین کا اختلاف مشہور ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب کے تحقق کی تین شرطیں ہیں ا۔غیر مسلمین کے احکام وقوانین کا نفاذ ہونا یعنی ان کا پورا تسلط ہونا ۲۔کسی دارالحرب سے اتصال ہونا یعنی درمیان میں کوئی اسلامی ملک حائل نہ ہو۔ ۳۔کوئی مسلمان یا ذمی سابق امان کی بنا پر مامون نہ ہو۔

امام ابو یوسف وامام محمدؒ کے نزدیک صرف پہلی ہی شرط سے دارالحرب کا تحقق ہوجاتا ہے۔یعنی کفار کا پورا تسلط ہونا خواہ وہ دارالحرب سے متصل ہو یا نہ ہو۔سابق امان باقی ہو یا نہ ہو۔یہ اختلاف اور تعریف فقہ کی تمام کتب معتبرہ میں مذکور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''دارالحرب نی نی کا مفہوم اور اس کی حقیقت بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ جہاں کفر کا بول بالا اور غیر مسلمین کا پورا تسلط ہو قطع نظر اس سے کہ امن وامان ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی فرمایا گیا ہے اس کی حقیقت علامات کی ہے اور علامات میں تغیر وتبدل وتخلف ہوا ہی کرتا ہے، ان علامات کو کبھی شرائط کے نام سے ذکر کردیا جاتا ہے، لیکن کسی شے کی حقیقت اور اس کے وجود وتحقق کے لئے علامات کی حیثیت معیار کی نہیں ہوتی کہ اس کے بغیر اس کا وجود ہی نہ ہو۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے باب جمعہ میں ''مصر نی نی وئی ئی قریۃ کبیرہ'' کی تعریف میں فقہاء نے مختلف تعبیرات اختیار فرمائی ہیں اور ان کو مصر کے وجود کے لئے شرط قرار دیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت صرف علامات کی ہے، اسی وجہ سے ہر فقیہ اور مفتی نے اپنے زمانے کے اعتبار سے شرائط بیان کئے (کما حققہ التھانوی فی فتاوی) ورنہ ظاہر بات ہے کہ دارالحرب کے تحقق کے لئے امام صاحب کے بیان کردہ شرائط کے مطابق دارالحرب سے اتصال ہونا بھی ضروری ہے، یعنی درمیان میں کوئی اسلامی ملک حائل نہ ہو اور یہ اس وجہ سے شرط لگائی گئی کہ اسلامی ملک مداخلت کرسکتا تھا اور دارالحرب سے اتصال کی بنا پر وہ دارالحرب اس کی حمایت کرے گا۔

لیکن آج حکومتوں کے دستور اور معمول کے مطابق کوئی حکومت دوسری حکومت کے معاملات میں دست درازی اور مداخلت نہیں کرسکتی، جس کا حاصل یہ نکلا کہ جس علّت کے پیش نظر امام صاحب نے یہ شرط ضروری قرار دی تھی اس زمانہ میں اب بے سود رہے گی اور اب اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی، لہذا اس زمانہ میں بالاتفاق یہ شرط ناقابل اعتبار ہونا چاہئے۔

احقر ناچیز کی ناقص رائے کے مطابق امام صاحب وصاحبین کے مابین دارالحرب کی بابت جو اختلاف مذکور ہے دراصل وہ اختلاف کوئی حقیقی اور واقعی اختلاف نہیں ''دارالحرب نی نی کی اصل حقیقت ''غیر مسلم کا تسلط نی نی ہوجانا ہے۔ اس میں امام صاحب اور صاحبین دونوں متفق ہیں۔ البتہ امام صاحب نے مزید جن دو شرطوں کا اضافہ فرمایا ہے وہ اس وجہ سے کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں تب ہی غیر مسلم کا تسلط ہوتا ہے، اس لئے امام صاحب نے مغلوب ہونے کا ایک معیار مقرر فرما کر اپنے زمانہ کے اعتبار سے احتیاطاً بطورِ علامت کے ایسی دو شرطوں کا اضافہ فرمادیا جن سے صاحبین نے سکوت فرمایا ورنہ اصلاً امام صاحب وصاحبین کا کوئی حقیقی اختلاف نہیں اس کی تائید ذیل کی تصریحات سے ہوتی ہے:

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''صاحبین اور امام صاحب کا اس میں اتفاق ہے کہ دارالاسلام جب مغلوب کفار ہو جائے گا تو دارالحرب ہوجائے گا۔ مگر خلاف اس میں ہے کہ مغلوب ہونے کے لئے کس قدر قبضہ کفار کافی ہے اور امام صاحب نے دو قید احتیاطاً زائد کی ہے کہ غلبہ کا تمام ہونا ان پر موقوف ہے (تحذیر الاخوان ر ۲)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''شرعی اصطلاح میں دارالحرب کی تعریف یہ ہے کہ جہاں پورا تسلط غیر مسلم کا ہو، تعریف تو یہی ہے آگے جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ امارات ہیں اور ہندوستان میں غیر مسلم کا پورا

تسلط ہونا ظاہر ہے نی نی۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی تحریر فرماتے ہیں:

"امام صاحب نے اظہار احکام شرک کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں در حقیقت اسی استیلا یا قہر وغلبہ اہلِ شرک کی علامتیں ہیں۔ نہ کہ مستقل کوئی جداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اسی چیز کی توضیح وتشریح ہے جسے صاحبین نے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے (برہان اگست ۶۶ء)۔

دارالکفر کے اقسام:

اصلاً دار کی صرف دو ہی قسمیں ہیں دارالاسلام، دارالحرب، دارالحرب کا دوسرا نام دارالکفر بھی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

غور وفکر وفقہاء کے کلام اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے دارالکفر کی چار قسمیں سمجھ میں آتی ہیں ۱— دارالامن، ۲— دارالخوف، ۳— داربین الامن والخوف، ۴— دارالشر والمحاربۃ۔

۱— دارالامن ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں مسلمان امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوں، ان کی جانیں اور مال محفوظ ہوں۔ وہ اسلامی احکام کے مطابق زندگی گذارنے میں آزاد ہوں (اگرچہ غیر مسلم کا تسلط ہو) خواہ اس بنا پر کہ وہ ایک دستوری جمہوری حکومت ہے یا مصالحت وسالمیت کی بنا پر۔

۲— دارالخوف ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں کے مسلمان، ان کی جانیں اور مال محفوظ نہ ہوں، ہر وقت خوف خطرہ غالب ہو، شر وفساد ہوتا رہتا ہو، اس وجہ سے کہ حکام غیر مسلمین ہیں اور ان کا تسلط ہے۔

۳— داربین الامن والخوف ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں امن بھی ہو خوف بھی ہو۔ کسی علاقہ میں امن تو کسی علاقہ میں خوف، کسی زمانہ میں امن وامان اور عنقریب زمانہ میں فساد

وطغیان، قہر وغلبہ نہ مسلمانوں کا اور نہ غیر مسلموں کا کبھی ان کا اور کبھی ان کا، کبھی یہ غالب وہ مغلوب کبھی وہ غالب یہ مغلوب، تسلط پورے طور سے نہ ان کا نہ اُن کا۔

۴- دارالشر والمحاربۃ ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں عملی طور سے شر وفساد، جنگ وجدال اور قتل وجہاد کی فضا بنی ہوئی ہے (اقسام بالا کا ثبوت)۔

دارالکفر کی مذکورہ بالا چاروں قسمیں محض فرضی نہیں ہیں بلکہ شریعت میں ان کی اصل موجود ہے جن میں سے بعض کا ذکر فقہاء نے بھی کیا ہے۔

ابتداء عہدِ اسلام میں جب کہ کفار مکہ حلقہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے، ہر طرح کے مظالم ڈھاتے اور ان کی جانیں اور مال بے خوف وخطر نہ تھیں ایسی حالت میں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کا حکم فرمایا۔ حبشہ کا بادشاہ بھی غیر مسلم تھا اور وہاں بھی پورا تسلط غیر مسلم ہی کا تھا لیکن شاہِ حبشہ نے مسلمانوں کو امن وامان اور عزت کے ساتھ پناہ دی جس کی تفصیل کتب سیر میں موجود ہے۔

حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے سے قبل مسلمان جس حالت میں مکہ میں زندگی بسر کرتے تھے وہ ان کے حق میں دارالخوف تھا، کیونکہ وہاں وہ امن وامان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے ہر وقت خوف وخطرہ غالب تھا۔

اور حبشہ ہجرت کر جانے کے بعد خود حبشہ ان کے حق میں دارالامن تھا کیونکہ وہاں وہ مامون تھے اگرچہ دارالکفر وہ بھی تھا۔

تیسری قسم بین الامن والخوف ہے، اس کا تذکرہ بھی کتب حدیث فقہ میں کسی نہ کسی درجہ میں ملتا ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے، مشہور قصہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر شرائط طے ہو جانے اور صلح کی تکمیل کے بعد ابوبصیر ابو جندل نامی صحابی نے اسلام لے آنے کے بعد ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اس کے بعد جو شخص بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوتا، اسی زمرہ میں شامل ہو جاتا رفتہ

رفتہ ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہوگئی۔ ان حضرات کا کام یہ تھا کہ خود کو خطرہ میں ڈال کر جان پر کھیل جاتے۔ قریش کا کوئی بھی قافلہ وہاں سے گذرتا وہ ان پر حملہ آور ہوتے، ان کی جان مارتے اوران کا مال لے لیتے۔ تفصیلی واقعہ کتب حدیث وسیر میں مذکور ہے (مشکوۃ باب الصلح)۔

ان کی یہ صورت حال بین الامن والخوف کی تھی وہ دوسروں کو مار کران کا مال سلب کرتے لیکن خود بھی خائف رہتے کہ کہیں خودان کی جان سے نہ کھیلا جائے۔

فقہاء کے کلام میں بھی ایسے دار کا تذکرہ ملتا ہے جہاں غلبہ نہ مسلم کا ہو نہ کفار کا اس لحاظ سے نہ وہ دارالاسلام ہوااور نہ دارالکفر بلکہ اس کی حالت بین بین کی سی ہوئی۔ نہ دارالحرب کیونکہ غلبہ کسی فریق کو نہیں۔

”**فی الشرنبلا لیة سئل قاری الھدایة عن البحر المالح امن دارالحرب والاسلام فاجاب فانه لیس من احد الفریقین لانه لا قھر لا حد علیه**“ (درالمنتقی علی ہامش مجمع الأنہر ۱/۶۵۹)۔

چوتھی قسم دارالشر والمحاربہ کی ہے اس کی تفصیل کی حاجت نہیں، یہ تو ہر شخص کے نزدیک مسلم ہوگی۔

دارالکفر کے احکام:

پہلی قسم دارالامن کا حکم: اگرچہ یہ دارالکفر کی قسم ہے لیکن احکام کے لحاظ سے دارالاسلام میں لاحق ہے جو معاملات فاسدہ دارالحرب میں حربی سے جائز ہوتے ہیں وہ دارالامن میں جائز نہ ہوں گے۔

مسلمان مہاجرین حبشہ کے حق میں حبشہ دارالامن تھا لیکن کہیں اس کا ثبوت نہیں ملا کہ مسلمانوں نے اہل حبشہ سے سودی معاملہ یا عقودِ فاسدہ کو مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہو۔

محقق تھانویؒ فرماتے ہیں:

"دارالحرب کے معنی دارالکفر کے ہیں لیکن پھر اس دار کی دو قسمیں ہیں ایک دارالامن دوسرے دارالخوف۔ دارالخوف وہ ہے جہاں مسلمان خوف کی حالت میں ہوں اور دارالامن وہ ہے جہاں مسلمان مامون ہوں۔ دارالامن میں بہت احکام مثل دارالاسلام کے ہوتے ہیں نی نی (ملفوظات اشرفیہ/۱۳۷)۔

دوسری قسم دارالخوف کا حکم: دارالخوف احکام کے لحاظ سے دارالحرب کے مانند ہے جو احکام دارالحرب کے ہیں وہی اس کے بھی ہیں۔ البتہ حرب وقتال کے لئے جو شرائط ہیں ان شرائط کے بغیر قتال و جہاد کی اجازت نہ ہوگی۔ ہاں دفاعی تدابیر کے تحت ہر ممکن اور جائز صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ نیز اسلامی احکام فرائض، شعائر، پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے تو ہجرت بھی لازم ہوجائے گی عبادات عیدین وجمعہ وغیرہ کی ادائیگی اس طریقہ کے مطابق لازم ہوگی جس کو فقہاء نے ذکر فرمایا ہے لیکن اس کے علاوہ معاملات کے حق میں دارالخوف دارالحرب ہی کے حکم میں ہوگا۔

حضرت عباسؓ اسلام لانے کے بعد بھی اہل مکہ سے سودی معاملات فرمایا کرتے تھے۔

یہ واضح رہے کہ سود کی حرمت مکی زندگی میں ہی ہو چکی تھی۔ اہل کتاب کی بابت "واخذھم الربوٰ وقد نھوا عنہ" فرمایا گیا ہے اور شرائع من قبلنا بہرحال حجت ہیں جب تک کہ اس کے خلاف کا حکم نہ ہو، اور یہ آیت مکی ہے اس سے معلوم ہوا کہ سود کی حرمت مکہ میں بھی تھی۔

لیکن اس کے باوجود حضرت عباسؓ، مکہ میں جو کہ اس وقت دارالحرب (دارالخوف) تھا اہلِ مکہ سے جو کہ حربی تھے سودی معاملات فرمایا کرتے تھے۔ البتہ فتح مکہ کے بعد جب یہ مکہ دارالاسلام بن گیا اس وقت حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر مکہ میں بھی سودی معاملات کے عدم جواز کا حکم سنا دیا، کیونکہ اب مکہ دارالاسلام بن چکا تھا لیکن مکہ کے علاوہ دیگر غیر مفتوحہ علاقے

طائف وغیرہ اب بھی دارالحرب تھے اس لئے وہاں اب بھی سودی معاملات جائز تھے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ یہ علاقے بھی مفتوح ہوکر دارالاسلام بن گئے اس وقت پھر حضور ﷺ نے عمومی انداز میں سودی معاملات کو ناجائز فرما دیا (مزید تفصیلات و دلائل، اعتراضات و جوابات کے لئے ملاحظہ ہو: اعلاء السنن ج ۱۴۔ لاربٰو بین الحربی والمسلم فی دارالحرب نیز مشکل الآثار للطحاوی ج ۴)۔

دار بین الامن والخوف کا حکم: تیسری قسم بین الامن والخوف جہاں غلبہ کسی فریق کا نہ ہو اور جہاں امن وخوف دونوں حالتیں پائی جاتی ہوں، فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا دار بھی دارالحرب کے حکم میں شامل ہے۔ ایسے دار کی مثال ماقبل میں ''بحر مالح'' نی نی سے گذر چکی ہے کہ وہ نہ دارالحرب ہے نہ دارالاسلام، لیکن فقہاء فرماتے ہیں کہ باعتبار احکام کے وہ دارالحرب سے ملحق ہے۔

''ان البحر المالح ملحق بدار الحرب'' (درالمنتقی علی ھامش مجمع الانہر ۱/ ۶۵۶)۔

''قال فی النھر وینبغی ان یکون ما لیس بدار حرب ولااسلام ملحقا بدار الحرب کالبحر المالح لانہ لا قھر لاحد علیہ'' (شامی، باب النکاح الکافر ۲/ ۳۹۰)۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کی جماعت گذرنے والے قریش کے قافلوں کو لوٹ لیا کرتی تھی۔ کیونکہ ان حربیوں کا مال غیر معصوم تھا اور باہم معاہدہ ان حضرات سے ہوا نہیں تھا اس لئے حضور ﷺ نے بھی اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ یہ بھی دلیل ہے اس بات کی جب حالت بین بین کی ہو، غلبہ کسی کا نہ ہو اور صورتِ حال خوف وامن کے درمیان ہو، ایسی حالت کا حکم بھی دارالحرب کے حکم کی طرح ہوگا۔

دارالشر والمحاربہ: کا حکم ظاہر ہے اس کی تفصیل کی حاجت نہیں، مزید کلام جواب نمبر ۲ میں آرہا ہے۔

''تنبیہ ثانی مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سودی معاملات اور عقودِ فاسدہ کے لئے دار الشر والفساد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ دار الخوف و بین الامن والخوف کا بھی دار الشر والفساد کا سا حکم ہے، نیز فقہاء کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ محاربہ کے بغیر بھی دار الحرب میں سودی لین دین جائز ہے۔ حضرت عباسؓ کا مکہ والوں سے سودی معاملہ کرنا ایسے حالات میں بھی منقول ہے جبکہ شر و محاربہ کی حالت نہ تھی (اعلاء السنن) میری ناقص معلومات کے مطابق محاربہ اور شر و فساد کی شرط کسی فقیہ نے بھی نہیں ذکر کی بلکہ اس کے خلاف پر دوسری عبارات ناطق ہیں۔ کمافی المبسوط وغیرہ۔

ہندوستان دارالحرب ہے یادارالاسلام:

’’دارالاسلام ودارالحرب ثانی کی گذشتہ تفصیل وتقسیم کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ حالت میں ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ اگر دارالحرب ہے تو کون سی قسم ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جہاں دستوری حکومت قائم ہے اور ہر ملت ومذہب کو قانوناً مساوی حقوق حاصل ہیں۔

لیکن موجودہ حالات میں ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کی جانیں اوران کا مال کسی علاقہ میں پورے طور سے مامون نہیں۔ اسلام ومسلمان کے خلاف ایک نہیں کئی ایک تنظیمیں ہیں۔جن کی پوری کوشش یہی ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو ناپید کردیا جائے۔ جہاں کہیں مسلمان مال ودولت وتعداد کے اعتبار سے غالب ہیں وہاں ان کو مغلوب کرنے کی بھر پور اسکیم کے تحت کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں اور جن علاقوں میں نہیں ہوتے وہ اس وجہ سے نہیں کہ مسلمان وہاں ہر طرح سے مامون ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ فسادات ہونے میں خود غیر مسلموں کا نقصان زیادہ ہوگا۔ فتنہ وفساد کا بازار گرم ہونے کے بعد پولس اور پی اے سی کا جورویہ وکردار ہوتا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

مساجد کو شہید کرنے، مدارس کو مسمار کرنے، مسلمانوں کے خون سے گلیاں بہانے اوران کی نعشوں سے پل بنانے کی نئی نئی اسکیمیں اور کوششیں برابر جاری رہتی ہیں۔

کیا ایسے حالات میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان پورے طور سے مامون ہیں؟اور ہندوستان دارالامن یادارالاسلام ہے۔

کیاہندوستان کی موجودہ حالت مسلمانوں کے حق میں حبشہ کے مشابہ ہے؟۔

بندہ ناچیز کے نزدیک ہندوستان موجودہ حالت میں دارالحرب ہے۔ کیونکہ کفار کا تسلط ہے اور دارالحرب کے اقسامِ اربعہ میں سے دارالخوف میں شامل ہے جہاں کے مسلمانوں

کوخوف وخطر رہتا ہو۔

ورنہ علی سبیل التنزل قسم ثالث ''بین الامن والخوف نی نی میں تو بہر حال داخل ہے کیونکہ غلبہ وتسلط یقینا یہاں مسلمانوں کا نہیں۔ اور خوف وامن کی حالت بار بار پیدا ہوتی رہتی ہے اور دونوں ہی صورتوں میں احکام دارالحرب کے جاری ہوں گے جس کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

۲- دارالحرب میں سودی معاملات کا حکم:

اس مسئلہ میں علماء وفقہاء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، امام محمد کا مسلک یہ ہے کہ دارالحرب میں حربیوں سے سودی معاملات کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز ہے۔

امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ عدم جواز کے قائل ہیں۔ مسالک و مذاہب کی تفصیل وادلہ کتب فقہ میں مذکور ہے (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۳۲، فتح القدیر ۶/ ۱۷۸، البحر الرائق ۶/ ۱۴۷، شامی باب الربوا)۔

فریق اول کی دلیل یہ ہے کہ کافر حربی کا مال مباح ہے کیونکہ وہ غیر معصوم اور نا قابل ضمان ہے، اسی لئے استیلاء کی صورت میں ملکیت تامہ حاصل ہو جاتی ہے گویا بذاتِ خود کافر حربی کا مال مباح ہے۔ البتہ مستامن مسلم جب امن لے کر دارالحرب میں داخل ہوگا ایسی صورت میں حربی کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہونا درست نہیں کیونکہ یہ غدر اور خیانت ہے۔ البتہ حربی کی رضامندی اور اجازت کے بعد کسی بھی طرح اور کسی بھی صورت سے اس کا مال حاصل کرنا درست ہے، گویا حصول مال کے لئے اس کی رضامندی شرط ہے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی بھی صورت اختیار کرنا درست ہے حتی کہ وہ معاملات جو صورۃ عقود فاسدہ یا حدود ربوا میں داخل ہوں ان کے ذریعہ بھی اس کی مرضی حاصل کر کے مال لینا جائز ہوگا۔ کیونکہ اس وقت یہاں پر عقود فاسدہ یا سودی معاملہ کا حقیقۃً وجود ہی نہیں بلکہ سودی معاملہ کی ایک

صورت ہے۔ بالفاظ دیگر حربی کی رضامندی حاصل کرنے کی ایک تدبیر ہے ورنہ حقیقی سود ہرگز مقصود نہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حربی کا مال حاصل کرنے میں نفس عقد کو کوئی دخل نہیں مال حاصل کرنا تو بطور استیلاء کے ہے اور استیلاء کا جواز مسلم مستامن کے لئے اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ حربی کی دلی رضامندی بھی شامل ہو جس کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی ہے، ورنہ اگر حربی سے محض عقد اور معاملہ کی بنا پر سود کا جواز ہوتا تو دارالاسلام میں بھی اسے جائز ہونا چاہیے حالانکہ دارالاسلام میں حربی سے بھی سودی معاملہ کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہاں پر آکر حربی کا مال بھی امان کی وجہ سے معصوم، محترم، قابل ضمان ہوگیا۔ استیلاء کے بعد بھی ملکیت حاصل نہ ہوگی۔ اب اگر یہاں سودی معاملہ کے ذریعہ مال حاصل کرے گا تو محض معاملہ اور نفس عقد ہی کو دخل ہوگا نہ کہ استیلاء کو اس لئے ناجائز ہے۔

ماقبل میں جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے یہ سب خلاصہ ہے فقہاء کرام کے بیان کا، صرف چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

"وهذا لأن المستامن فيهم انما يتمكن من اخذ مالهم بطيب أنفسهم و عليه يبنى أبوحنيفه حكم عقد الربا فيما بينه وبين الحربى، واما فيما سوى ذالک فالمعاملة فى دار الحرب و دار الاسلام سواء فى حق المسلم لانه ملتزم حكم الاسلام حيث مايكون" (شرح السیر ۴/۱۳۰)۔

"وليس العقد من المسلم خدعة لتحصيل رضا الحربى به واتفقوا على جواز خداع الكفار من اهل الحرب كيف ما امكن الا ان يكون فيه نقض عهد وامان" (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۴۳)۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں "(امام ابوحنیفہؒ) ادلہ شرعیہ سے ربوا کی حرمت کے لئے مالِ محترم کی قید لگاتے ہیں اور مالِ محترم سے مراد وہ مال ہے جو غیر مباح ہو۔ اس سے زیادہ آسان تعبیر مال

محترم کی یہ ہے کہ جس مال میں بغیر عقد صحیح کے تصرف جائز ہو وہ مال محترم ہے، پس ایسا مال تو مومن یا ذمی کا ہے باقی حربی کا مال صرف بوجہ عارضی عہد کے محترم ہو جاتا ہے ورنہ فی نفسہ محترم نہیں کیونکہ مال کے اندر احترام صاحب مال کے احترام کی وجہ سے آتا ہے اور کافر غیر ذمی محترم نہیں۔ جب احترام نہیں تو اس میں ربوا بھی نہیں (افاضات الیومیہ ۱۰؍۱۴۲)۔

ایک شبہہ کا جواب:

ماقبل میں جو کچھ بھی عرض کیا گیا اس سے وہ شبہ بھی حل ہو گیا کہ "**المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما یکون**" یعنی مسلمان اسلامی احکام کا پابند ہے خواہ کہیں بھی ہو دارالحرب یا داراسلام میں۔

یا یہ کہ آیت ربوا قرآن پاک میں عام ہے، احادیث وآثار اور قیاس سے اس میں دارالاسلام کی تخصیص وتقیید اور دارالحرب میں حربی کا استثناء کرنا کیسے جائز ہوگا۔

جواب ظاہر ہے کہ دارالحرب میں عقودِ فاسدہ یا سودی معاملہ کو مسلمان کے حق میں جائز قرار دیا جارہا ہے بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ صورۃً ربوا کا معاملہ کرکے حربی کی رضامندی سے مال حاصل کرنا جائز ہے اور اس میں ربوا کا تحقق نہیں ہوگا کیونکہ یہ حقیقی ربوا نہیں بلکہ ربوا کی صورت ہے اور یہی مطلب ہے حدیث :"**لا ربوا بین الحربی والمسلم فی دار الحرب**" یعنی ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔

آیت ربوا عام ہے ہر زمان ومکان اور ہر شخص کے حق میں اور اخبار وآثار اور قیاس سے ہم تخصیص نہیں کرتے اور نہ تخصیص وتقیید لازم آتی ہے۔

کیونکہ ربوا کی حرمت عام ہے جبکہ ربوا کا تحقق ہو جائے نہ کہ تحقق ربوا سے پہلے۔

رہی یہ بات کہ دارالحرب میں حربی سے ربوا کا تحقق ہوگا یا نہیں، آیتہ ربوا اس سے ساکت ہے۔

احادیث وآثار اور قیاس کا مطلب اور اس کا مقتضیٰ یہ ہرگز نہیں کہ تحقق ربوا کے بعد بھی

دارالحرب میں سود جائز ہے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ دارالحرب میں حربی سے ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوتا جس کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

صورۃ ربوا حقیقت ربوا کو مستلزم نہیں:

اب صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ حربی کا مال چونکہ غیر معصوم وغیر محترم ہے، اس لئے مباح ہے۔ اس کی رضامندی کے بعد استیلاء کے ذریعہ مالک بننا درست ہے، لیکن کیا اس مباح کے حصول اور اس کی رضامندی کو حاصل کرنے کا ذریعہ کسی ناجائز معاملہ کو بنایا جا سکتا ہے۔

روایات وآثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد ربا جب اپنی حقیقت سے خالی ہو تو محض صورۃ ربوا سے حقیقی ربوا لازم نہیں آتا اور نہ ہی شبہ ربوا پیدا ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اپنے غلام سے صورۃ سود کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ حضرت جابرؓ نے ان کو دیکھ کر منع فرمایا اور کہا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں، نہیں لیکن غلام اور آقا کے درمیان ربوا متحقق ہی نہیں ہوتا (المحلی ۸/ ۵۱۴)۔

"کان لا یریٰ بینه وبین غلامه ربا اخرجه الامام الشافعی فی مسنده" (مسند شافعی/ ۸۴، کذا فی اعلاء السنن ۱۴/ ۳۴۶)۔

مذکورہ بالا روایات سے واضح طور سے معلوم ہوا کہ محض صورۃ ربوا سے حقیقت ربوا یا شبہہ ربوا کا شبہہ کرنا درست نہیں۔ شبہہ ربوا حرام ضرور ہے لیکن جب واقعی شبہہ متحقق ہو جائے، محض صورۃ ربوا سے شبہہ ربوا لازم نہیں آتا۔ اس لئے ضرورت کے وقت حربی کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے صورۃً سودی معاملہ کرنا بغیر کسی کراہت کے بلاشبہہ جائز ہے (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۴۶)۔

حلت عقد وحلت مال سے متعلق نصوص صریحہ:

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حربی کا مال تو درست ہے لیکن اس مال کے استعمال کے لئے صورۃ سودی معاملہ کرنا درست نہیں اور حلت مال حلت عقد کو مستلزم نہیں اور نہ ہی فقہاء نے اس کے جواز کی صراحت کی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نصوص صریحہ عبارات فقہیہ سے حلت مال وحلت عقد دونوں کے جواز کی صاف تصریح موجود ہے، چند نصوص ملاحظہ ہوں:

۱– **"عن إبراهيم النخعي قال لا بأس بالدينار بالدينارين في دار الحرب بين المسلمين وبين اهل الحرب"** (مشکل الآثار ۴/ ۲۴۵)۔

۲– **"عن مكحول ان رسول الله ﷺ قال لا ربوا بين أهل الحرب واظنه قال وبين أهل الاسلام"** (فتح القدیر ۶/ ۱۸۷)۔

موخر الذکر روایت کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ مرسل ہے اور مرسل غیر مقبول ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں مرسل روایت بھی خصوصاً مکحول جیسے ثقہ راوی کی مقبول ہوتی ہے (حوالہ بالا)۔ نیز کسی امام کا کسی حدیث کو مستدل بنانا خود حدیث کی توثیق کی علامت ہوا کرتی ہے۔ بعض حضرات نے اس حدیث کی توجیہ کرتے ہوئے متن حدیث میں لفظ "لا" کو لاء نہی فرمایا ہے۔ لیکن فقہاء محدثین میں کسی نے اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا اور فقہاء نے لانفی کے طور سے ہی اس کو ذکر فرمایا ہے نیز باقاعدہ **الحديث يفسر بعضه بعضها** حدیث اول **لا بأس** کی وجہ سے اس کو لاء نہی پر محمول کرنا درست نہیں معلوم ہوتا (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اعلاء السنن ج ۱۴)۔

جواز کی شرط اور استیمان کی قید:

زیر بحث مسئلہ میں جہاں کہیں فقہاء نے تذکرہ فرمایا ہے وہاں استیمان کی بھی قید

لگائی ہے، یعنی دارالحرب میں حربی سے سودی معاملہ اگر مستأمن کرے تب تو جواز ہوگا ورنہ نہیں۔ اور مستأمن اس کو کہتے ہیں جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہو اس لحاظ سے ہندوستانی مسلمان چونکہ مستأمن نہیں ہیں کیونکہ کسی دارالاسلام سے امن لے کر یہاں نہیں آئے۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں یہاں کے حربیوں سے سودی معاملہ کا جواز بھی نہ ہونا چاہیے۔

لیکن فقہاء کی تصریحات میں ادنیٰ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استیمان کی قید مقصود بالذات نہیں اور اس کی حیثیت شرط کی نہیں کہ اس کی تفویت سے اصل حکم فوت ہو جائے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستأمن کے قید صرف اس واسطہ ہے کہ دارالحرب میں جا کر غدر و خیانت و سرقہ کا ارتکاب لازم نہ آئے (اعلاء السنن ۳۴۲/۲)۔

"وانما يفترق المستأمن من غير المستأمن فی حرمة الغدر بالامان والمستأمن انما هو مامور بإرضاء اهل الحرب فيما يا خذه من اموالهم بای وجه كان ان الا ستيمان لم يزد شياءً سوی تحريم الغدر بهم فاباحة اموالهم له علی حالها كما كانت قبل الاستيمان" (اعلاء السنن ۳۴۱/۲)

ان سب عبارات سے معلوم ہوا کہ استیمان کی قید صرف اس واسطے ہے تا کہ غدر وخیانت لازم نہ آئے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بغیر استیمان کے بھی حربی کی رضا حاصل ہو جاتی ہے اور اصل باشندہ ہونے کی وجہ سے ان کو استیمان کی ضرورت نہیں یعنی جو بات استیمان کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ ان کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عباسؓ مکی زندگی میں مکہ میں رہتے ہوئے بھی حربیوں سے سودی معاملات کیا کرتے تھے اور ظاہر بات ہے کہ باشندہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے استیمان کی کوئی حاجت نہ تھی۔

الترجیح بین القولین:

زیر بحث مسئلہ ''سود فی دارالحرب نفی اختلافی مسئلہ ہے، طرفین ایک طرف ہیں قاضی ابویوسف دوسری جانب، فقہ حنفی کی تمام کتب معتبرہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک راجح اور معتمد ومفتی بہ قول طرفین ہی کا ہے۔ فقہ کے دیگر مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی آسان ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں، دلائل سے قطع نظر مقلدین احناف کے لئے صرف اتنی بات کافی ہوسکتی ہے کہ اس مسئلہ میں امام صاحب وامام محمد ایک طرف ہیں اور دوسری جانب قاضی ابویوسف صاحب ہیں اور بعد کے مجتہدین اور اصحاب تخریج نے طرفین ہی کے قول کو اپنایا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق طبقات فقہاء میں سے کسی طبقہ کے فقہاء نے امام ابویوسفؒ کے قول کو ترجیح نہیں دی۔ بلکہ کتب فقہ کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبقہ علیا اور صفِ اول کے تمام علماء حنفیہ طرفین ہی کے قول کو راجح سمجھتے ہیں۔

امام ابوجعفر طحاوی، ابن الہمام، شمس الائمہ سرخسی جو طبقات ثالثہ میں شمار کئے جاتے ہیں اس کے علاوہ علامہ کاسانی صاحب بدائع، صاحب بحر علامہ ابن نجیم، صاحب ہدایہ وغیرہ تمام فقہاء محققین ومحدثین احناف نے طرفین کے ہی قول کو ترجیح دی ہے (مشکل الآثار ۴/ ۲۴۵، مبسوط ۱۴/ ۵۹، سیر کبیر ۳/ ۲۲۸)۔

ہمارے فقہاء حنفیہ کا دستور ہے کہ (علاوہ قاضیخاں وملتقی الابحر کے) جب کسی اختلافی مسئلہ کا ذکر فرماتے ہیں ان کے نزدیک جو قول محقق، راجح، معتمد، مفتی بہ ہوتا ہے اس کی دلیل کو موخّر بیان کرتے ہیں (رسم المفتی/ ۸۵)۔ اور کتب فقہ میں دیکھا جائے تو ہر کتاب میں طرفین ہی کے قول کو موخر اور ترجیح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (بدائع ۵/ ۱۹۲، بحر ۶/ ۱۴۷، ہدایہ مع فتح ۶/ ۱۷۸، مجمع الانہر ۴/ ۹۰)۔

امام ابن ہمام دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: **''وتاخیر دلیلھما بحسب عادۃ المصنف ظاھر فی اختیارہ قولھما''** (فتح القدیر ۶/ ۲۷۹)۔

اس کے علاوہ حنفیہ کے تین طبقوں میں سے سب سے پہلے طبقہ کی کتاب ”مبسوط نی نی ہے۔فقہ حنفی میں جس کو معیاری حیثیت حاصل ہے اور اختلاف اقوال وادلہ کی بناء پر ترجیح وتعدیل میں جس کو معیار کا درجہ دے کر سہارا لیا جاتا ہے۔اس کتاب میں اگر کسی قول کو ترجیح دے دی جائے تو اس کے خلاف نہ تو عمل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔اسی کتاب ”مبسوط نی نی کے اندر دلائل کی روشنی میں طرفین ہی کے قول کی ترجیح بیان کی گئی ہے۔

”قال العلامة الطرسوسی مبسوط السرخسی لا یعمل بما یخالفه ولا یرکن الا الیه ولا یفتی ولا یعول الا علیه“ (رسم المفتی ر ۵۹)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے تمام فقہاء نے سلفاً وخلفاً طرفین ہی کے قول کو راجح فرمایا ہے، جب یہ بات محقق ہے کہ اصحاب تخریج، اہل ترجیح مجتہدین فی المذہب نے طرفین ہی کے قول کو ترجیح دی ہے تو اب اس کے بعد اصول افتاء کے پیش نظر فقہاء کی تصریح کے مطابق دوسرے قول یعنی امام ابو یوسفؒ کے مسلک پر فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے کی گنجائش نہیں سمجھ میں آتی۔

”وفی فتاوی العلامة ابن الشلبی لیس للقاضی ولا للمفتی العدول عن قول الامام الا اذا صرّح أحد من المشائخ بأن الفتوی علی قول غیره فلیس للقاضی أن یحکم بقول غیر أبی حنیفة فی مسئلة لم یرجح فیها قول غیره ورجحوا فیها دلیل أبی حنیفة علی دلیله، فإن حکم فیها فحکمه غیر ماض لیس له غیر الانتقاض“ (رسم المفتی ر ۷۳)۔

مذکورہ بالا تصریحات اور آداب افتاء کے پیش نظر طرفین کے قول سے عدول کر قاضی ابو یوسف کے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ متاخرین فقہاء میں سے بھی کسی فقیہ نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح نہیں دی۔

اکابر علماء کا رجحان:

البتہ اکابر علماء کے اس میں مختلف نظریات ہیں۔ شاہ عبد العزیز صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی نے طرفین ہی کے قول کو اختیار فرمایا ہے جیسا کہ ان کے فتاویٰ سے ظاہر ہے۔

حضرت تھانوی کے کلام میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن بعد کی تحریرات وفتاویٰ اور تفسیر بیان القرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم جواز یعنی امام ابو یوسف کے قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔

لیکن مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی فرماتے ہیں کہ محقق تھانویؒ نے محض احتیاط وتقویٰ کی بنیاد پر امام ابو یوسفؒ کے قول کی ترجیح فرمائی ہے اور اس ترجیح کے دلائل ذکر فرمائے ہیں لیکن بنیاد احتیاط وتقویٰ ہے (اعلاء السنن ۱۴/ ۲۶۰)۔ حضرت تھانویؒ کے بعض ملفوظات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے رسالہ تحذیر الاخوان جو ان کی آخری تحریر ہے، اس سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے اخیر میں فرماتے ہیں کہ میں نے تو احتیاط کو لیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں" مجبوری اور اشد ضرورت میں ان لوگوں کے قول پر عمل کرے جو ربوا فی دار الحرب کے قائل نہیں ہیں (دعوت عبدیت ۱۹/ ۱۵۱)۔

موجودہ اکابر علماء دیو بند میں سے حضرت اقدس مفتی محمود صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں۔

"ہندوستان کے متعلق علماء کی آراء مختلف ہیں۔ دونوں طرف اہل تحقیق ہیں، ہر جانب دلائل موجود ہیں، بندہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، گنجائش ہر جانب ہے اختلاف کی وجہ سے اجتناب بالیقین احوط ہے نی نی۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"دونوں طرف اہلِ تحقیق ہیں لہذا سود لینے میں بھی گنجائش ہے اختلاف کی وجہ سے نہ

لینا احوط ہے نی نی ۔

یہ واضح رہے کہ اگر چہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے یہ فتاویٰ ابتداء زمانہ کے ہیں لیکن یہ فتاویٰ بالکل اخیر اور عنقریب زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کی نظر ثانی اور سماعت کے بعد شائع ہوئے ہیں جن پر مفتی صاحب نے کوئی کلام نہیں فرمایا اور جن پر کوئی حاشیہ درج نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی حضرت مفتی صاحب کی وہی رائے ہے جو اوپر درج ہوئی۔

حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ قطعاً ہر جگہ سود لینا ناجائز فرماتے ہیں، ایسی حالت میں جانب احتیاط سود کا نہ لینا ہے نی نی ۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں ئی ئی انگریزی بینک سے سود لینے کے متعلق بھی علماء محققین کا فتویٰ بنظر احتیاط اسی پر ہے کہ جائز نہیں ہے نی نی

''وعیدوں کے اطلاق کو دیکھتے ہوئے احتیاط اس میں ہے کہ جمہور علماء امت کے قول پر عمل کیا جائے چنانچہ احتیاط یہی ہے کہ ناجائز قرار دیا جائے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ شاہ عبد العزیز صاحب، مولانا عبد الحی صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب دار الحرب میں سود کے جواز کے قائل ہیں اور یہی ان کا فتویٰ ہے۔ البتہ اکابر علماء دیو بند بر بناء احتیاط وتقوی فتوی یہی دیتے ہیں کہ درست نہیں جس کا حاصل یہ نکلا کہ اصل فتویٰ کے اعتبار سے جواز ہے محض احتیاط کی وجہ سے عدمِ جواز کا مسئلہ بتلایا جاتا ہے ورنہ گنجائش ہے، البتہ بعض اکابر مطلقاً عدم جواز کے قائل ہیں۔

قائلین عدم جواز کے نزدیک جواز کی صورت:

جو حضرات بینک کے سود کو ناجائز فرماتے ہیں خواہ اس بنا پر کہ ہندوستان دار الحرب

نہیں یا اس بنا پر کہ دارالحرب میں سود لینا جائز نہیں، ان حضرات کے نزدیک بھی بعض شرعی حیلہ سے سود لینے اور دینے کی گنجائش ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"مگر ایک حیلہ شرعی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی خیال کرے کہ سرکار بہت سے محصول (ٹیکس) اپنی رعایا سے لیتی ہے کہ ہماری شریعت میں اس کا لینا جائز نہیں گو قانون انگریزی سے وہ خلاف نہیں ہیں مگر شرع محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ظلم ہے اور ناجائز ہے اور مستحق رد ہے۔ سو یہ شخص یوں خیال کرے کہ جو غریب رعایا سے سرکار نے محصول خلاف شرع لیا ہے اس کو میں سرکار سے مسترد کراتا ہوں اور پھر اس کو وصول کر کے انھیں لوگوں پر تقسیم کر دے جن سے سرکار نے بلا اذنِ شرع لیا تھا ایسی نیت میں شاید حق تعالیٰ مواخدہ نہ فرمائیں نی نی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

جس قدر روپیہ گورنمنٹ آپ سے بذریعہ ٹیکس وصول کرتی ہے اسی قدر روپیہ آپ گورنمنٹی بینک یا دوسرے محکمات سرکاری سے جس طرح ممکن ہو وصول کر سکتے ہیں گورنمنٹ اس کا نام سود رکھے یا کچھ اور آپ اپنا جائز مطالبہ وصول کرنے کی نیت سے لیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں اور آپ کے حق میں سود نہ ہوگا، ایسے مواقع میں فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنے حق کی مقدار چوری یا غصب کر کے بھی اگر کوئی شخص اپنے مدعیوں سے وصول کر لے تو جائز ہے۔

حضرت مفتی محمود صاحب اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"سرکاری بینک اور سرکاری محکمہ سے حاصل شدہ سود کی رقم غیر واجبی ٹیکس میں ادا کرنا بھی درست ہے بلکہ صدقہ سے مقدم ہے۔

مذکورہ بالا فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ قائلین عدم جواز کے نزدیک بھی سرکاری بینکوں

سے ہر شخص کے لئے سود لینا جائز ہے۔ اگر سرکار نے خود اس سے ظالمانہ ٹیکس (واجب الرد) لیا ہے تب تو اپنے حق کو وصول کرنے کی نیت سے لینا درست ہے ورنہ دوسرے مسلمان بھائیوں کا حق وصول کرنے کی نیت سے لینا درست ہے۔ پھر لے کر غرباء میں تقسیم کردے۔

اسی طرح ظالمانہ ٹیکسوں یا رشوت میں وہ سود دینا بھی درست ہے جو خود حکومت نے دیا تھا۔

۵- دارالحرب میں سود دینے کا حکم:

شق اول: دارالحرب میں حربیوں سے جس طرح سود لینا جائز ہے اسی طرح سود دینا بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں بھی مسلمان کا نفع ہو۔

دلائل وآثار کے عموم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ لینے دینے میں کوئی فرق نہ ہو، چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے:

"ویستوی ان کان المسلم اخذ الدرھمین بالدرھم، او الدرھم بالدرھمین لانہ طیب نفس الکافر بما اعطاہ قل ذلک او کثر" (مبسوط ۱۴/۵۹)۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بھی یہی فرماتے ہیں کہ کفار سے سود لینا اور دینا دونوں جائز ہے (فتاوی عزیزی/ ۵۸۲)۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

لیکن ابن ہمام نے فتح القدیر میں اپنے اساتذہ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ "**ان مرادھم بالحل الربا والقمار اذا حصلت الزیادۃ للمسلم نظراً الی العلۃ وان کان اطلاق الجواب خلافہ**(فتح القدیر ۶/۱۷۸)، اسی کو علامہ شامیؒ نے بھی نقل فرمایا ہے۔ یعنی حلت ربا کا حکم اسی وقت ہے جبکہ زیادتی مسلمان کو حاصل ہو، فقہاء کی یہی مراد ہے اگرچہ الفاظ عام ہیں لیکن مبسوط کی گذشتہ عبارت میں صاف تصریح ہے کہ لینا دینا دونوں جائز ہے۔

دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مبسوط کی عبارت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حربی

کافر کے ساتھ احسان کر کے قلیل کے عوض کثیر مال دے دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر دو لاکھ روپیہ (بعد میں) دے کر نقد ایک لاکھ روپیہ لے کر بیع کرنے میں مسلمان کا نفع ہو تو یہ درست ہے، کیونکہ اس میں بھی نفع اور زیادتی درحقیقت مسلمان ہی کو حاصل ہے، کیونکہ آجل (نقد) آج کل (ادھار) کے مقابلہ میں بہرحال بہتر ہوتا ہے، لہٰذا ابن ہمام اور علامہ شامی ہی کی تعلیل کے پیش نظر یہ سود جائز ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ سود لینے کی طرح سود دینے کی بھی گنجائش ہے بشرطیکہ اس میں نفع مسلمان ہی کا ہو۔

(شق دوم) حکومت کے قوانین کی بنا پر بے شک واقعی کچھ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جس کی بنا پر سود دینا جائز ہے۔ مثلاً انکم ٹیکس سے بچنے کی خاطر سودی قرض (محض دکھلاوے کے لئے) لینا ناگزیر ہوتا ہے تاکہ ظالمانہ ٹیکس سے نجات رہے اور ظلم وضرر سے بچنے کے لئے سودی قرض لے کر اس پر سود دینا جائز ہونا چاہیے۔

سودی رقم کا مصرف اور سرکاری غیر سرکاری بینکوں کا فرق:

بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا لینا شرعاً درست ہے اور اگر ظن غالب ہو کہ نہ لینے کی صورت میں یہ رقم ناجائز امور میں یقیناً خرچ ہوگی، ایسی صورت میں سودی رقم نکالنا واجب ہے۔

لے لینے کے بعد اس کو اپنے مصرف میں لانا درست ہے، کیونکہ یہ حربی کا مال ہے اور اگرچہ بینک والے وہی سود دیتے ہیں جو دوسروں سے وصول کرتے ہیں جس میں مسلمان بھی شامل ہیں، لیکن یہ توجیہ چل سکتی ہے مسلمان جو سود لیتے ہیں وہ وہ ہے جو غیر مسلم سے لیا گیا ہے اس لئے گنجائش ہے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ غرباء فقراء کو (ثواب کی نیت سے بھی) صدقہ کردے اور یہ صدقہ کا حکم وجوبی نہ ہوگا۔

قائلین عدم جواز کے نزدیک غیر واجبی ٹیکسوں میں اس کا صرف کرنا مقدم ہے۔ خود

استعمال کرنے کی گنجائش نہیں۔غرباء پرثواب کی نیت سے صدقہ کرنا بھی اس کا مصرف ہے۔

اس مسئلہ میں سرکاری غیر سرکاری بینکوں میں کوئی فرق نہیں، مدارِحکم حربی وغیر حربی ہونا ہے،، اگرحربیوں کا سود دیا جاتا ہوتو جائز ہےخواہ سرکاری بینک ہوں یا غیر سرکاری۔اور اگر صرف مسلمانوں سےلیا ہوا سود دیا جاتا ہوتو ناجائز ہےاور اگر دونوں سےلیا جاتا ہوتو گنجائش ہے اور اگر خود اپنی طرف سے بینک والے دیتے ہوں اور وہ غیر مسلم ہوں تب بھی جائز ہے، البتہ اگر مسلمان بینک اپنے پاس سے سود دیں تو ناجائز ہے۔

۶-سودی قرض لینے کا حکم:

سودی قرض لینے کی یقیناً گنجائش ہے، اگرچہ بعد میں سود دینا پڑے کیونکہ دارالحرب میں سود لینا دینا دونوں جائز ہیں (مبسوط ۵۹/۱۴)۔ دینے کی شرط یہ ہے کہ اس میں بھی نفع مسلمان کا ہو۔ **والحکم یدار مع علۃ** مسئلہ کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

۷-حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت سودی قرض لینا:

حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت جوسودی قرضے تقسیم کئے جاتے ہیں اس کا لینا جائز ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ جائز ہے، کیونکہ ہندوستانی باشندہ ہونے کی حیثیت سے ترقیاتی اسکیموں میں اس کا بھی حصہ ہے۔اس لحاظ سے عام سودی قرضوں سے اس کی حیثیت کچھ مختلف ہے، قائلین عدم جواز کے نزدیک بھی گنجائش ہونا چاہیے کیونکہ اس کی حیثیت عام سودی قرضوں سے مختلف ہے۔باشندہ ہونے کی حیثیت سے ترقیاتی اسکیموں میں حصہ ملنا ہمارا حق ہےاورحق والے کوحق نہ ملنا ظلم وضرر ہے لہٰذا استحصال حق کے لئے دفع ظلم وضرر کی خاطر رشوت کی طرح اس کو بھی جائز ہونا چاہئے۔

۸-ایک خاص صورت کا حکم:

یہ صورت بلا شبہ جائز ہے، کیونکہ حربی سے عقود فاسدہ کے ذریعہ نفع حاصل کرنا جائز ہے، اور قائلین عدم جواز کے نزدیک اس کی دو جہتیں ہیں ایک تو عملی طور سے سودی لین دین دوسرے نفس عقد۔ مذکورہ صورت میں عملی طور سے سودی لین دین نہیں اس لئے یہ قرض حلال ہے لیکن ابتداء نفس عقد سود کا تھا اس لئے یہ عقد ناجائز ہے اور حرمت عقد سے حرمتِ مال لازم نہیں آتا (امداد الفتاوی ۳/ ۱۵۴)۔ حاصل کلام یہ کہ فریق ثانی کے نزدیک قرض لینا جائز نفس عقد ناجائز۔

۹ — بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت سودی لین دین:

بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت جو سودی معاملات ہوتے ہیں وہ جائز ہیں۔ اگر حربی ملک سے ہے تو جائز ہے، کیونکہ رضا حاصل ہے اگر غیر حربی ملک سے ہے تو دفعاً للحرج جائز ہے، کیونکہ ایک ملک دوسرے ملک سے الگ تھلگ رہ کر سخت حرج اور تنگی کا شکار ہو جائے گا جواز ضرور ہے لیکن اس فاسد اور باطل رواج کو ختم کرنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر مجموعی حیثیت سے عائد ہوتی ہے۔

۱۰ — شخصی اور سرکاری بینکوں کا فرق:

سرکاری بینک ہوں یا اشخاصی دونوں میں کوئی فرق نہیں مدار حکم حربی وغیر حربی ہونا ہے۔ اگر معاملہ حربیوں سے ہے تو جواز ہوگا ورنہ نہیں۔ مسئلہ کی تفصیل جواب نمبر ۴ میں گذر چکی۔

انکم ٹیکس سے بچنے اور قیمتی اشیاء خریدنے کے لئے رشوت وسود دینے کا حکم:

یہ صورت بلاشبہہ جائز ہے کیونکہ اس میں مسلمان کا نفع نیز دفع ضرر ہے۔ قائلین عدم جواز کے نزدیک بھی گنجائش ہونا چاہیے کیونکہ تجارت کے ذریعہ ترقی کرنا، کسی قسم کا کوئی مال ٹرک وغیرہ خریدنا۔ یہ ہمارے لئے حلال ہے اور ہم کو اس کا حق حاصل ہے۔ ہم جب اس حق کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو ٹیکس وغیرہ کے سارے قضیے کھڑے ہو جاتے ہیں تو

اگر چہ یہ صورت اضطرار کی نہیں لیکن ظلم ضرر ہے جس میں کھلا ہوا ہمارا ضرر ہے، اس لئے ظلم وضرر سے بچنے کے لئے اس طرح کی صورتیں بھی جائز ہونی چاہیئے۔

☆☆☆

ہندوستان میں سود کا مسئلہ

مولانا مطیع الرحمن رضوی

قرآن میں ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے : ’’أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا‘‘ مگر لفظ ربا اپنے معنی مراد کے اعتبار سے مجمل ہے جس کی تعریف نبی کریم ﷺ نے حدیث پاک : ’’الحنطة بالحنطة والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح والذهب بالذهب والفضة بالفضة مثلا بمثل يدا بيد والفضل ربوا‘‘ سے فرمائی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ سود کا وجود وتحقق حدیث پاک میں مذکور صرف انھیں چھ چیزوں میں محصور ہے یا دوسری چیزوں میں بھی ہوسکتا ہے؟ ـــــ اس سلسلے میں احادیث نبویہ میں کوئی صراحت نہیں ملتی، حتی کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا : خرج النبی علیه السلام عنا ولم يبين لنا ابواب الربوا (نورالانوار ص ۹۷) ۔ نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور رباء کے ابواب کی پوری وضاحت نہیں فرمائی۔

مگر ائمہ کرام کا مجموعی فیصلہ ہے کہ سود کا وجود وتحقق انھیں چھ چیزوں میں محصور نہیں، کیونکہ اس کا وجود وتحقق معلول بہ علت ہے تو جہاں جہاں یہ علت متحقق ہوگی سود کا وجود وتحقق ہوگا، لیکن اس کی علت کیا ہے اس کی صراحت بھی حدیث پاک میں نہیں، اس لئے اس کی علت کے سلسلہ میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف ہوگیا۔ امام شافعی نے اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو علّت قرار دیا ہے تو امام مالکؒ نے اپنے اجتہاد سے کسی اور چیز کو۔

سود چونکہ دوطرح کا ہوتا ہے (۱) ربا الفضل (۲) ربا النسیہ تو امام اعظم ابوحنیفہؒ نے پہلی قسم کے سود کی علت قدر اور جنس کے مجموعہ کو اور دوسری قسم کے سود کی علت قدر اور جنس میں سے ہر ایک کو انفرادا قرار دیا ہے "**فالعلة عندنا الكيل او الوزن مع الجنس فحرمة ربو الفضل بالوصفين و حرمة النسا باحدهما**" (ہدایہ مع الفتح ۲۸۹/۵)۔

قدر سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں ناپ تول سے فروخت ہوتی ہوں۔ جیسے سونا، چاندی، دھان، گیہوں وغیرہ۔ جنس سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کے نام اور مقصد ایک ہوں جیسے دھان، گیہوں وغیرہ کی اقسام (شامی)۔

اسی طرح شرائط کے سلسلہ میں بھی اختلاف ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک سود کے وجود وتحقق کی ایک شرط یہ ہے کہ نفس عقد میں زیادتی یا ادھار کی بات لفظاً یا عرفاً ہو، اگر نفس عقد میں زیادتی یا ادھار کی بات نہ ہو اور ادائیگی میں کچھ زیادہ کر دیا جائے یا تاخیر ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

"**شرط فيه اى فى العقد**" (فتح القدیر ۲۷۷)۔

"**اعلم ان ذكر النسا للاحتراز عن التعجيل لان القبض------- لا يشترط --------- فانما يشترط فيه التعيين دون التقابض**" (ردالمحتار ۱۸۹/۴)۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ عاقدین میں غلامی اور آقائی کا رشتہ نہ ہو۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز کی خرید وفروخت ہو رہی ہے عاقدین میں اس چیز کے اندر شرکت عنان نہ ہو۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ عاقدین میں شرکت مفاوضہ نہ ہو۔

یونہی ایک شرط یہ بھی ہے کہ بدلین معصوم اور قابلِ ضمان ہوں۔

ومن شرائط الربوا عصمة البدلين وكونهما مضمونين بالاتلاف (شامی ۴/ ۱۷۶)۔

اگر بدلین معصوم اور قابلِ ضمان نہ ہوں تو قدری وجنسی چیزوں کے نفس عقد ہی میں زیادتی یا ادھار کی بات ہونے کے باوجود بھی شرط کے فقدان کی وجہ سے اذا فات الشرط فات المشروط کے تحت سود کا تحقق نہ ہوگا اور ادھار یا زیادتی جائز ہوگی، خواہ عاقدین میں غلامی وآقائی کا رشتہ اور شرکت عنان وشرکت مفاوضہ نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو شخص دارالحرب میں مسلمان ہو اور ابھی دارالاسلام نہیں آیا کہ مسلمانوں پر اس کے حفظ ومنع کی ذمہ داری ہو، تو ان کا مال چونکہ معصوم وقابلِ ضمان نہیں اس لئے اس مسلمان شخص سے قدری وجنسی چیزوں کے تبادلہ میں نفس عقد کے اندر ادھار یا زیادتی کی شرط لگا دینے کے باوجود بھی سود نہیں ہوگا۔

"حکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھا جر کحربی فللمسلم الربوا معه خلافا لھما لان ماله غیر معصوم" (درر الحکام ۲/۱۱۸)

"وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھاجر کالحربی عند ابی حنیفة لان ماله غیر معصوم عنده فیجوز للمسلم الربوا معه" (البحر الرائق ۶/۱۴۷)۔

میری مذکورہ بالا معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سود کی کوئی ایسی حقیقت شرعیہ نہیں ہو سکتی جو ساری جزئیات ومواد کو تمام ائمہ کرام کے نزدیک شامل ہو، ہو سکتا ہے کہ کسی صورت میں حنفیہ کے نزدیک سود ہو اور شافعیہ کے نزدیک نہ ہو۔ یا شافعیہ کے نزدیک سود ہو اور حنفیہ کے نزدیک نہ ہو۔ اسی طرح مالکی اور حنبلی حضرات کا معاملہ ہے۔ مثلاً لوہا کو لوہا کے عوض فروخت کرنے میں کمی زیادتی ہو تو حنفیہ کے نزدیک سود ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں، "**کالجص والحدید لا یجوز عندنا لوجود القدر والجنس وعنده یجوز لعدم الطعم والثمنیة**" (ہدایہ مع الفتح ۵/۲۸۹)۔

البتہ ہر ایک امام کے مذہب کے مطابق سود کی الگ الگ جامع تعریف کی جا سکتی ہے اور اس کا دائرہ بتایا جا سکتا ہے۔ مثلاً امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق اس کی جامع ومانع

تعریف یہ ہوگی کہ مخصوص شرائط کے ساتھ (جن میں سے ایک اہم شرط بدلین کا معصوم وقابل ضمان ہونا بھی ہے) قدری وجنسی چیزوں کے تبادلہ میں زیادتی یا ادھار کو سود کہتے ہیں۔

"فضل احد المتجانسين على الاخر بالمعيار الشرعي اى الكيل والوزن" (البحر الرائق ۶/۱۳۶)۔

"ان وجدا حرم الفضل والنسا فلم يجز بيع قفيز بر بقفيزين منه متساويا او احدهما نسأ (درمختار) قوله اى كبيع قفيز بر بقفيزين منه حالا (شامی ۴/۱۷۸) القدر والجنس فعند اجتماعهما يحرم التفاضل والنسا وباحدهما مفردا يحرم النساء ويحل التفاضل" (فتح القدیر ۵/۲۷۵)۔

۲— صورۃً سودی معاملات کو حقیقۃ سود قرار دینے میں دار الحرب یا دار الاسلام کی کوئی تخصیص نہیں، جن صورتوں میں سود کی علت اپنی شرائط کے ساتھ متحقق ہوگی ان صورتوں میں حقیقۃ سود کا وجود متحقق ہوجائے گا۔ خواہ دار الحرب میں ہو یا دار الاسلام میں۔ اسی طرح جن صورتوں میں سود کی علت اپنی شرائط کے ساتھ متحقق نہ ہوگی، ان صورتوں میں حقیقۃ سود کا وجود متحقق نہیں ہوگا، خواہ دار الاسلام میں ہو یا دار الحرب میں۔

درر الحکام اور بحر الرائق کے حوالوں سے یہ ثابت کر چکا ہوں کہ کوئی شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا تو ان سے صورۃ سودی معاملات حقیقۃ سود نہیں۔ لیکن اگر دار الاسلام سے دو مسلمان امان لے کر دار الحرب جائیں تو ان کے وہاں آپس میں وہ معاملات جائز نہیں، حقیقۃ سود ہیں۔ "فلو هاجر الينا ثم عاد اليهم فلا ربوا اتفاقا (درمختار) اى لا يحوز الربو امعه فهو نفى بمعنى النهى كمافى قوله تعالىٰ فلا رفث ولا فسوق فافهم" (ردالمحتار ۴/۱۸۸)۔

رہا یہ سوال کہ حدیث پاک سے لے کر فقہاء کرام کی عبارات تک میں صورۃ سودی معاملات سے حقیقۃ سود ہونے کی نفی جہاں جہاں کی گئی ہے ہر جگہ دار الحرب کی قید لگی ہوئی ہے، تو پھر دار الاسلام میں ان سودی معاملات سے حقیقۃ سود ہونے کی نفی کیسے درست ہوگی؟ نیز ان تمام

حضرات نے متفقہ طور پر دارالحرب کی قید کیوں لگائی ؟۔

تو عرض کروں گا کہ حدیث پاک اور ارشادات فقہاء میں دارالحرب کی قید کے بعد فقہاء کرام کی تعلیل وتفریعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالحرب کی قید تخصیصی واحترازی نہیں بلکہ زائد واتفاقی ہے، کیونکہ جو حکم معلول بہ علت ہو وہ حکم علت کے ساتھ دائر ہوتا ہے، یعنی جہاں جہاں وہ علت پائی جاتی ہے حکم بھی پایا جاتا ہے۔اور جہاں جہاں علت مفقود ہو جاتی ہے وہاں حکم بھی مفقود ہو جاتا ہے۔اب اگر اس حکم میں کوئی قید بھی ہو تو وہ قید تخصیصی واحترازی نہیں بلکہ زائد ہوتی ہے، جیسے آیت کریمہ :"لَا تَأْكُلُو الرِّبٰوٓا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" سود کا حکم معلول بہ علت ہے، یعنی ربا کی علت کا اپنی شرائط کے ساتھ پایا جانا تو چاہے وہ علت دونا دون کی صورت میں پائی جائے یا کسی اور صورت میں سود کا حکم بہر حال ہوگا۔ یہ نہیں کہ دونا دون کی صورت میں ہو تو سود ہے اور اس سے کم وبیش ہو جائے تو سود نہ رہے، اس لئے دونا دون کی قید اتفاقی ہوئی۔

"وانما قید به اجراء علی عادتهم والا فهو حرام مطلقا غیر مقید بمثل هذا القید" (تفسیرات احمدیہ/ ۱۴۴)۔

مگر زائد کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ بے فائدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حکم کا مدار اس قید پر نہیں کہ اس کے ختم ہونے سے حکم ختم ہو جائے، اب رہی یہ بات کہ پھر اس قید سے فائدہ کیا ہوا؟ تو عرض کروں گا کہ عرب میں چونکہ دونا دون ہی سود کھانے کا رواج تھا۔تو قرآن کریم نے ان کے اس مذموم فعل پر خصوصیت کے ساتھ پابندی لگائی اور ان کو تنبیہ کی کہ تمہارا یہ فعل قطعاً اسلامی اصول کے خلاف ہے۔

اسی طرح مسلمان اور حربی کے مابین کاروبار میں چونکہ شرط (مال کا معصوم وقابلِ ضمان ہونا) کے فقدان کی وجہ سے سود کی علت نہیں پائی جاتی تو سود کا تحقق بھی نہیں ہوگا۔اب خواہ یہ فقدان دارالحرب میں ہو یا دارالاسلام میں سود کا تحقق بہر حال نہیں ہوگا اور قید زائد واتفاقی

ہوگی۔

مگر یہاں بھی اتفاقی کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ بے فائدہ ہے، بلکہ اس دور میں حربی چونکہ دارالاسلام میں بغیر امان لئے آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہاں ان کی جان ومال ہر وقت خطرہ میں ہوتی۔ **لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان و ما معہ فیئا** (ردالمحتار ۳/ ۲۴۸) تو حربی کے ساتھ کاروبار کی یہی صورت تھی کہ مسلمان امان لے کر ان کے ملک میں جائے، اس لئے دارالحرب کی قید لگا کر اس بات سے آگاہ کر دیا گیا کہ حربیوں کا مال صرف اسی صورت میں جائز ومباح نہیں ہے کہ وہ امان لئے بغیر دارالاسلام میں آجائیں، بلکہ تم بھی امان لے کر وہاں جاؤ تو بھی جائز ومباح ہے۔ ہاں اس صورت میں دھوکہ وفریب نہ کرنا، کیونکہ یہ اسلامی شان کے خلاف ہے۔

"**یجوز لہ اخذ مال بغیر طیبۃ نفسہ فاذا اخذ علی ہذا الوجہ بطیبۃ نفسہ کان اولی بالجواز اذا دخل الیہم بامان فاموالہم مباحۃ فی الاصل الا ما حظرہ الامان قد حظر علیہ الامان ان لا یاخذ مالہ الا بطیبۃ نفسہ**" (جوہرہ نیرۃ ۱/ ۲۱۸)۔

بہر حال دارالحرب ہو یا دارالاسلام مسلمان اگر حربیوں سے ان کا مال دھوکہ وفریب دیئے بغیر لے لیں تو سود اور حرام نہیں، جائز ومباح ہے، یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے ارشاد فرمایا ہے: "**تحقیق المقام علی ما یظہر للعبد الضعیف غفر اللہ تعالی لہ ان مال الحربی مباح مطلقا فی الدارین لا یحظر الا لاجل الغدر الخ**"۔

رہا شبہ یہ کہ قرآن واحادیث میں سود کی حرمت مطلقا ہے جس میں مال حربی وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں تو المطلق یجری علی اطلاقہ کے تحت مال حربی کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ خبر واحد اور فقہاء کی تعلیل سے اس مطلق کو مقید کر کے مالِ حربی کو خارج قرار دینا کیسے درست ہوگا؟

تو عرض کروں گا کہ آیات واحادیث میں لفظ ربا سے مطلق مال کی زیادتی مراد نہیں

بلکہ مال محظور کی زیادتی مراد ہے جس میں حربی کا مال داخل ہی نہیں کہ ان کو خارج کرنے کی بات پیدا ہو (دیکھئے: فتح القدیر ۵/۳۳۰)۔

دارالحرب۔ کفار کے اس ملک کو کہتے ہیں جہاں کبھی مسلمانوں کا قبضہ ہو کر اسلام کے احکام جاری نہ ہوئے ہوں۔ یا کبھی مسلمانوں کا قبضہ ہو کر اسلام کے احکام جاری ہوئے تھے تو اب اسلام کے احکام بالکلیہ روک کر کفر کے احکام جاری کر دیئے گئے ہوں۔ اور اس ملک اور کسی دارالحرب کے درمیان کوئی اسلامی ملک نہ ہو، نیز وہاں کوئی مسلمان یا ذمی شخص اپنے پہلے امان پر باقی نہ ہو۔

دارالاسلام۔ وہ ملک ہے جس میں اسلامی سلطنت ہو یا اب اسلامی سلطنت نہیں ہے تو اسلام کے احکام بالکلیہ رک کر کفر کے احکام جاری نہیں ہو گئے ہیں،، یا اسلام کے احکام تو بالکلیہ رک گئے ہیں، مگر وہ ملک دارالحرب سے متصل نہیں ہے، یا دارالحرب سے متصل بھی ہے تو کوئی مسلمان یا ذمی شخص اپنے پہلے امان پر وہاں باقی ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریفات جو مجمع الأنہر (۱/۵۱۲) اور درمختار (۱/۵۴۰) میں ذکر کی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ دونوں ایسی ضدیں ہیں کہ ایک کے ارتفاع سے دوسرے کا تحقق ہوجاتا ہے، اور تحقق سے ارتفاع تولامحالہ، جوملک دارالاسلام ہوگا وہ ملک اس وقت دارالکفر (دارالحرب) نہیں ہوسکتا اور جوملک دارالحرب ہوگا وہ ملک اس وقت دارالاسلام نہیں ہوسکتا، یونہی یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی ملک کسی وقت دارالاسلام اور دارالحرب کچھ نہ ہو۔

ہاں فقہاء کرام کی عبارتوں میں دارالاسلام اور دارالحرب کے علاوہ دارلامان اور دارالبغاۃ کے اطلاقات بھی آئے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دارالامن یا دارالبغاۃ دار کی مستقل قسمیں نہیں بلکہ دارالحرب اور دارالاسلام ہی کی ذیلی قسمیں ہیں۔ مسلمان امان لے کر دارالحرب جائے تو وہ دارالحرب ہی اس کے لئے دارالامان ہے۔

اسی طرح اسلامی ملک کے جس حصہ میں کچھ لوگ سلطان اسلام سے بغاوت کر جائیں وہ حصہ دارالبغاۃ ہے، مگر اس کے باوجود وہاں بالاتفاق اقامت جمعہ وعیدین فرض اور ادائیگی صحیح ہے۔ حالانکہ اس کے لئے بالاجماع دارالاسلام ہونا شرط ہے۔ کسی کے نزدیک بھی دارالحرب میں یہ چیزیں درست نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ دارالبغاۃ دارالاسلام ہی کی ایک ذیلی قسم ہے۔

دارالاسلام کی تعریف اور اقامت جمعہ وعیدین کے لئے دارالاسلام کی شرط جان لینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان موجودہ حالات میں بھی دارالاسلام ہی ہے دارالحرب نہیں۔ چنانچہ صدہا سال سے مسلمان یہاں اقامت جمعہ وعیدین فرض وصحیح جان کر ادا کرتے ہیں۔ مذہب ومسلک کے بے شمار اختلافات کے باوجود آج تک کسی نے اس کو غلط نہیں بتایا۔

۴— خالص مسلمانوں کے بینکوں یا ان کے اشتراک سے قائم شدہ بینکوں میں جمع کردہ اصل رقم پر زیادتی ملتی ہو وہ سود ہے، رہے وہ بینک جو خالص غیر مسلموں کے ہیں یا ایسے ممالک کے زیر حکومت ہیں جن پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے جیسے ہندوستان تو ایسے بینکوں سے ملنے والی اضافی رقم کے سود ہونے نہ ہونے میں تفصیل ہے، کیونکہ غیر مسلموں کی تین قسمیں ہیں۔ ذمی، مستامن، حربی۔

ذمی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان پر جزیہ مقرر کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہو اور ان کو اپنی مملکت میں رہنے کا اختیار دے دیا ہو۔

مستامن کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ لے کر ایک سال سے کم مدّت کے لئے اپنی مملکت میں رہنے کا اختیار دیا ہو۔

حربی کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو مسلمانوں نے ان پر جزیہ مقرر کیا ہو اور نہ ہی مخصوص مدت کے لئے امان دیا ہو۔ بہ لفظ دیگر جو غیر مسلم ذمی یا مستامن نہ ہو وہ حربی ہے، چاہے دارالحرب میں رہتا ہو یا دارالاسلام میں۔

ذمی چونکہ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتا ہے اس لئے ان کا مال بھی حکماً معصوم ہے۔

"فلهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين لقول على رضى الله تعالىٰ عنه انما بذل الجزية ليكون دماؤهم كدماءنا واموالهم كاموالنا"۔

مستامن کو چونکہ مسلمان امان کا عہد و پیمان دے دیتے ہیں اس لئے ان کا مال بھی ذمیوں کی طرح حکما معصوم ہوجاتا ہے۔

"وحاصله ان المستامن فى دارنا قبل ان يصير ذميا حكمه كحكم الذمى"
(ردالمحتار ۳/۲۴۹)۔

جب ذمی اور مستامن کے مال حکما معصوم ہوئے اور ان کے مال کا حکم بھی مسلمانوں کے مال کی طرح ہوگیا تو جس طرح قدری وجنسی چیزوں میں مسلمانوں سے زیادتی یا ادھار حرام و سود ہے اسی طرح ذمیوں اور مستامنوں سے بھی وہ سود اور حرام ہے۔ **"فلا يحل لمسلم فى دارنا ان يعقد مع المستامن الا ما يحل من العقود مع المسلين ولا يجوز ان يوخذ منه شيئا لا يلزمه شرعاً"** (شامی ۳/۲۴۹)۔

رہے حربی تو ان کے مال و دولت کے معصوم ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لہذا **"خلق لكم ما فى الارض جميعا"** کے تحت جائز و مباح ہیں۔

لہذا ذمی اور مستامن کے بینکوں سے یا ان کے اشتراک سے قائم شدہ بینکوں سے جو اضافی رقم ملے وہ سود ہے، اور خالص حربیوں کے بینک سے جو اضافی رقم ملے وہ سود نہیں چاہے بینک سرکاری ہوں یا غیر سرکاری۔

اب ہندوستان میں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے کہ یہاں کے غیر مسلمین ان کو جزیہ دیتے ہوں جس سے وہ ذمی ہوسکیں، اور نہ ہی مسلمانوں کا غلبہ ہے کہ غیر مسلم ان سے امان لے کر ایک مخصوص مدّت تک کے لئے رہتے ہوں جس سے وہ مستامن ہوسکیں۔ تو یہاں کے غیر مسلمین بلا شبہ حربی ہوئے۔ بلکہ مسلمانوں کے دورِ حکومت سے ہی حربی ہیں۔ جیسا کہ ملّا حضرت احمد

جیونؒ نے بھی اپنی مایۂ ناز تصنیف تفسیرات احمدیہ میں ارشاد فرمایا ہے :"**ان هم الاحر بيون وما يعقلها الا العالمون**"۔

ہندوستان کی حکومت میں چونکہ سارا عمل دخل غیر مسلموں ہی کا ہے، قانون سازی اور اس میں ترمیم و تنسیخ کا اعلان عملاً انہیں کو، سپریم کورٹ سے لے کر پارلیمنٹ تک ان کے قبضہ میں، حتی کہ ارکان پارلیمنٹ کو منتخب کرنے کا حق بھی انہیں کو۔ مسلمان اگر ان سے الگ ہو کر صرف اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں تو شاید دو تین سے زائد منتخب نہ ہوں، حکومت قائم کرنا تو بڑی بات ہے، رہا مسلمانوں کا حکومت میں شریک ہونا یا ووٹ کا استعمال کرنا تو یہ ضرورت یا موادعۃ ومخادعۃ کے طریقے پر ہے۔ جیسا کہ علامہ شامی نے جامع الفصولین وغیر کے حوالے سے فرمایا ہے:

"**ويطيعونهم عن ضرورة او بدونها ــ واما طاعة الكفرة موادعة ومخادعة**"۔

اس لئے یہاں کی حکومت غیر مسلموں ہی کی حکومت ہے اور حکومت کے املاک غیر مسلموں کے املاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی مصالح کے علاوہ خالص ہندوانہ مذہبی مصالح میں حکومت کے املاک کا استعمال عام ہے۔ سرکاری دفاتر اور حکومت کی زمینوں پر مندروں کی تعمیر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تو یہاں کی حکومت اور غیر مسلموں کے مال و دولت فی نفسہ معصوم وقابلِ ضمان نہیں۔ زیادہ سے زیادہ معاہدہ اور عقد امان کی وجہ سے محظور ہوں گے۔

"**لان مالهم مباح و بعقد الامان لم يصر معصوماً الا انه التزم الا تتعرض لهم بغدر و لا لما فى ايديهم**" (البحر الرائق ۶/ ۱۴۷)۔

اس لئے ہندوستانی حکومت یا یہاں کے عام غیر مسلموں سے سودی معاملات کر کے اضافی رقم لینا حقیقۃ سود اور حرام نہیں بلکہ دھوکہ اور فریب کے بغیر جس طرح بھی مل جائے لے لینا جائز اور مباح ہے۔ علامہ شامی نے سیر کبیر اور اس کی شرح کے حوالے سے فرمایا ہے:

"فلا باس بان یاخذ منهم اموالهم بطیب انفسهم بای وجه کان لانه انما اخذ المباح علی وجه عری عن الغدر فیکون ذلک طیبا له والاسیر والمستامن سواء حتی لو باعهم درهما بدرهمین او باعهم بدارهم او اخذ مالا منهم بطریق القمار فذلک کله طیب له مخلصا" (۴/ ۱۸۸)۔

رہا یہ کہ دستوری طور پر ملک کے وسائل آمدنی سے ایک مسلمان کو بھی منتفع ہونے کا اتنا ہی حق ہے جس قدر کسی غیر مسلم کو، نیز یہ کہ سرکاری بینکوں میں مسلمانوں کا حصہ بھی مختلف ٹیکسوں اور محاصل کے ذریعہ جمع ہے، تو حکومت کے املاک وجائداد کو مطلقا غیر مسلموں کے املاک وجائداد کس طرح قرار دے دیا جائے؟

عرض کروں گا کہ عملی زندگی کے بالمقابل کاغذی دستور کا کوئی اعتبار نہیں، نیز یہ کہ یہ دستوری انتفاع کا حق بھی ہمیں حکومت ہی نے دے رکھا ہے۔ ورنہ عملاً تو ہم اس حق سے بھی محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب کوئی مسلمان امان لے کر دارالحرب جائے تو اسے بھی وہاں کے وسائل آمدنی سے انتفاع کا کچھ نہ کچھ حق ضرور مل جاتا ہے۔ دنیا کی ساری مباح چیزوں سے مسلمانوں کو انتفاع کا حق ہے۔ مگر اس سے دنیا کی ساری چیزیں جن سے انتفاع کا حق ہے ملکیت میں نہیں آئیں گی۔ کوئی ہمیں اپنی مملوکہ شے سے بطور اباحت انتفاع کا حق دے تو اس کی وہ مملوکہ شے اس کی ملکیت سے نکل کر ہمارے ملک میں نہیں آجائے گی کیونکہ محض حق انتفاع ملک کی علامت نہیں، وہ بھی اس صورت میں جبکہ بقاء عین کے ساتھ حق انتفاع ہو۔ اپنی ملک میں آدمی جب چاہے جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے، اپنی ملک آدمی کسی کو زبردستی دینے پر مجبور نہیں ہوتا۔ البتہ مختلف ٹیکسوں اور محاصل کے ذریعہ حکومت کے خزانے میں جاتی ہے وہ یقینا پہلے مسلمانوں کی مِلک ہوتی ہے جسے حکومت جبر وغصب کے طور پر لیتی ہے۔ اور دوسری رقموں کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیتی ہے کہ امتیاز نہیں ہوسکتا۔ تو استہلاک ہوا، اور

استہلاک کی صورت میں مغصوب منہ کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے اور غاصب اس کا مالک ہوجاتا ہے۔ ہاں اس کے ذمہ ضمان واجب ہوتا ہے (دیکھئے: ہندیہ ۱۳۲/۵)۔

تو ثابت ہوا ہندوستانی حکومت کے املاک میں بطور ملکیت مسلمانوں کا حصہ نہیں، اس لئے یہاں کے سرکاری بینکوں یا غیر مسلموں کے پرائیوٹ بینکوں سے جو اضافی رقم ملے وہ حقیقۃ سود نہیں، لہٰذا جن صورتوں سے حاصل شدہ رقم حقیقۃ سود نہیں ہے اس صورتوں سے حاصل شدہ رقم کو ہر جائز کام میں صرف کرسکتے ہیں، اور جن صورتوں سے حاصل شدہ رقم سود ہے ان صورتوں سے حاصل ہونے والی رقم کو لینا جائز نہیں۔ اگر لے لی گئی ہوتو واپس کردینا ضروری ہے۔

۵ — سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ "**بقوله تعالى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان**" فقہ کا مسلمہ ضابطہ ہے، "**ما حرم اخذه حرم اعطاءه**" ہاں ضرورت و احتیاج شرعی ہو تو دینا گناہ نہیں۔ **يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح** (الاشباہ والنظائر/ ۱۴۹)۔

۶ — ضرورت وحاجت شرعیہ کی بنیاد پر سودی قرض لینے کی شرعاً گنجائش ہے، جیسا کہ اشباہ ونظائر کے حوالہ سے میں نے عرض کیا۔ ضرورت وحاجت شرعیہ کا تحقق اس وقت ہوگا جب مثلاً سودی قرض لئے بغیر گذر اوقات کا ذریعہ نہ ہو، یا واقعۃ عزت وآبرو کی بن آئے، نہ یہ کہ خوامخواہ جھوٹی عزت بنائے رکھنے کو ذلت ورسوائی کا نام دے دیں۔

۷ — حکومت ہند ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جو قرض سودی قرضہ کے نام سے تقسیم کرتی ہے، اس کے جواز کے لئے فاضل سائل نے حکومت کے املاک میں مسلمانوں کے جس "حق نی نی" کی نشاندہی کی ہے اور صورۃ رشوت پر قیاس کا نکتہ پیش فرمایا ہے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ اس "حق نی نی" سے ان کی مراد حق بطور ملک ہے یا بطور اباحت یا بطور ضمان۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حکومت کے املاک میں مسلمانوں کا حق بطور ملک نہیں ہے، جیسا کہ میں جواب نمبر ۴ کے تحت عرض کر چکا ہوں، لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مسلمانوں کا حق بطور ملک ہے تو صرف قرض لینے والے ہی کا حق بطور ملک نہیں تمام مسلمان کا حق بطور ملک ہوگا، جس سے بدلین معصوم ومضمون بالاتلاف ہوں گے، اس لئے اس صورت میں اضافی رقم دینے کی شرط پر قرض لینا حرام اور حقیقۃ سودی معاملہ ہوگا۔ جس کو صورۃً رشوت پر قیاس کر کے جائز نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ حقیقۃ سود کی حرمت منصوص ہے اور قیاس سے وہی حکم ثابت کیا جاسکتا ہے جو منصوص نہ ہو۔

اسی طرح مسلمانوں کا حق بطور اباحت ہو تو اس صورت میں بھی اس کے جواز کے لئے صورۃً رشوت پر قیاس نہیں ہوسکتا، کیونکہ رشوت صوری بھی ضرر و نقصان سے بچنے کی خاطر جائز ہے، تحصیل اباحت منفعت کے لئے نہیں۔ اباحت کی صورت میں اضافی رقم دینا اگر چہ حقیقۃ سود نہیں مگر اپنے مال کا زیاں اور کفار کو فائدہ پہنچانا ہے، اس لئے وہ بھی ممنوع ہوگا۔

”فی شرح اللباب ویحرم اخذ الاجرة ممن یدخل البیت اویقصد زیارة مقام ابراھیم علیه الصلوة والسلام بلا خلاف بین علماء الاسلام وائمة الانام کما صرح به فی البحر وغیره اه۔ وقد صرحوا بان ما حرم اخذه حرم دفعه الا لضرورة ولا ضرورة ھھنا لان دخول البیت لیس من مناسک الحج“ (ردالمحتار بحوالہ جلی النص فی اماکن الرخص ر ۲۰۱)۔

ہاں مسلمانوں کا حق بطور ضمان ہو تو میں جواب نمبر ۴ کے تحت عرض کر چکا ہوں کہ مال مغصوب دوسرے کے مال میں غیر ممتاز طور پر مل جائے تو غاصب اس کا مالک ہوجاتا ہے، اور مغصوب منہ کا حق ضمان سے متعلق ہوجاتا ہے، اس لئے اس صورت میں اس کے حصول کے لئے دی جانے والی رقم درحقیقت رشوت صوری ہوگی۔ اور رشوت کی اس رقم کے ساتھ ساتھ مال مغصوب کے مساوی مالیت کی اصل رقم لے کر واپس نہ کرنا بھی اس حیثیت سے جائز ہوگا۔

الغرض یہ حق بطور اباحت ہوتو مطلق اور بطور ضمان ہوتو مقدار مغصوب کی وصولی کے لئے مخصوص حد تک لازمی رشوت دینے کے علاوہ دوسری صورتوں میں جوحکومت سے صورۃ سودی معاملات کر کے اضافی رقم دینا اس وقت جائز ہوگا جب ظن غالب ملتحق بالیقین ہوجائے کہ اس صورت میں جتنی اضافی رقم ادا کرنی ہوگی اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم اس سے زائد ہوگی، کیونکہ حقیقۃ تو یہ سود ہے نہیں، البتہ بہ ظاہر اپنے مال کا نقصان اور غیر مسلموں کو فائدہ پہنچانا ہے جو درست نہیں، مگر جب کم فائدہ دے کر زیادہ حاصل کرنے کا ظن غالب ہے تو ممانعت مرتفع ہونی چاہیے۔

۸— ظاہر ہے کہ جب چھوٹ کا تناسب اضافی رقم کے مساوی ہو تو صرف کہنے ہی کے لئے یہ اضافی رقم ہوئی ورنہ حکومت اسی مقدار میں رقم وصول کرے گی جو اس نے دی ہے، تو اس میں سود کا شائبہ کیا رہا۔ ہاں اسے سود کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

۹— شرائط، احکام اور انواع کے اعتبار سے تجارت کی بے شمار صورتیں ہیں۔ اس لئے جب تک کسی مخصوص صورت کی نشاندہی اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ نہیں ہوجاتی یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ تجارت صحیح بھی ہے یا نہیں۔ اگر صحیح ہے تو اس کی درآمد پر جو اضافی رقم سود کے نام سے دی جاتی ہے یا برآمد پر جو اضافی رقم ملتی ہے وہ حقیقۃ سود ہے یا نہیں۔

۱۰— ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سود کے تحقق کی علت جن صورتوں میں بھی پائی جائے گی ان صورتوں میں اس جہت سے حکماً کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اور جن صورتوں میں سود کے تحقق کی علت نہ پائی جائے ان صورتوں میں حکما کوئی فرق نہیں ہوگا۔ البتہ کسی اور جہت سے جواز یا ممانعت ہو تو دوسری بات ہے۔ اس میں بینک کے سرکاری یا غیر سرکاری ہونے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۱— جب یہ باتیں ثابت ہوگئیں کہ صورتاً سودی معاملات سے حقیقۃ سود ہونے کی نفی کے سلسلہ میں دار الحرب کی قید اتفاقی ہے۔ ہندوستان کے غیر مسلم حربی ہیں، ان کا مال معصوم وقابل

ضمان نہیں بلکہ مباح ہے۔مسلمان فریب وغدر کے علاوہ جس صورت سے بھی لیں جائز ہے۔تو وہ افراد یا کمپنیاں جوصنعت وحرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں اگر صرف غیر مسلموں سے لین دین اور کاروبار کریں تو جائز ہے، بلکہ اگر مسلمانوں سے بھی اس طرح کاروبار کریں کہ تین لاکھ روپے میں کسی کو ٹرک خرید کر دیتا ہے اور چھ سال میں ان سے قسط وار چھ لاکھ روپے وصول کرتا ہے،تو اسے ٹرک خرید کرتے وقت ہی ٹرک کی قیمت چھ لاکھ روپے طے کرلی جائے اور سالانہ یا ماہانہ ادائیگی کے لئے جو قسط طے کرنا ہو طے کرلے۔ ہاں قسط متعین نہیں کی اور ادائیگی کے لئے چھ سال کا وقت دے دیا تو اگر تین سال میں ادا کر دے تو ساڑھے چار لاکھ روپے ہی کا مستحق ہوگا۔

قضى المديون الدين المؤجل قبل الحلول لا ياخذ من المرابحة التى جرت بينهما الا بقدر ما مضى من الايام اه ملتقطا (رد المحتار ۴/۱۷۱) **والتعجيل جائز وما التنجيم الا نوع من التعجيل** (کفل الفقیہ/۱۹۲)۔

اب اس صورت میں یہ اضافی رقم سود نہیں ہوگی بلکہ ٹرک کی قیمت ہے۔اگرچہ قانونی دشواریوں یا کسی اور مصلحت کے پیش نظر کاغذات میں اسے سود یا کچھ اور لکھنا پڑے۔

یوں ہی وہ حضرات یا کمپنیاں جوصنعت وحرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں غیر مسلموں کی ہوں تو ان سے بھی اسی طرح طے کرایا جاسکتا ہے،لیکن اگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں اور سود کے نام پر ہی وصول کرنے کے لئے مصر ہوں تو اس صورت میں اگر ظن غالب یہ ہو کہ سود کے نام پر جو اضافی رقم دی جائے گی اس ٹرک کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم اس سے زیادہ ہوگی تو جائز ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ دی جانے والی اضافی رقم حقیقۃ سود تو بہر حال نہیں ہے۔البتہ بظاہر غیر مسلم کو فائدہ پہنچانا ہے جس کے جواب کے لئے ہم اپنی معروضات پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔

☆☆☆

ربوا کی حقیقت

مفتی عبدالرحیم قاسمی

ربوا کی حقیقت اور دائرہ کار:

دورِ جاہلیت کے غیر متمدن عرب تجار ہوں یا عصرِ حاضر کے ترقی یافتہ سرمایہ دار، انفرادی سودخوری کے حامی ہوں یا اشتمالی واشترا کی بنکار، سبھی اسلامی نظام سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، کوئی اندھا دھند کارروائی کر کے ربوا کو مثل بیع قرار دیتا ہے، کوئی ربا القرآن اور ربا الحدیث کو خلط ملط کر کے التباس واشتباہ کی بھول بھلیوں میں انسانیت کو گم کرنا چاہتا ہے، کوئی ربا کو استہلاک واستغلال کے مختلف خانوں میں بانٹ کر سودخوری کے چور دروازے کھول رہا ہے، حالانکہ قرآن حکیم حلّتِ بیع اور حرمت ربوا کو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر کے صاف طور پر بیان کرتا ہے، ایثار پیشہ صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے قلوب کو ہموار کرتا ہے ،حکمت وموعظت سے سخت دلوں کو موم کر کے رضا کارانہ سود کو چھوڑنے کے لئے تیار کرتا ہے، آخرت کے ہولناک انجام سے ہوشیار کرتا ہے، عیش طلبی وخودغرضی میں مخمور ومدہوش انسانوں کو للکارتا اور ہٹ دھرمی وکٹ حجتی کرنے والوں کو پھٹکارتا ہے اور خدائی جنگ کا چیلنج دیتا ہے۔

حالانکہ آیاتِ ربوا کے شانِ نزول، طرز بیان اور فصیح زبان سے ربوا کا مفہوم یہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ قرض دینے والا اپنے دیئے ہوئے منافع سے بلاعوض جو متعین شرح وصول کرتا ہے وہ سود ہے۔ قرض کے مقصد یا قرضدار کی نوعیت بدلنے سے ربوا کی حقیقت نہیں بدلتی۔ قرضدار غریب ونادار ہو یا امیر وتاجر اس کی انفرادی ضرورت کے لئے قرض درکا ہو یا

اجتماعی کاروبار کے لئے رفاہی اسکیم چلانا مقصود ہو یا فلاحی منصوبہ بروئے کار لانا ہو بہر کیف صلب عقد میں علت ربوا متحقق ہونے کی بنا پر یہ معاملہ سود کے دائرہ میں داخل ہوگا۔

اس ترقی یافتہ دور میں سود مختلف روپ بدل بدل کر سامنے آرہا ہے، لیکن ترجمان القرآن شارع اسلام خاتم النبین علیہ الصلاۃ والسلام کی تفسیر وتعبیر اور تشریح وتوضیح ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' کی روشنی میں فقہائے کرام اس کو آسانی سے پہچان لیتے ہیں، چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ تجارتی سود کے مجوزین کی گرفت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ربوا کی مخالفت کا ذکر ایک جگہ نہیں مختلف سورتوں کی سات آٹھ آیتوں میں اور چالیس سے زیادہ احادیث میں مختلف عنوانوں سے اس کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے کسی ایک جگہ کسی ایک لفظ میں بھی اس کا اشارہ موجود نہیں کہ یہ حرمت صرف اس ربوا کی ہے جو شخصی اغراض کے لئے لیا دیا جاتا تھا، تجارتی سود اس سے مستثنیٰ ہے، پھر کسی کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم میں سے کسی چیز کو محض اپنے خیال سے مستثنیٰ کردے یا عام ارشاد کو خاص کر دے یا مطلق کو بلا کسی دلیل شرعی کے مقید ومحدود کردے، یہ کھلی تحریف قرآن ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی طور سے مسئلہ ربوا پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں ربوا کی صرف یہی صورت رائج تھی کہ کوئی غریب آدمی اپنی شخصی مشکلات کے حل کے لئے سود پر قرض کا معاملہ کرے، تجارت کے لئے سود پر روپیہ لینے دینے کا رواج نہ تھا، بلکہ آیاتِ ربوا کا شان نزول دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمتِ ربوا کا اصل نزول تجارتی سود کے بارے میں ہوا ہے، چونکہ عرب اور بالخصوص قریش تجارت پیشہ حضرات تھے اور عام طور پر تجارتی اغراض کے لئے سود کا لین دین کرتے تھے (مسئلہ سود ر ۲۷)۔

بینکوں کے سود پر ضرب لگاتے ہوئے شیخ محمد ابوزہرہ فرماتے ہیں:

''وربا القرآن هو الربا الذى تسير عليه المصارف ويتعامل به الناس فهو حرام لا شك فيه'' (بحوث فی الربا ر ۳۷)۔

شیخ محمد علی الصابونی آیاتِ ربوا کی تفسیر کرتے ہوئے زیب قرطاس فرماتے ہیں:

"وهذا النوع من الربا هو المستعمل الآن في البنوك والمصارف المالية"

(روائع البیان تفسیر آیات الاحکام ۱/۳۹۲)۔

مجوزین کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لئے یہاں سود لینا جائز ہے، حالانکہ دارالحرب کی تعریف اوراس کی اقسام کو پیش نظر رکھا جائے تو سود کا جواز ثابت نہیں ہوسکتا، دارالحرب وہ ملک ہے جس میں بلاخوف وخطر احکامِ کفر جاری ہوں، البتہ حضرت امام ابوحنیفہؒ سابق دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے مزید دو شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں، اول یہ کہ وہ ملک دارالحرب کے متصل ہوجائے درمیان میں کوئی دارالاسلام باقی نہ رہے، دوم یہ کہ اسلامی حکومت کے دیئے ہوئے امان پر کوئی مسلمان اور ذمی مامون باقی نہ رہ سکے، گویا حضرت امام اعظمؒ نے دارالاسلام بننے کے لئے تو صرف اسلام کی فرمانروائی کو کافی قرار دیا ہے، اس کے بالمقابل دارالحرب بننے کے لئے اہلِ کفر کی حکمرانی وعملداری مکمل ہونے کی دو علامتوں کو شرط قرار دے کر کفار کا اقتدار کامل ہونے سے پہلے اس کا اعتبار نہیں کیا۔ اس میں "**الاسلام يعلو ولا يعلى**" کا اظہار ہے، لیکن امام اعظمؒ کی ان تینوں شرطوں کو ذکر کر کے علامہ شامی نے لکھا ہے: "**واما في بلاد عليها ولاة الكفر فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد**" (ردالمحتار ۳/۲۷۷)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ وعیدین کا قائم ہونا دارالحرب ہونے سے مانع نہیں۔ دورِ حاضر کی لادینی حکومت اور مسلم اقلیت کی جمہوریت میں خواہ آبادی کے تناسب میں مسلمانوں کو نمائندگی دی جائے یا مشترکہ ووٹنگ کے ذریعہ حکومت بنائی جائے، ان میں سے ہر صورت کی حکومت لازمی طور پر دارالحرب کا مصداق ہوگی، اوران کے بنائے ہوئے قوانین ہی ملک میں نافذ ہوں گے، یہ تمہید ذہن نشین کر کے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کو اس فتوے پر دادِ تحسین دیجئے، موصوف تحریر فرماتے ہیں:

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل تسلط اور اور اسلامی حکومت کے آثار کالعدم ہوجانے کے بعد ہندوستان کا دارالحرب ہونا جمہور علماء ہند کے نزدیک محقق ہو چکا تھا، فقیہہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ کا مستقل رسالہ اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے، اور ظاہر ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جو انقلاب آیا اس میں بھی وہ حصہ جو ہندو اکثریت کے اقتدار میں رہا اس کے احکام انگریزی عہد سے کچھ مختلف نہیں ہو سکتے، اس لئے موجودہ ہندوستان کا دارالحرب ہونا واضح ہے (اسلام کا نظام اراضی ر ۱۸۱)۔

دارالعہد بننے کے لئے امیر المومنین کا ہونا اور دارالاسلام کا بھی ہونا ضروری ہے، اور اس وقت ہندوستان کے مسلمان انتشار کا شکار ہیں اور کوئی با اختیار امیر نہیں، لہذا ہندوستان دارالعہد نہیں ہوسکتا۔ البتہ تقسیم ملک کے وقت ہندوستان کی سکونت اختیار کرنے والے یا پاکستان سے آکر ہندوستان میں آباد ہونے والے مسلمان کو قانون ساز اسمبلی نے جو مذہبی آزادی اور دستوری حقوق دیئے ہیں، ان کی روشنی میں ہندوستان کو دارالامن کہا جاسکتا ہے، اس معاہدہ کی پاسداری ہی عدالت کی جانبداری کو توازن سے بدلنے اور مسلم پرسنل لا کی پامالی میں بریک لگانے پر حکومت کو مجبور کرتی ہے، اور فرقہ وارانہ فسادات دارالامن ہونے سے مانع نہیں، کیونکہ دستوری حقوق کی بنیاد پر پولیس میں مؤثر مسلم نمائندگی کے ذریعہ پولیس کی درندگی اور اکثریت کی جارحیت کو ختم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود سود کی حلّت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ حلت ربوا کی علت مال کا مباح ہونا ہے، اور مالِ مباح پر تسلط و استیلاء سے ہی ملکیت مستفاد ہوتی ہے۔ ہدایہ میں ہے:

"ولان مالهم مباح فى دارهم فباى طريق اخذه المسلم اخذ مالاً مباحا اذا لم يكن فيه غدر" (ہدایہ آخرین ر ۷۰)۔

اور اصول شریعت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی جان و مال مباح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ امیر المومنین کی طرف سے پیش کردہ دعوتِ اسلام کو کفار رد کردیں، اور

صلح بالجزیہ کی دعوت قبول کرنے سے بھی انکار کردیں، اس کے بغیر ان کے جان و مال مباح نہیں ہوں گے، اور بطور سود بھی ان کے مال پر قبضہ ناجائز ہوگا۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ نے اسی حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے کہ حرمتِ ربوا کی آیات مطلق ہیں، کسی ملک وزمان کی قید سے مقید نہیں، احادیث میں اگر کچھ استثنائی صورتیں ملتی ہیں تو وہ صرف دارالکفر کی بعض صورتوں میں ملتی ہیں، مثلاً دارالکفر کا دارالشر والفساد یا دارالمحاربہ، اور **المطلق یجری علی اطلاقہ** مسلم ضابطہ ہے (نظام الفتاویٰ ۲/۳۵۶)۔ لہذا ہندوستان کے حربیوں سے براہِ راست اور بینک کی معرفت ہر صورت میں سود کا لین دین منع ہے۔ سود کا لینا اور دینا دونوں کا برابر گناہ ہے، امام مسلم نے اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور کھلانے والے اور لکھنے والے اور دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے، اور فرمایا کہ یہ سب برابر ہیں، اس حدیث میں شارع علیہ السلام نے ان کو برابر کا گنہگار قرار دیا ہے، لہذا فقہاء کرام اور مفتیان ہند نے ایسے معاملات کو بھی ناجائز کہا ہے جن میں مسلمانوں کی طرف سے اہل الحرب کو سود دینا لازم آئے (ملاحظہ ہو: فتاویٰ رشیدیہ کامل/۴۳۴، فتاویٰ محمودیہ ۸/۹۰ – ۲۹۴ فتاویٰ رحیمیہ ۲/۱۹۹)۔

شریعت نے حاجت اور ضرورت کی اضطراری حالت میں بقدرِ ضرورت حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے، مخمصہ کی حالت اور موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا شخص جو حلال مال کے ذریعہ قوت لایموت بھی حاصل نہ کر سکے اور غیر سودی قرض بھی نہ پا سکے تو فقہاء کرام نے ضرورت کے بقدر سودی قرض لے کر استعمال کرنے کی اس کو اجازت دی ہے (بحوث فی الربا/۶۸ فتاویٰ رحیمیہ ۳/۱۷۴)۔ اس کے علاوہ فقر و فاقہ کی شدّت اور سخت حاجت کے وقت بھی سودی قرض سے کام چلانے کی اجازت دی گئی ہے (بینک انشورنس اور سودی قرضے/۱۲۰)۔

اورعلامہ ابن نجیم نے لکھا ہے: **یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح** (الاشباہ) یہ شخصی ضرورت کا عارضی حل ہے، اجتماعی افلاس سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے غیر سودی بنک کاری کو جاری کرنا ضروری ہے کیونکہ اسلام کا اقتصادی نظام ہی ہر خاص وعام کو درحقیقت آرام دینے والا ہے، اور تمام انسانوں کو خوشحال و فارغ البال بنانے والا ہے، جس پر مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ اقتدار گواہ ہے، اور اب تو سودی بنکاری کی ناکامی اور معاشرہ کی پریشانی کا تجربہ کرنے والے دورِ حاضر کے ترقی یافتہ حیران انسان بھی اسلام کے اس فطری نظام کو اختیار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ماضی قریب میں کویت، متحدہ عرب امارات، اردن، سوڈان اور پاکستان نے نفع ونقصان میں حصہ داری کے اصول پر بینکوں کو قائم کیا ہے، حکومت سعودی عرب اور" بینک ترقیاتی بین الاقوامی فی نی کی حوصلہ افزائی سے ۱۹۷۵ء میں جدّہ میں اسلامی ترقیاتی بینک کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ہندوستان میں بلاسودی بینک اور بیت المال قائم کر کے ہی کنگال معاشرہ کو خوشحال بنایا جاسکتا ہے، فی الحال ہندوستان میں بعض ترقیاتی منصوبوں اور عوام کی فلاح وبہبود کے لئے بینک ایسے قرضے دیتا ہے جن پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، تو وہ معاملے سود کے دائرہ میں شرعاً داخل نہیں ہوں گے، مثلاً ممتاز عالم دین حضرت مولانا برہان الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگر حکومت سے یا کسی ادارہ یا فرد سے نقد رقم کے بجائے آلات (ٹریکٹر وغیرہ) یا آلاتِ صنعت (مشین وغیرہ) یا مکان یا اشیاء خوردنی وغیرہ قرض لی جائیں اور ان کی ادائیگی روپئے کی شکل میں ہو (یا کسی اور چیز کے ذریعہ ہو مگر اس جنس کی نہ ہو) خواہ ادائیگی یکمشت ہو یا بالاقساط ہو تو اس طرح کا لین دین جائز ہوگا، خواہ نقد قیمت کی ادائیگی کے مقابلہ قرض میں زیادہ قیمت دینی پڑے، خواہ حکومت یا ادارہ اس زیادہ کو سود کا نام ہی دے، اور حکومت کے رجسٹروں میں وہ اضافہ سود کے نام سے ہی درج کیا جائے، تو یہ بھی صورت جائز ہوگی، کیونکہ اس میں ربوا کی تعریف اور اس کی شرعی حقیقت نہیں پائی جاتی کہ محض نام سے کوئی حکم نہیں لگتا (بینک انشورنس اور سرکاری قرضے ص ۱۲۱)۔ اسی طرح انتظامی ضروریات کے لئے قرض پر محکمہ سود کے نام